مضامینِ بحر العلوم

حصہ دوم

مُصنّف

بحر العلوم مفتی عبد المنّان صاحب اعظمی



امام احمد رضا اکیڈمی

مضامین بحر العلوم

(حصہ دوم)

مصنف

بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبدالمنان اعظمی

علیہ الرحمۃ والرضوان

ناشر

امام احمد رضا اکیڈمی، صالح نگر

بریلی شریف

پن:243502

SAYYAD MUZAFFAR ALI ASHARAFI
BADI DARGAH MOHALLAH

سلسلۂ اشاعت..........................(۷۰)

نام کتاب..........................مضامین بحر العلوم

مؤلف..........................بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان اعظمی

کمپوزنگ وسیٹنگ..........................محمد منیف رضا برکاتی

اشاعت..........................بار اول

سنہ..........................۱۴۳۴ھ/۲۰۱۳ء

☆☆☆☆☆

Web: www.imamahmadrazaacademy.com

E-mail:mohdhanif92@gmail.com

ملنے کے پتے

☆ کتب خانہ امجدیہ، مٹیا محل جامع مسجد دہلی ۶

☆ المجمع الاسلامی، ملت نگر مبارک پور ضلع اعظم گڑھ

☆ حق اکیڈمی، مبارک پور ضلع اعظم گڑھ

ترک وتجرید

ملفوظات محبوب الٰہی

بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان صاحب قبلہ
شیخ الحدیث الجامعۃ الاشرفیہ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

اما بعد:

تزکیہ باطن، صفائے قلب، اور توجہ الی اللہ کے لیے صوفیاے کرام نے ترک وتجرید ضروری قرار دیا ہے، یہ مرحلہ "توبہ وانابت یا ترک معاصی" سے شروع ہوکر "ترک دنیا" اور "ترک عقبیٰ" پھر ترک ترک تک منتہی ہوتا ہے۔

محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہ، اپنے وقت میں "سید التارکین اور امام المتجرد دین تھے، چناں چہ آپ نے ترک وتجرید کی ساری منزلوں کے آداب وشرائط، رسوم قواعد، نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں، آج کی صحبت میں ہم آپ کے ملفوظات سے اسی سلسلہ کے ارشادات نقل کررہے ہیں۔

ترک معاصی (توبہ):

توبہ کی تین قسمیں ہیں: (۱) ماضی (۲) حال (۳) مستقبل

(۱) تمام کیے ہوئے گناہوں سے کامل ندامت وشرمندگی حاصل ہونا توبہ کا "حال" ہے۔

(۲) ماضی یہ کہ جن جن بندوں کا حق اس سے متعلق ہوانہیں راضی کرے، یعنی اگر کسی کا ایک روپیہ لے لیا ہو۔ تو خالی توبہ توبہ کرنے سے توبہ نہ ہوگی۔ جب تک وہ روپیہ واپس کرکے اسے راضی نہ کرے۔ کسی کو برا کہا ہو تو اس سے معذرت خواہ ہو، اور معاف کرائے، فرض کرو جس کو برا کہا وہ مرگیا تو اب توبہ کی کیا صورت ہو؟ اس کی زندگی میں اسے جتنی بار برا کہا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اتنا یا اس سے زیادہ اس کو اچھا کہے، اور اچھائی سے یاد کرے۔

کسی کو مار ڈالا ہو۔ اور اس کا وارث نہ ہو، جسے فدیہ اور خوں بہا ادا کرے، تو غلام آزاد کردے، (مطلب یہ کہ مردہ کو جلا نہیں سکتے، تو ایک بندہ کو قید سے ہی رہائی دلائے،

اگر کسی پرائی عورت سے زنا کیا ہو تو اس سے توبہ کی کیا شکل ہے؟ کیوں کہ یہاں اس کے شوہر سے معافی تلافی کے لیے حکم نہیں، تو اس کی یہی سبیل ہے کہ اللہ کی طرف بھاگے۔

اگر شراب پی ہو تو اس کی توبہ یہ ہے کہ عمدہ مشروبات اور ٹھنڈے پانی سے لوگوں کی تواضع کرے مطلب یہ ہے کہ ہر معصیت کی نسبت سے اس کی تلافی کی جائے، یہی توبہ کا وہ تقاضا ہے جو ماضی سے متعلق ہے۔

(۳) اور توبہ کی تیسری قسم یہ ہے کہ آئندہ کے لیے عزم مصمم کرے کہ اب گناہوں کے قریب نہ جائے گا۔ حضرت محبوب الٰہی نے خود اپنا واقعہ بیان کیا۔

میں نے جب شیخ الاسلام بابا فرید الدین قدس سرہ کے دست مبارک پر توبہ کی تو آپ نے اہل حقوق کو راضی کرنے کی سخت تاکید فرمائی، مجھے تنبیہ ہوگئی کہ شاید حضرت میری دو کوتاہیوں کی طرف اشارہ کررہے ہیں۔ ایک آدمی کا مجھ پر بیس چیتل باقی ہے۔ اور میں نے ایک آدمی سے ایک کتاب عاریۃً لی تھی جو کھوگئی میں نے اسی وقت دل میں یہ عہد کیا، کہ اب کی دفعہ دلی جاؤں گا تو ان دونوں صاحبوں کو جس طرح ہوگا راضی کروں گا۔

میں جب اجودھن سے دلی واپس آیا، تو جس آدمی کے بیس چیتل باقی تھے، وہ

کپڑے کا تاجر تھا، جس سے میں نے کپڑا خریدا تھا، اور اس دوران کبھی بھی میرے پاس بیس چیتل جمع نہیں ہوئے کہ اسے ادا کروں، اس دفعہ صرف دس چیتل میرے پاس جمع ہوئے، تو میں اس بزاز کے پاس پہونچا، اور دس چیتل اس کو دے کر معذرت کی، کہ ایک ساتھ دینے کی نیت میں یہ تاخیر ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے یہ میرے لیے ممکن نہیں، آپ یہ دس لیں، بقیہ دس بھی انشاء اللہ میں جلد ہی ادا کردوں گا، اس بزاز نے یہ سن کر کہا حضرت بابا کی خدمت سے آرہے ہو نہ، تبھی ادائے حقوق کی یہ تڑپ ہے جاؤ بقیہ دس میں نے معاف کیے۔

اسی طرح میں کتاب والے کے پاس پہونچا۔ اور اس سے کہا آپ کی کتاب مجھ سے کھوگئی ہے، میں اس لیے آیا ہوں کہ آپ سے معذرت کروں، میں دوسری کتاب نقل کرواکے آپ کی خدمت میں حاضر کروں گا۔ وہ شاید مجھ سے مایوس ہو چکے تھے، بولے بے شک تم جس پاکباز انسان کی خدمت سے آرہے ہو، انکی صحبت کی تاثیر زندگی میں ایسے ہی انقلاب برپا کردیتی ہے۔ (فوائد الفواد ص ۲۳۹-۲۴۰)

یہ واقعات توبہ کی ماضی والی نوع سے متعلق تھے۔ آئندہ کے لیے گناہوں سے بچنے کے عزم مصمم کی بھی کئی مثالیں۔ آپ کے ملفوظات کی زینت ہیں۔ آپ نے فرمایا۔

''جو شخص پیر کا ہاتھ تھام کر توبہ و بیعت کرتا ہے۔ اس نے گویا اللہ تبارک وتعالیٰ سے عہد و پیمان کی تجدید کی ہے، اور اس پر ثابت قدمی ضروری ہے۔ اگر اب بھی وہ پرانی روش پر ہے، تو اس نے توبہ ہی کیوں کی؟

فرمایا۔ جب میں پہلی بار شیخ الاسلام حضرت بابا فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز کی بارگاہ سے بیعت کے بعد لوٹا تو راستہ میں پیاس کا غلبہ ہوا۔ ہوا گرم تھی اور دور دور کہیں پانی کا پتہ نہ تھا۔ راستہ میں سید عماد علوی سے ملاقات ہوئی۔ وہ میرے ملاقاتی اور ایک یار باش بزرگ تھے۔ میں نے پوچھا سید صاحب مجھے غیر معمولی پیاس معلوم ہو رہی ہے۔ یہاں کہیں پانی ہوگا انہوں نے ایک لوٹا دیتے ہوئے کہا۔ آپ ٹھیک ہی پہونچے لیجئے نوش

فرمائیے۔ میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ شراب یا بھنگ کا شربت ہے، میں نے پینے سے انکار کیا تو کہنے لگے میں نے بھی مجبوراً ہی اسے ساتھ رکھا ہے اس راستے میں دور تک پانی کا نشان نہیں ہے۔

آپ اس کو نہ پئیں گے تو پیاس سے مرجائیں گے میں نے کہا جو کچھ بھی ہو چاہے مر ہی کیوں نہ جاؤں مگر میں اپنے شیخ کے سامنے کیے ہوئے عہد سے پھر نہیں سکتا۔ دوسرا قصہ آپ نے حضرت حمید سوالی رحمۃ اللہ علیہ۔ کا بیان کیا فرماتے ہیں۔

خواجہ حمید سوالی رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمہ کی ہم خرقہ اور خواجہ بزرگ حضور معین الحق والدین چشتی اجمیری رضی اللہ عنہ کے مرید تھے آپ نے توبہ وانابت کی اور حضرت خواجہ بزرگ کے حلقۂ ارادت میں آئے تو ہر گناہ سے پرہیز کا عہد کرلیا۔ آپ کے احباب اور پرانے ساتھی حسب عادت آپ کو دعوت ناؤنوش وشاہد ومطرب دینے آئے تو آپ نے انکار کیا۔ انکار پر اصرار بڑھا تو آپ نے سختی سے منع کیا وہ لوگ آپ کے سر ہو گئے۔ آپ نے دیکھا کسی طرح مانتے ہی نہیں تو ایک عجیب والہانہ انداز میں فرمایا: جاؤ جاؤ اور اب مجھ سے مایوس ہو جاؤ میں نے یہ کمر اتنا مضبوط باندھ لیا ہے۔

(فوائد: ص ۳۴۶)

حضرت محبوب الٰہی نے توبہ اور ترک معاصی کا عزم کرنے والوں کی ایک عمدہ تمثیل ارشاد فرمائی۔

جو آلودہ معصیت ہے اس کا رخ گناہ کی طرف ہے۔ اور پشت حق کی جانب اور توبہ کرلی تو رخ حق کی طرف ہو گیا۔ اور پشت گناہ کی جانب جس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ عبادت میں اسے لذت حاصل ہو یہ عبادت کی بے ذوقی گناہوں کا ثمرہ ہے۔

(فوائد: ص ۲۴)

گناہوں کے ثمرات اور نیکی کے فوائد

حضرت کے اس آخری ارشاد کا یہ آخری ٹکڑا انتہائی غور طلب ہے۔ جس طرح مادی

بد پرہیزی اور بد احتیاطی کے اثرات ظاہری جسم تک ہوتے ہیں جس کا اندازہ ایک ماہر ڈاکٹر مریض کی صورت دیکھتے ہی لگا لیتا ہے ٹھیک اسی طرح گناہوں کے برے اثرات بھی انسان کے باطن بلکہ بسا اوقات ظاہر پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اہل معرفت چہرہ دیکھ کر انسان کے اندرونی گناہوں کا پتہ چلا لیتے ہیں۔

حضرت امام عبد الوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''طبقات کبریٰ'' میں حضرت امام برحق عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات میں لکھا ہے ایک اجنبی مسجد میں آیا اور آپ کے سامنے ہی بیٹھ کر وضو کرنے لگا آپ نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور فرمایا سبحان اللہ یجئی فی مسا جدنا رجا ل فی عیونھم اثر الزنا" ہماری مسجدوں میں اب ایسے لوگ بھی آنے لگے ہیں جن کی آنکھوں میں زنا کا اثر ہے معلوم ہوا ہم کو نظر نہ آئے لیکن اہل معرفت جان لیتے ہیں کہ یہ آنکھیں کیا کر کے آئی ہیں۔

ع آنکھیں بتا رہی ہیں کہ جاگے ہو رات بھر

صوفیائے کرام اور اہل باطن نے گناہوں کے اثرات سے باقاعدہ بحث کی ہے حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

''شکوت الیٰ وکیع سوء حفظ فاوصانی الی ترك المعاصی"۔

حضرت وکیع ابن الجراح رضی اللہ عنہ سے میں نے حافظہ کے کمزوری کی شکایت کی تو انہوں نے مجھے گناہ چھوڑ دینے کی تاکید کی، معلوم ہوا گناہ کا عام نقصان روح سے متعدی ہو کر جسم تک پہونچتا ہے۔ اور یادداشت کی قوت کو کمزور کر دیتا ہے۔ دل کی بیداری اور احساس کی زندگی ہی انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتی ہے۔ پیغمبر خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"الا ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسدالجد کله الاوهی القلب"

لوگو خبردار رہو۔ انسان کے جسم میں ایک پارہ گوشت ہے وہ درست ہے، تو سارا

انسان درست ہے اور وہ فاسد ہے۔ تو پورا انسان فاسد ہے۔ خبردار کہ وہ دل ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مرجائے   کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

تو دل کی زندگی ہی سب کچھ ہے۔ اہل باطن فرماتے ہیں "کثرۃ الضحک یمیت القلب" زیادہ ہنسی دل کی موت کا سبب ہوتی ہے معلوم ہوا، بے موقع اور بے فائدہ ہنسنا، اور قہقہے اڑانا، روحانیت کو تہ وبالا کرنے کا سبب ہے، واضح ہو کہ یہ بیماری شرعاً معصیت بھی نہیں، نامحمود البتہ ہے، زبان جسم کا ایک مختصر سا ٹکڑا ہے۔ لیکن آج کون خیال کرتا ہے کہ اس مختصر سے پارہ گوشت کی ذرا سی بے اعتدال کتنی بڑی قیامت ڈھاتی ہے، حدیث شریف میں ہے "الیمین الفاجر تدع الدار بلاقع "جھوٹی قسم خانہ بربادی کا سبب ہوتی ہے۔

آج ہم مسلمانوں کی ایک عام محرومی ہے کہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں جو خالی واپس کردیے جاتے ہیں لب ہلاتے ہیں۔ الفاظ باب اجابت سے ٹکرا کر پلٹ آتے ہیں، ہم حیران ہوتے ہیں۔ ہم خدا کے بندے اس کے رسول کی امت اللہ کے نام لیوا، آخر ہماری اس محرومی کا سبب کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

کہ ایک شخص طویل سفر کرتا جس کے بال پریشان ہیں اور بدن گرد آلود ہے (یعنی اس کی حالت ایسی ہے کہ جو دعا کرے وہ قبول ہو) وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر یارب یا رب کہتا ہے مگر حالت یہ ہے کہ اس کا کھانا حرام پینا حرام لباس حرام اور غذا حرام پھر اس کی دعا کیوں کر مقبول ہو حدیث۔ "معلوم ہوا حرام سے پرہیز نہ کرنا دعا کے مقبول نہ ہونے کا سب سے بڑا سبب ہے"۔

اس قسم کے چند واقعات حضرت محبوب الٰہی نے ارشاد فرمائے ہیں۔

(۱) لاہور میں ایک واعظ تھے اللہ تعالیٰ نے ان کی تذکیر میں غیر معمولی اثر آفرینی بخشی تھی سامعین پر دوران وعظ مسلسل لذت اور رقت طاری رہتی تھی۔ اتفاقاً وہ حج کو تشریف لے گئے۔ واپس لوٹے تو وعظ میں وہ تاثیر اور چاشنی باقی نہیں رہ گئی تھی مطلب یہ

کہ حج کے بعد دردو تاثیر میں اضافہ ہونا چاہیے تھا یہ الٹا ہی ہوا کہ جو کچھ تھا وہ بھی گیا لوگوں نے کہا صاحب اب آپ کے وعظ میں وہ پہلی والی بات نہیں رہ گئی ہے انہوں نے یہ سن کر فرمایا میں خوب جانتا ہوں کہ اس بدبختی کا سبب کیا ہے اس سفر میں میری دو نمازیں قضا ہو گئیں تھیں جنہیں وقت کے بعد پڑھا۔ (فوائد الفوائد: ص ۳۶۴)

قہر ہے تھوڑی سی غفلت بھی طریق عشق میں
آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

اللہ اکبر! سفر حج اور جوار حرم جہاں ہر دم انوار ورحمت کا نزول ہوتا رہتا ہے لیکن صرف دو نماز قضا کرنے کی نحوست نے ساری برکات پر پانی پھیر دیا۔ معلوم ہوا ترک نماز زبان سے تاثیر کی قوت سلب کر لیتی ہے۔

(۲) حضرت شیخ ابو سعید تبریزی رحمۃ اللہ علیہ ایک عظیم تارک الدنیا بزرگ گذرے ہیں۔ ایک دفعہ ان کی خانقاہ میں مسلسل تین دن سے از قسم غلہ کوئی چیز نہ تھی۔ اہل خانقاہ بھوک کی شدت میں مبتلا والی شہر کو اطلاع ہوئی تو اپنے ملازموں سے کہنے لگا حضرت تو مجھ سے کوئی ہدیہ قبول کرتے نہیں کچھ نقد لے جاؤ اور شیخ کے خادم کو دے دو کہ اسے پاس رکھو اور شیخ کو اطلاع کیے بغیر تھوڑا تھوڑا حسب مصلحت خرچ کرو۔ (فوائد الفوائد)

ابھی پہلے ہی دن اس میں سے کچھ شیخ کے مصرف میں آیا تھا کہ حضرت کو عبادت وریاضت میں جو لذت وآرام ملتا تھا موقوف ہو گیا، خادم کو بلا کر ذریعہ آمدنی کی تحقیق کی تو اسے مجبوراً پوری صورت حال سے شیخ کو آگاہ کرنا پڑا تو آپ نے پوچھا حاکم کا فرستادہ کس راستے سے آیا اور خانقاہ میں کہاں کہاں اس نے قدم رکھا شیخ نے ہر جگہ سے مٹی کھدوا کر باہر پھکوا دی اور باہر سے مٹی منگوا کر خالی جگہ پر کی اس خادم کو پورے زروسیم کے ساتھ باہر کر دیا

"العظمۃ للہ" ہم بے بصیرتوں کو کیا نظر آئے، مگر اہل معرفت دیکھتے ہیں کہ شبہ کا کھانا کھانے سے عبادت الٰہی کی لذت ختم ہو جاتی ہے۔

ترک معصیت کا مناسب وقت:

انسان کی عمر جب ڈھلنے لگتی ہے اور شہوانی قوتوں میں فطور آ جاتا ہے تو ضمیر اور

احساس کی مقہور اور خفتہ طاقتیں آہستہ آہستہ بیدار ہوتی ہیں اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ گذشتہ ایک ایک کر کے چشم تصور کے سامنے آموجود ہوتے ہیں اور مستقبل کے بھیانک انجام سے انسان لرز اٹھتا ہے اس کی روح بے قرار ہو جاتی ہے اور وہ کف افسوس ملنے لگتا ہے ہائے اب کیا ہوسکتا ہے؟ اب کیا ہوسکتا ہے؟ گناہ کرنے کی طاقتیں جواب دے چکی ہیں لذت کا احساس مر چکا ہے اور نیکی کرنے کے لیے نہ وقت ہے نہ طاقت افسوس اب کیا ہوگا ٹھیک ہے کہ انسانوں کو اسلام نے اس وقت بھی مایوس نہیں کیا وہ فرماتا ہے۔

ایں درگہ ما درگہ نہ امیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی باز آ۔

یہ میری بارگاہ ناامیدی کی جگہ نہیں سو (۱۰۰) مرتبہ بھی اگر توبہ توڑ چکے ہو تو اب سے بچی توبہ کرو۔

لیکن توبہ صادقہ کا حقیقی وقت وہی ہے جب قوتیں شباب پر ہوں اور جوش و مستی میں کچھ سوجھتا نہ ہو کی یہ توبہ میزان عمل میں بڑا وزن رکھتی ہے اس مضمون پر حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات قابل ملاحظہ ہیں۔ فرماتے ہیں:

دو شخصوں میں اس موضوع پر بحث ہوئی کہ متقی جس نے کبھی گناہ نہ کیا وہ افضل ہے یا جس نے گناہ کر کے توبہ کی اور اس پر قائم رہا وہ افضل ہے۔ دونوں اس زمانے کے پیغمبر کے پاس پہونچے۔ آپ نے فرمایا میں وحی کے بعد کچھ فیصلہ کر سکتا ہوں۔ انہیں حکم ہوا کہ ان دونوں سے کہو کل صبح تم دونوں ایک گھر سے باہر نکلو اور سب سے پہلے جو تم سے ملے اس سے اس سوال کا جواب چاہو۔

دوسرے روز حسب الحکم ان دونوں نے ملنے والے سے پوچھا آپ ہماری یہ مشکل آسان کر دیں کہ متقی افضل ہوتا ہے یا تائب اس نے جواب دیا میں کوئی عالم فاضل نہیں سیدھا سادھا ایک بن کر ہوں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کی کپڑا تیار کرتے وقت بہت سے دھاگے ٹوٹ بھی جاتے ہیں جن کو میں جوڑ دیتا ہوں تو وہ نہ ٹوٹنے والے دھاگوں سے مضبوط ہو جاتے ہیں۔ لوٹ کر یہ جواب پیغمبر علیہ السلام کو سنایا تو انہوں نے فرمایا تمہارا جواب ہو گیا کہ اپنے

مولیٰ سے ٹوٹ کر جڑنے والا افضل شروع سے جڑا رہنے والا مفضول۔ (فوائدالفوائد)

لیکن اس کے بارے میں خود حضرت کا مشرب یہ ہے کہ متقی اور تائب دونوں برابر ہیں فرماتے ہیں:

توبہ کرنے والا متقی کے برابر ہے اس لیے کہ متقی وہ ہے جس نے عمر بھر کوئی گناہ نہیں کیا اور تائب وہ ہے جس نے گناہ کے بعد اللہ کی طرف رجوع کیا تو حدیث مبارک:

التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ" گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کی طرح ہو جاتا ہے۔ کے موافق متقی اور گنہ گار دونوں حکم میں برابر ہوں گے پھر آپ نے اس کا نکتہ ارشاد فرمایا کہ جو گناہ کا مزہ اٹھا چکا ہے وہ توبہ کے بعد عبادت میں یقیناً لذت پائے گا تو بہت ممکن ہے کہ اس لذت کا ایک ذرہ گناہوں کے کھلیان کو جلا ڈالے۔

(فوائدالفواد: ص۲)

کس درجہ امید افزا ہیں یہ روایات۔ لیکن اسی وقت جب توبہ صادقہ ہو اور ہنگام جوانی میں ہو کہ فرماتے ہیں توبہ وانابت عالم جوانی کی بہتر ہے کہ بڑھاپے میں آدمی توبہ نہ کرے تو کیا کرے پھر یہ دو شعر ارشاد فرمائے۔

چوں پیر شدی و بر سری انجام آئی — آئی سر حرف خویش ناکام آئی
سازی حق راز تیرہ رائی — معشوقہ خود در بے نوائی

تو جب بڑھا ہوا اور اپنے انجام کو پہونچا اور یہ جان گیا کہ پوری زندگی کا انجام لا حاصل رہا، تو اپنی بیوقوفی آپ خدا کو اپنا محبوب بناتا ہے جب کہ تیرا ہم نوا نہ رہے گا۔ فرمایا:

اللہ تعالیٰ بندہ سے اس کی جوانی کے بارے میں پوچھے گا۔ یسأل المرء عن شبابہ

حضرت صوفیائے کرام کہ اس منزل ترک وتجرید اور اس کی تفاصیل پر جب میں نے غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ تو پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ایک حدیث مبارک کی توضیح وتشریح ہے:

"المہاجر من ھاجر ما نھی اللہ" سچا مہاجر وہی ہے جو تمام گناہوں کو چھوڑ دے۔

حاشیۂ اعلیٰ حضرت بر شرح شفا

ملا علی قاری جلد دوم

(۱) باب فضیلۃ الصلوٰۃ علی النبی ﷺ ص ۱۲۶ پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے:

"من صلی علی کتاب (اي: بأن کتب فیه الصلوٰۃ) لم تزل الملئکة تستغفر له ما بقي اسمی فی الکتاب"۔

جس نے کسی کتاب میں میرے نام کے ساتھ درود شریف بھی لکھا۔ تو جب تک وہ تحریر باقی رہے گی فرشتے اس کے لیے مغفرت طلب کرتے رہیں گے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس پر نقل کیا کہ اس حدیث کو طبرانی نے "معجم الاوسط" میں اور ابو الشیخ نے "کتاب الثواب" میں ضعیف سند کے ساتھ ذکر کیا۔ مگر اس کا کوئی اثر نہیں کہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث بھی معتبر ہوتی ہے، اعلیٰ حضرت نے اس پر استدراک کیا۔

وله آخر ص ۱۱۸ . انه بسند حسن ، رواه الطبراني والخطيب في شرف اصحاب الحديد وابوا لشيخ وغيرهم .

ملا علی قاری اس کتاب کے ص ۱۱۸ پر کہہ آئے کہ اس کی سند حسن ہے بروایت طبرانی وخطیب ابو الشیخ وغیرہم نے اس حدیث کو طبرانی جلد اول میں ۱۸۳۵ نمبر پر پایا۔ طبرانی نے اس حدیث پر مندرجہ ذیل تبصرہ تحریر کیا۔ تفرد به اسحاق "اس حدیث کی روایت میں اسحاق منفرد ہیں۔ مگر ابن حجر فرماتے ہیں: اسحق ابن وهب ابن زیاد

العلاف ابو یعقوب الواسطی صدوق (تقریب التہذیب ص۱۰۲)

اسحٰق ابن وہب ابن زیاد، ابویعقوب واسطی سچے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا پہلا تبصرہ ہی صحیح ہے اور یہ حدیث حسن ہے۔ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ کا استدراک برمحل ہے۔

(۲) حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شفا جلد دوم ص ۲۰۷ پر ایک مسئلہ بیان کیا کہ انبیا علیہم السلام اعلان نبوت سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی معرفت رکھتے تھے اور شرک وجہالت کی تمام آلودگیوں سے پاک تھے۔ اور اس مدعا پر پڑنے والے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے ایک ایسی ہی روایت نقل کر کے اس کا رد کیا۔ آپ فرماتے ہیں:

وکذا حدیث الذی یرویه عثمان ابن ابی شیبة سنده عن جابر رضی الله تعالیٰ عنه أن النبي ﷺ کان یشهد مع المشرکین مشاهدهم فسمع الملکین خلفه، احدهما یقول لصاحبه: اذهب حتی تقوم خلفه فقال الأخر: کیف اقوم خلفه وعهده با ستلام الا صنام فلم یشهدهم بعد.

حضور سید عالم ﷺ مشرکین کی مجلسوں میں بھی جاتے تھے۔ ایک روز دو فرشتوں کو باہم بات کرتے ہوئے سنا کہ ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ چلو ہم ان کے پیچھے کھڑے ہوں۔ دوسرے نے کہا ہم ان کے پیچھے کیسے کھڑے ہوں، کہ وہ تو بتوں کے پاس سے آرہے ہیں، اس کے بعد آپ کبھی ان کی مجلسوں میں نہیں گئے۔

یہ حدیث نقل فرما کر حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس روایت پر تنقید فرمائی۔

اس روایت کا حضرت امام احمد بن حنبل نے سخت انکار کیا ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ امام دار قطنی فرماتے ہیں کہ اس روایت میں عثمان کو وہم ہوا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ حدیث منکر ہے، اس کی طرف توجہ ہی نہیں کرنی چاہیے۔ امام احمد بن حنبل اس کو موضوع

قرار دیتے ہیں۔ بات یہیں سے ختم ہوگئی کہ یہ حدیث موضوع ہے اور لائق توجہ نہیں۔ لیکن حضرت ملاعلی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بات آگے بڑھاتے ہیں:

حضور ﷺ کا کافروں کی مجلس میں جانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ان کی مذہبی رسومات کی مجلس میں شریک ہوئے بلکہ دنیاوی مجالس جہاں وہ ایک جگہ بیٹھ کر ملاقات اور بات کرتے تھے۔ اس پر یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ روایت میں تو بتوں کے پاس سے آتے ہیں کا لفظ ہے، بھلا دنیاوی مجلس میں بتوں کا کیا کام ہے، حضرت ملاعلی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کی توجیہ فرمائی کہ سارے مکہ میں صحن کعبہ ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں شہر کے لوگ اکٹھا ہوتے تھے۔ اور کعبہ شریف کے اندر چھت پر باہر اردگرد دور تک بت نصب تھے۔ اس لیے وہاں جانے والے کی نگاہ بتوں پر پڑتی ضرور تھی جس کو وہ اپنی عبارت میں یوں بیان کرتے ہیں۔

أي محاضرهم وهى لا تخلو عن الا صنا م فانها كانت فى الكعبة وحو لها قريبا ثلثة مائة صنم، وكان من حسن خلقه ﷺ يعا شرهم لكو نه من عشائهم دارهم ما دامت كى دا رهم. (شرح شفاء جلد دوم ص ۲۰۷)

یعنی آپ کافروں کے مجمع میں جاتے تھے۔ اور ان کی مجلسیں بتوں سے کم ہی خالی ہوتی تھیں۔ کیونکہ یہ محفلیں صحن کعبہ میں جمتی تھیں۔ اور کعبہ کے اندر و باہر اور اردگرد تین سو بتوں کا ڈیرا تھا۔

سوال پھر پیدا ہوا کہ جب ایسی صورت تھی تو آپ ان کی غیر مذہبی مجلسوں میں بھی کیوں تشریف لے جاتے تھے؟ حضرت ملا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کا بھی جواب دیا:

آپ انہیں کی قوم سے تھے انہیں کے پڑوسی تھے جس کی وجہ سے ان سے ملنا بات کرنا معاملہ چکانا پڑتا ہی تھا، حضور کا یہ فعل از روئے خلق تھا جس کو مدارات کہا جاتا ہے۔ آپ نے ان کے ساتھ ان کے مذہبی معاملہ میں کبھی نرمی نہیں برتی جس کو مداہنت کہا جاتا ہے،

اور مدارات کافر کے ساتھ جائز ہے۔ مداہنت الیہ ممنوع ہے۔

سائل نے پھر پلٹ کر کہا: روایت میں استلام اصنام کا ذکر آیا ہے۔

حضرت ملا صاحب نے فرمایا:

لعل المراد بها مشاهدتها. او مخالطتهم و مشاهدتهم ويؤيده لم يشهدهم بعد.

لفظ استلام الاصنام سے مراد یا تو بتوں کا صرف دیکھنا ہے یا بت پرستوں کی محفل میں آپ کا بیٹھنا اور ان سے بات کرنا ہے، اور آخری بات کی تائید روایت کے آخری ٹکڑے سے ہوتی ہے کہ اس واقعہ کے بعد آپ ﷺ کافروں کی مجلس میں کبھی نہیں گئے۔ اگر بتوں کی بات ہوتی تو لم يشهد هم کے بجائے لم يشهدها ہوتا۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ملا صاحب علیہ الرحمۃ والرضوان کی اس آخری عبارت کے لفظ "لعل" پر حاشیہ تحریر فرمایا:

ليس هنا محل "لعل" بل هو المراد قطعاً.

حضرت ملا جی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، آپ نے لفظ استلام الاصنام کی جو مراد بتائی وہی حق وصحیح ہے، بارگاہ رسالت سے متعلق اس مراد کے علاوہ اور کوئی مراد ممکن ہی نہیں۔ پھر آپ نے اس یقینی مراد کے لیے "لعل" (شاید) کا لفظ کیوں استعمال کیا؟ کیا آپ کو کوئی شبہ ہے کہ کوئی اور مراد بھی ہو سکتی ہے، حاش وکلا، یہ مقام تو "لعل" کے بجائے "ان المراد" کہنے کا تھا، ہمیں منصب رسالت کا خیال رکھنا چاہیے کہ

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر — نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

یہاں میں یہ عرض کروں گا کہ یہ ہے بریلی اسکول اور یہ ہے مسلک احمد رضا۔ یہاں بارگاہ رسالت میں بولنے والے کا ایک ایک لفظ عشق و ایمان کے ترازو میں تولا جاتا ہے۔ سبحان اللہ۔

ليس هنا محل "لعل" بل هو المراد قطعا.

یہاں لفظ "لعل" کی جگہ کہنا تھا کہ قطعاً یہی مراد ہے۔

(۳) امام قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شفا قاضی عیاض جلد دوم ص ۲۲۷ پر سورہ حج شریف کی آیات ۵۲۔۵۳۔۵۴۔ کا مضمون پیش فرمایا:

اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول یا نبی بھیجے سب پر یہ واقعہ گزرا ہے کہ جب انہوں نے پڑھا تو شیطان نے ان کو پڑھنے میں لوگوں پر کچھ اپنی طرف سے ملا دیا۔ تو مٹا دیتا ہے اللہ اس شیطان کے ڈالے ہوئے کو پھر اللہ اپنی آیتیں پکی کر دیتا ہے، اور اللہ علم وحکمت والا ہے۔ تا کہ شیطان کے ڈالے ہوئے کو فتنہ کر دے ان کے لیے جن کے دل میں بیماری ہے۔ بے شک ستمگار دھر کے جھگڑالو ہیں۔ اور اس لیے کہ جان لیں وہ جن کو علم ملا ہے کہ وہ تمہارے رب کے پاس سے حق ہے۔ تو اس پر ایمان لائیں اور جھک جائیں اس کے لیے ان کے دل اور بے شک اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو سیدھی راہ چلانے والا ہے۔

آیت کے اس آخری ٹکڑے کے کلمات مندرجہ ذیل ہیں:

﴿ان اللہ ھادی الذین آمنوا الی الصراط المستقیم﴾

ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس آیت کریمہ میں ﴿الذین آمنوا﴾ کے بعد لفظ بالدین القویم کا اضافہ کیا ہے۔

اعلیٰ حضرت نے اس اضافہ کی نحوی تحلیل فرمائی:

بالدین القویم مدرج فی الأیت لاظھار متعلق ﴿آمنوا﴾

بالدین القویم آیت میں داخل اور کلمہ ﴿آمنوا﴾ کے متعلق ہے۔

جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مومن دین اسلام پر ایمان لائے۔

(۴) شفا جلد دوم ص ۳۹۴ پر یہ مسئلہ بیان ہوا کہ حضور سید عالم ﷺ کی تنقیص کرنے والے کی تکفیر جملہ اہل سنت کا اجماعی مسئلہ ہے، ابو محمد علی ابن احمد فارسی نے اس سے اختلاف کا اشارہ کیا۔ مگر اس کے اختلاف کا کوئی اعتبار نہیں۔ صحیح اور معرف وہی ہے جو ہم نے تحریر کیا۔

حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ابو محمد کا تعارف کرایا:

ابن حزم یزیدی ، قرطبی ، ظاهری ، فارسی الاصل مات سنة سبع خمسین اربعه مأة

یہ ابن حزم یزیدی قرطبی ظاہری فارسی الاصل ہے ۴۵۷ھ میں اس کا انتقال ہوا۔

حضرت امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے نسیم الریاض شرح شفاء قاضی عیاض سے اس کی مزید توضیح کی:

نسبته الى يزيد الخبيث ذاک ابن سيد الا مير معاويه ابن ابی سفيان قال فی النسيم ابن حزم يتصل نسبه ، بأبي سفيان ابن حرب رضی الله عنه فهو فارسی اموی الاصل.

ابن حزم کی نسبت اسی مشہور یزید پلید ابن سید الامیر معاویہ ابن ابی سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف ہے۔ امام خفاجی نے نسیم الریاض میں فرمایا: کہ اس کا نسب ابی سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے، تو خاندان کے اعتبار سے اموی ہے۔ اور مسکن کے لحاظ سے فارسی ہے۔

ابن حزم کی کئی نسبتیں اور بھی ہیں۔ ہم نے تلاش کیا تو تذکرۃ الحفاظ اور وفیات الاعیان میں مزید وضاحت ملی۔

ابو محمد علی ابن احمد سعید بن حزم غالب بن صالح ابن خلف ابن معدان ابن سفیان ابن یزید۔

هو مولىٰ يزيد ابن أبي سفيان صخر ابن حرب ابن امية الاموی . وجده يزيد اول من اسلم من اجداده . واصله من الفارس . وجده الخلف اول من دخل الاندلس من ابائه ومولده بالقرطبه.

(وفیات الاعیان جلد۲ ص ۵۵)

ابو محمد کنیت، علی نام، والد کا نام احمد، ان کے باپ سعید، ان کے باپ حزم۔ علی

اپنے پردادا حزم کی طرف نسبت کرکے ابن حزم کہے جاتے ہیں، حزم کے باپ غالب، ان کے باپ صالح، ان کے باپ خلف ان کے باپ معدان، ان کے باپ سفیان، ان کے باپ یزید۔ یہ لوگ فارسی الاصل تھے، اس لیے ابن حزم فارسی کہلاتے ہیں۔ سب سے پہلے یزید اسلام لائے۔ یہ یزید ابن معاویہ ابن ابوسفیان کے مولیٰ تھے اس لیے ابن حزم وغیرہ اموی کہلاتے۔ ان کے اجداد میں خلف سب سے پہلے اندلس گئے۔ اور ابن حزم قرطبہ میں پیدا ہوئے، اس لیے قرطبی کہلائے۔

اور چوں کہ جملہ خلفائے بنوامیہ کو ابن حزم حق پر سمجھتے تھے اور خصوصیت سے یزید سے ان کے خاندان کا رشتہ ولا تھا اس لیے عام مسلمان انھیں خارجی کہتے تھے۔ (ابن حبان، تذکرۃ الحفاظ جلد سوم ص ۷۷۰) ملا علی قاری نے انھیں یزیدی کہا اور یہ خود جملہ مذاہب فقہ سے ہٹ کر داؤد ظاہری کی پیروی کرتے تھے۔ اس لیے ظاہری کہے گئے، بعد میں یہ خود اجتہاد کے دعویدار ہوئے۔

گویا یہ من چوں سبزہ بار ہا روئیدام ازوجودم ہفت قالب دیدہ ام

مشہور صاحب جرح وتعدیل علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ جلد سوم ۷۶۵ تا ۷۷۲ پر ان کے تفصیلی حالات لکھے ہیں، اور ان کے علم وفضل کا بیان لکھا ہے۔ مگر وہ بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکے۔

انہوں نے بڑے بڑے علما اور ائمہ اجتہاد کے استخفاف اور ان کی شان میں زبان درازی کی، ابوالعباس ابن طریقت کہتے ہیں:

ابن حزم کی زبان اور حجاج ابن یوسف کی تلوار دونوں سگی بہنیں ہیں۔ کہ اس ظالم کی تلوار سے صحابی تابعی، علما، صلحا، زہاد وعباد کوئی نہ بچا۔ اور ان کی زبان نے بھی کبھی کسی کا پاس ولحاظ نہ کیا۔ جس کی طرف رخ کیا اپنی زبان درازی سے سب کی حرمتیں پامال کیں۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

ہم نے تھوڑی تفصیل سے ان کے حالات اس لیے لکھ دیئے کہ آج کل کے بہکے

ہوئے لوگوں کے امام اسی قسم کے لوگ ہیں۔

(۵) شرح شفا جلد دوم ص ۴۳۰ پر قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ مسئلہ لکھا:

کہ حضور سید عالم ﷺ کو بے قصد وارادہ بھی سب وشتم کے الفاظ کہنے والا بھی قتل کر دیا جائے گا۔ ثبوت میں حضرت ابوالحسن قالبسی کا فتویٰ نقل کیا۔ کہ جو شخص نشہ میں حضور سید عالم ﷺ کو گالی دے وہ کافر ہے۔ کیوں کہ نشہ میں اس کی اس حرکت سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ ہوش میں بھی وہ اس حرکت کا عادی ہے۔ کہ آدمی بے ہوشی میں بھی ہوش کی باتوں کو دہراتا ہے۔

اس پر ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے اعتراض کیا:

بناء علی سوء الظن به مع انه لايلزمه، اذ السكران قد يقصد امه وابنته ونحوهما في حال سكره مع انه لا يظن به أن يفعله في حال صحوه.

اس فتویٰ کی بنا اس نشہ باز پر بدگمانی کی وجہ سے ہے۔ حالاں کہ یہ بات اس کو لازم نہیں کہ جو ہوش میں بکتا رہا وہی نشہ میں بھی دہرائے۔ کتنے بدمست نشہ کی حالت میں اپنی ماں اور بیٹی کا قصد کرتے ہیں حالاں کہ ہوشیاری میں ان سے یہ حرکت سوچی بھی نہیں جاسکتی۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت ملا صاب کے معارضہ کی تحلیل فرمائی۔ اور حضرت قالبسی علیہ الرحمہ سے بدگمانی کا التزام دفع فرمایا۔ آپ فرماتے ہیں:

اقول: الميل الى المرأة أمر طبعي . والتفرقة بين الحلال والحرام امر عقلي . واذا زال العقل بقي الطبع غير فارق بين هذه وهذه كالبهائم، بخلاف التكلم في جنابه الرفيع فان المشاهد من الذى يعتريه الجنون ان لا يعاود حال الجنون فى امثال هذا الا ما اعتاده فى حال صحوه . وقد رأينا امرأة رافضية قد جنت فكانت تقع فى الصحابة رضى الله تعالىٰ عنهم ولم نسمع من احد كان سنياً اعتراه الجنون مثل هذا.

میں کہتا ہوں: عورت کی طرف رغبت ایک امر طبعی ہے۔ اور حلال وحرام امر عقلی ہے، تو جب عقل رخصت ہو جاتی ہے تو اس کی اور اس کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ جیسا کہ جا نوروں کا حال ہے بخلاف اس کے ایسی بلند بارگاہ میں بدکلامی کی جرأت (کوئی طبعی تقاضا نہیں) چناں چہ مشاہدہ یہی ہے کہ پاگل اپنی دیوانگی میں ایسی ہی باتوں کو دہراتا ہے جو ہشیاری میں اس کی عادت بن چکی ہو۔

ایک شیعہ عورت پاگل ہوگئی۔ تو اپنے پاگل پنے میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی شان میں بدگوئی کرتی تھی۔ کوئی سنی پاگل تو ایسا کرتے نہیں دیکھا گیا۔

اس لیے قاضی ابوالحسن علیہ الرحمہ کا قول مسئول عنہ کے خلاف بدگمانی نہیں۔ یہ تو ایک مبنی برحقیقت تجزیہ ہے۔

(۶) شرح شفا جلد دوم ص ۴۴۰ پر حضرت قاضی عیاض علیہ الرحمہ نے فرمایا:

اگر کسی نے حضور سید عالم ﷺ کے بعض اوصاف یا آپ کے ایسے حالات جن کا دنیا میں حضور ﷺ پر طاری ہونا جائز ہے، بیان کیے اور اس بیان سے اس کا مقصد حضور ﷺ کی تنقیص یا آپ کا عیب بیان کرنا یا سب وشتم نہیں۔ بلکہ ان اوصاف واحوال کے ذکر سے اس کا مقصد مثال دینا، یا اپنے اور کسی کے لیے حجت فراہم کرنا، اپنی کسی ذلت اور تحقیر میں حضور کے کسی وصف یا کسی حالت کا ذکر کرنا آپ کی اتباع اور پیروی کی وجہ سے نہیں، تو اس قسم کا بے مقصد ذکر بھی گو کفر نہیں لیکن ایسے ذکر سے بھی قائل کی ذات کا ترفع ظاہر ہوتا ہے۔ تو ایسے مواقع پر آپ کا ایسا ذکر بھی آپ کی توقیر و تعظیم سے غفلت اور بارگاہ رسالت کی ادب شناسی کے خلاف ہے، اس لیے ایسے انسان کی تادیب کی جائے گی۔ اور اس پر تعزیر جاری ہوگی۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن   کہ جاہا سپر باید انداختن۔

● ہم نے اوپر جس عبارت کا مضمون اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس عبارت کا بقدر ضرورت حصہ ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

یـذکـر بعض اوصافه او یشهد ببعض أحواله ﷺ الجائز علیه فی الدنیا علی طریق ضرب المثل والحجة . لنفسه او لغیره او علی التشبه به او عند هضمة ثالثة او غضاضة لحقته.

شرح شفا میں متن کی اس عبارت میں دو فروگزاشتیں ہوگئیں، ایک کمی ہوئی اور ایک زیادتی، کمی یہ ہوئی کہ عبارت متن مذکورہ میں لغیره او علی التشبه به کے درمیان سے لفظ ''او'' چھوٹ گیا اور لحقت کے بعد حصلت له علیه الصلاة والسلام کا اضافہ ہوگیا۔

اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے اپنے حاشیہ میں دونوں باتوں پر روشنی ڈالی۔ آپ فرماتے ہیں:

مطلب یہ ہے کہ ان دونوں لفظوں کے بیچ لفظ ''او'' ہونا چاہیے۔ جو شرح علی قاری میں نقل ہونے سے رہ گیا۔

حالاں کہ نسیم الریاض اور متن شفاء دونوں میں یہ موجود ہے اور اس کو ہونا چاہیے جب ہی عبارت کا نسق درست ہوتا ہے۔ دوسری زیادتی کے بارے میں اعلیٰ حضرت کا لب ولہجہ سخت ہے۔ آپ فرماتے ہیں: ان في نسيم الرياض لغيره على التشبه به بزيادة لفظ أو بين غيره وعلى التشبه به كذا في متن الشفاء.

هذا خطاء عظیم وکیف ینسب النقیصة العظیمة والذلة والحقارة الیٰ حضـرة الطهارة ﷺ . وانما الضمیر للرجا ل ای یفعل ذلک الا ستشهاد عند النقیصة اصابت الرجل والمذلة تالته دفعا لما عن نفسه وعن غیره ولعل زیادة علیه الصلاة والسلام خطاء عن الکاتب .

یہ بڑی غلطی ہے، بھلا نقص عظیم اور ذلت وحقارت کی نسبت حضور ﷺ کی پاک بارگاہ تک کیسے ہوسکی۔ نـا لتـه ولحقته کی ضمیر تو اس آدمی کی طرف ہے جو اپنی یا کسی اور کی تحقیر اور مذمت کے وقائع میں حضور کے کسی وصف سے شہادت فراہم کررہا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ غلطی کاتب کی ہو۔

اعلیٰ حضرت کا علم ریاضی میں کمال

حضرت علامہ شبیر احمد صاحب غوری صف علما میں مجمع البحرین کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور معقول و منقول، قدیم و جدید کا ایک حسین اور وشال سنگم ہیں، ملک کے مختلف بلند پایہ جرائد میں ان کے مقالے داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ بلکہ آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بن چکے ہیں۔

نومبر ۸۰ء کے اشرفیہ میں ان کی ایک تحریر شائع ہوئی جس میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ایک ملاقات پر اظہار خیال فرمایا ہے۔ جو ریاضی کے کسی مسئلہ کی تحقیق کے لیے ڈاکٹر صاحب نے کی تھی اور کامیاب واپس لوٹے تھے۔ عالی جناب غوری صاحب زید مجدہم کے اس مضمون کی غرض واقف کاروں سے اس خاص مسئلہ کی تعین و تفصیل معلوم کرنی ہے جو ان دونوں صاحبوں میں وجہ ملاقات بنا۔ اور اس مقصد کے اظہار کے لیے غوری صاحب نے ادب و احترام، اور حسن طلب کے سارے آداب ملحوظ رکھے۔ اور یہ سوال آئندہ کسی غرض مند کے لیے وجہ استدلال نہ بن سکے، اس لیے اس امر کی بھی وضاحت کردی کہ

''بہر حال نفس واقعہ میں استبعاد تو تشکیک بلکہ سفسطہ محض ہے، اس عرض داشت کا مقصد محض اس علمی ملاقات کی تفصیل کا جاننا ہے جو ان دونوں فاضلوں کے درمیان سید صاحب کے توسط سے ہوئی۔''

تاکہ ماضی یا مستقبل میں اس واقعہ سے متعلق شبہات پیدا کرنے والے یہ جان لیں کہ ایسی کوشش علمی زبان میں ''سفسطہ'' اور عوامی بولی میں ''دھوکا دہی'' کہلاتی ہے۔ چاہے کسی دار العلوم کے علما کی جانب سے ہو، یا خانقاہ کے مشائخ کی طرف سے ہو، یا کسی یونیورسٹی کے اساتذہ کی طرف سے، سفسطہ بہر حال سفسطہ ہی رہے گا۔

عالی وقار غوری صاحب نے بات اگر صرف تفصیل طلبی تک محدود رکھی ہوتی تو ممنونیت کے ساتھ ہم بھی اس حسن طلب اور اشتیاق ذجستجو میں شریک ہوتے مگر موصوف نے مضمون کے اخیر میں تھوڑی قیاس آرائی کر کے دوسروں کے لیے بھی غور وفکر کی گنجائش پیدا فرمادی۔ ورنہ یہ مسئلہ تو سیدھا سادھا خبر وروایت کا تھا۔ اس لیے حسب ذیل گذارش ہے:

(۱) میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہ سوال بعد از وقت اٹھایا گیا ہے، کیوں کہ تحقیقی سوال کسی وقت کا پابند نہیں، نہ اس امر کا محتاج کہ حل کی گنجائش ہو تبھی اٹھایا جائے، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اس کے حل کا بہترین موقع ضائع ہو گیا۔ کیوں کہ اس کی تحقیق کے دو ہی ذریعے ہو سکتے ہیں، بریلی اور علی گڑھ۔ اول الذکر کا حال یہ ہے کہ اس پورے طبقے میں اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فیض یافتہ لوگوں میں سے اب صرف مفتی اعظم ہند زید مجدہم اور برہان ملت رہ گئے ہیں، جو عمر کی اس منزل میں ہیں کہ ان سے کسی طویل گفتگو کا امکان خارج از بحث ہے، رہا دوسرا ذریعہ اس کی بے خبری کا غوری صاحب خود ہی اظہار فرما چکے ہیں۔ ہاں ایک سنہرا موقع ضرور رائیگاں گیا۔ جناب غوری صاحب زید مجدہم کو یہ واقعہ بچپن سے معلوم بھی تھا، اور اتفاق سے موصوف کو ڈاکٹر صاحب کو چند اسباق پڑھنے کا موقع بھی ملا۔ کاش ذوق تجسس اس وقت کام کر گیا ہوتا تو آج موصوف کے ذریعہ ہم ایک عظیم علم سے آگاہ ہوتے۔

(۲) محترم المقام عالی جناب غوری صاحب نے مسئلہ مبحوثہ کی نوعیت کو متعین کرنے کے لیے مندرجہ ذیل خیال آرائی فرمائی۔ "وہ مسئلہ ریاضی قدیم کا تھا کہ جدید کا؟، جدید کا تھا تو اس کے حل کے لیے ڈاکٹر صاحب کا جرمنی جانے کا عزم بالکل قرین قیاس ہے اور اعلیٰ حضرت نے اسے اگر حل کر دیا تو یہ ریاضی جدید میں بھی ان کی مہارت پر شاہد عدل ہے۔ اور اگر قدیم ریاضی کا مسئلہ تھا تو اعلیٰ حضرت اس کو چٹکی بجاتے حل کرنا بالکل قرین قیاس ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا اس کی تحقیق کے لیے جرمنی جانا بالکل سمجھ میں نہیں آتا۔

(الف) گزارش ہے کہ مسئلہ کے جدید ریاضی سے متعلق ہونے والی شق پر کسی

عقلی استبعاد کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بلکہ اگر کسی کے دل میں یہ شبہہ ہو کہ قدیم کے ماہر ہو کر جدید میں ایسے صاحب کمال کیسے ہوئے تو فاضل مضمون نگار نے اس کا پیش گی ازالہ خود ہی فرما دیا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

''ان بوریا نشین علما کی ذوات مقدسہ سے اس قسم کے متعدد واقعات وابستہ ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر ظفر الحسن سابق صدر شعبہ فلسفہ علی گڑھ یونیورسٹی اپنے مقالہ فضیلت کا بڑا حصہ یہیں سے مکمل کر کے ولایت لے گئے۔ اس کی تیاری اور تکمیل میں بڑا بلکہ بہت بڑا حصہ استاذ محترم مولانا سید سلیمان اشرف کا تھا۔ حالاں کہ مقالہ کا موضوع فلسفہ جدید ایک انتہائی اہم مسئلہ تھا''۔

یہ مولانا سید سلیمان اشرف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب علیہ الرحمہ کے ہم مشرب اور ان کے علم و عبقریت کے معتقد تھے۔ پس اسی طرح اعلیٰ حضرت نے بھی قدیم ریاضی کے ماہر ہوتے ہوئے اگر جدید ریاضی کے کسی اہم مسئلے کو حل کر دیا تو کیا بعید از قیاس ہے؟ بقول شخصے۔

مبین حقیر گدایان عشق راایں قوم　　　شہادت بے کمر و خسروان بے کلہ اند

(ب) اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عبقریت کا ذکر کرتے ہوئے غوری صاحب نے تحریر فرمایا۔

''اس نابغہ روزگار کا اصل موضوع افتا اور رد وہابیہ تھا۔ مگر علوم ریاضیہ کی طرف نگاہ اٹھ گئی تو تحقیقات انیقہ کے دریا بہا دیے۔ صرف ایک مثال جو اس نادرۂ روزگار فقیہ کے گونا گوں کمالات علمیہ کا ادنیٰ نمونہ ہے، یہ کہ

ثوابت کی رفتار کی تحقیق سے رصدگاہ محمد شاہی کے سرآمد فضلا عاجز رہے۔ مگر اعلیٰ حضرت نے جب ادھر نظر اٹھائی تو ان عدیم النظیر محققین سے بھی بہت آگے بڑھ گئے دراں حالاں کہ یہ مسئلہ ہیئت جدید کا تھا''۔

پس جو شخص رصدگاہ کی مدد کے بغیر ہیئت جدید کے اس مسئلہ میں آلات و رسد کی

سہولتوں سے لیس محققین کو اپنے پیچھے چھوڑ دے حالاں کہ ہیئت قدیمہ کو بھی اس نے با قا عدہ حاصل نہیں کیا تھا۔ تو قدیم ریاضی کا تو وہ ماہر ہی تھا۔ اگر جدید ریاضی کے کسی اہم مسئلہ کو چٹکی بجاتے حل کر دے تو کیا بعید از قیاس ہے۔

(ج) اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حیات مبارکہ سے جدید پر دستگاہ عالی کا مزید ایک شاہد عدل ملاحظہ ہو، ۱۹۱۹ء میں امریکہ کے کسی مہندس نے دعویٰ کیا کہ ۱۷ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو اجتماع سیارات کے سبب آفتاب میں اتنا بڑا داغ پڑے گا، کہ اس کے باعث زلزلے آئیں گے، طوفان شدید آئے گا۔ ممالک برباد کر دیے جائیں گے۔

اس کے رد کے ضمن میں دلائل حرکت زمین تحریر کیے۔ جب انہیں طویل ہوتے دیکھا، جدا کر لیا اور رد فلسفہ جدید میں بعونہ تعالیٰ حافل وکامل کتاب ''فوز مبین''، لکھی، اس کے مقدمہ میں ارشاد فرماتے ہیں۔

''عبد المصطفیٰ احمد رضا محمدی سنی حنفی قادری برکاتی بریلوی غفر لہ وحقق املہ کے دل میں ملک الہام نے ڈالا کہ اس بارے میں باذنہ تعالیٰ ایک شافی وکافی رسالہ لکھے، اور اس میں ہیئات جدیدہ کے ہی اصولوں پر بنائے کار رکھے، اسی کے اقراروں سے اس کا زعم زائل اور حرکت زمین وسکون شمس بداہۃ باطل''۔ (فوز مبین ص ۳)

پس جو اپنی زندگی میں برابر اس قسم کے کارنامے انجام دیتا رہا۔ اور قدیم ہو کر بھی جدید میں مجتہدانہ عقدے حل کرتا رہا۔ اس کے لیے تو یہی قرین قیاس ہے کہ جدید ریاضی کے اس مسئلہ کو بھی اسی محیر العقول طریقہ سے حل کرے، اس کے خلاف ہونا البتہ خلاف عقل ہے۔ غالباً اسی لیے غوری صاحب نے اس شق پر قدیم ریاضی والی شق کی طرح یہ نہیں فرمایا کہ اگر مسئلہ جدید ریاضی کا تھا۔ تو اعلیٰ حضرت کا اس کو حل کر دینا بالکل سمجھ میں نہیں آیا۔ بلکہ یہ فرمایا کہ ان کے جدید ریاضی میں بھی دستگاہ عالی کا شاہد عدل ہے، اور وہ فرما بھی کیسے سکتے تھے۔ اس سے قبل اسی امر کو قیاس کے موافق ثابت کرنے کے لیے کئی شواہد وہ خود نقل کر آئے ہیں۔ اب ہم قدیم ریاضی کا کوئی مسئلہ ہونے والی صورت پر غور کرتے ہیں۔

اس مسئلہ میں عقلی استبعاد کی وجہ سے یا ڈاکٹر صاحب کی طرف ہو سکتی ہے، یا اعلیٰ حضرت کی طرف سے۔ ڈاکٹر صاحب والی صورت کو تو فاضل مقالہ نگار نے خود واضح کر دیا ہے کہ ان کو قدیم ریاضی سے بھی دل چسپی تھی، اور یہ صورت کہ استبعاد اعلیٰ حضرت کی طرف سے ہو اس امکان کو بھی موصوف نے صاف فرمادیا ہے، کہیں فرماتے ہیں تفقہ فی الدین، اور ریاضی دانی مسلمہ حقیقتیں ہیں جن کا مخالفین کو بھی اعتراف ہے۔'' دوسری جگہ ارشاد ہوا'' اعلیٰ حضرت ریاضی قدیم کے محرم راز تھے اگر چہ سبقاً سبقاً اس کی تحصیل نہیں کی تھی۔

اس لیے جو کچھ الجھن ہے، صرف یہ ہے کہ اس مسئلہ کے محققین جب ہندوستان میں تھے تو ڈاکٹر صاحب سے اس کی تحقیق کے لیے جرمنی جانے کا ارادہ کیوں کیا تھا؟ یہ سوال کچھ ایسا مشکل نہیں۔

اولاً: قدیم و جدید علما کی جو خلیج اب دکھائی دیتی ہے، اس عہد میں کچھ اور گہری تھی، جس کا اعتراف اہل انصاف نے برملا کیا ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ عہد اس کے عنفوان شباب کا نہ ہو تو شباب کا ضرور تھا۔ کیا اس کے بعد بھی کچھ بتانے کی ضرورت ہے کہ کسی خاص وجہ سے وہ علمائے قدیم کی طرف رجوع نہ ہو سکے۔

ثانیاً: یہ امر بھی بعید از قیاس ہے کہ یورپ میں قدیم ریاضی سے دل چسپی رکھنے والے مفقود تھے۔ استحالہ عقلی کی نفی میں تو خود ڈاکٹر صاحب کی ذات کو پیش کیا جا سکتا ہے جو جدید کے ہو کر بھی قدیم کے اس درشناسا تھے۔ اور وقوع کے لیے مستشرقین کا وجود ہے جنھوں نے اسلامی علوم و فنون کے مردے قبر سے نکال نکال کر زندہ کیے۔ کیا ان میں سے کوئی علم قدیم کے اس عظیم سرمایہ کی طرف متوجہ نہ ہوا۔

ثالثاً: کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ بغیر قدیم ریاضی کی معرفت کے جدید ریاضی میں مہارت تامہ حاصل ہو جائے۔ بالخصوص طریقہ تحقیق میں جہان علم و فن کے ساتھ اس کی تاریخ مختلف ادوار کی انقلابی حالت، مختلف اسکولوں کے عہد بعہد رجحانات، غرض یہ کہ جملہ متعلقات کا استقصا کیا جاتا ہے۔

میں تو جدید و قدیم کسی کا شناسا بھی نہیں۔ مگر تمام علوم و فنون کی حالت پر قیاس کرتے ہوئے، یہ امر بالکل خلاف عقل معلوم ہوتا ہے کہ جدید ریاضی میں درجۂ امامت و مہارت حاصل کرنے کے لیے کوئی طغرۃ کار استہ ہو جس میں قدیم ریاضی نہ آتی ہو۔

یہ سب قوی قرائن اس امر کے کھلے شواہد ہیں، کہ ریاضی قدیم کا مسئلہ ہوتے ہوئے بھی ڈاکٹر صاب کا یورپ یا جرمنی کا سفر بالکل قرین قیاس ہے۔ اس لیے ہمیں افسوس ہے کہ ہم غوری صاحب کے اس نظریے سے اتفاق نہ کر سکے کہ ''قیاس آرائی سے بھی کچھ حاصل نہ ہوا۔

فاضل مقالہ نگار کی تحریر سے ہمیں یہ احساس بھی ہوا کہ شاید انہوں نے ''حیات اعلیٰ حضرت'' مصنفہ ملک العلما مولانا ظفر الدین صاحب مرحوم مغفور کا وہ مقام خود مطالعہ نہیں کیا ہے۔ جہاں یہ تفصیل مذکور ہے۔ افادہ عام کے لیے ہم وہ پورا حصہ نقل کرتے ہیں پھر اپنے شبہے کی وجہ ذکر کریں گے۔ ممکن ہے مسئلہ دائرہ پر بھی کچھ مزید روشنی پڑ جائے۔

ریاضی دانی

جناب سید ایوب علی صاحب کا بیان ہے کہ کسور اعشاریہ متوالی میں نصاریٰ تیسری قوت سے زیادہ کا سوال حل کرنے سے قاصر ہیں۔ چناں چہ فقیر کو بھی اسی قدر واقفیت تھی مگر حضور نے ارشاد فرمایا کہ مجھے جس قوت کا سوال دیا جائے حل کر دوں گا۔ اس کے بعد مجھے اور برادرم قناعت علی کو وہ قاعدہ تفہیم فرما کر دو چار مثالیں بھی حل کرا دیں، اس کے بعد ہی ایک خط جناب مولانا سید سلیمان اشرف صاحب بہاری پروفیسر دینیات علی گڑھ کالج کا حضور کی خدمت میں بایں مضمون آتا ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب جو ریاضی میں تقریباً ہر ولایت کی ڈگریاں اور تمغہ جات حاصل کیے ہوئے ہیں۔ عرصہ سے حضور کی ملاقات کے مشتاق ہیں۔ چوں کہ ایک جنٹل مین انگریزی وضع قطع کے آدمی ہیں۔ اس لیے آتے ہوئے جھجکتے ہیں، مگر اب میرے کہنے اور اپنے اشتیاق ملاقات سے آمادگی ظاہر کی ہے، قیام

نواب ضمیر صاحب کے بنگلہ پر ہوگا۔ لہذا اگر وہ پہونچیں تو انھیں باریابی کا موقع دیا جائے۔ حضور نے مولانا صاحب کو جواب بھیج دیا کہ وہ بلا تکلف تشریف لائیں، فقیر منتظر رہے گا، یہ وہ زمانہ تھا کہ بدایونی مقدمہ چل رہا تھا، دو چار روز کے بعد ڈاکٹر صاحب نے نواب صاحب کے بنگلہ سے اطلاع کی کہ میں پانچ بجے حاضر خدمت ہوں گا۔ چناں چہ وقت مقررہ پر موٹر آ گیا، ہم دونوں اس وقت موجود تھے، ڈاکٹر صاحب کو اندر بلا لیا گیا، شاید نماز عصر ہونے والی تھی، ڈاکٹر صاحب نے بھی وضو کیا اور موزوں پر مسح کیا مگر نماز کے وقت موزے اتار ڈالے، لہذا اعلیٰ حضرت نے ان سے پھر پیروں کو دھلوایا، بعد نماز کچھ باہمی گفتگو رہی، حضرت نے اپنا ایک قلمی رسالہ جس میں اکثر اشکال مثلث اور دوائر کے بنے تھے، ڈاکٹر صاحب کو دکھایا، ہم لوگوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب نہایت حیرت واستعجاب سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اور بالآخر فرمایا میں نے اس علم کے حاصل کرنے میں غیر ممالک کے اکثر سفر کیے مگر یہ باتیں کہیں بھی حاصل نہ ہوئیں، میں تو اپنے آپ کو بالکل طفل مکتب سمجھ رہا ہوں، مولانا یہ تو فرمایئے آپ کا اس فن میں استاد کون ہے؟ حضور نے ارشاد فرمایا: میرا کوئی استاد نہیں، میں نے اپنے والد ماجد علیہ الرحمہ سے صرف چار قاعدے جمع۔ تفریق۔ ضرب۔ تقسیم محض اس لیے سیکھے تھے کہ ترکہ کے مسائل میں ان کی ضرورت پڑتی ہے، شرح چغمینی شروع کی تھی کہ حضرت والد ماجد نے فرمایا: کیوں اپنا وقت اس میں صرف کرتے ہو، مصطفیٰ پیارے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سرکار سے یہ علوم تم کو خود ہی سکھا دیے جائیں گے۔ چناں چہ یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں مکان کی چار دیواری کے اندر بیٹھا خود ہی کرتا رہتا ہوں، یہ سب سرکار رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کرم ہے۔ اس کے بعد کسور اعشاریہ متوالیہ کی قوت کا تذکرہ آیا، ڈاکٹر صاحب نے بھی وہی فرمایا کہ تیسری قوت تک ہے، اس پر حضور نے میرے اور قناعت علی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ میرے یہ دو بچے بیٹھے ہیں، انھیں جس قوت کا آپ سوال دیدیں یہ حل کر دیں گے۔ ڈاکٹر صاحب متحیر ہو کر ہم دونوں کو دیکھنے لگے، پھر ڈاکٹر صاحب نے دریافت کیا کہ حضور اس کا کیا سبب ہے کہ

آفتاب حقیقۃً طلوع نہیں ہوا ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طلوع ہو گیا، اس کا جواب علمی اصطلاحات میں حضور نے دیا جسے فقیر بیان کرنے سے قاصر ہے، ہاں جو مثال بیان فرمائی وہ یہ تھی کہ کسی بند کمرے میں جھروکوں سے اگر روشنی پہونچتی ہو تو باہر کے چلنے پھرنے والوں کا سایہ الٹا نظر آتا ہے یعنی سر نیچے پاؤں اوپر، اس کے علاوہ اور مشاہدہ کیجیے، حاجی کفایت اللہ صاحب سے فرمایا: حاجی صاحب ایک طشت میں تھوڑا سا پانی ڈال کر ایک روپیہ اس میں ڈال دو، انھوں نے فوراً تعمیل کی، اب حضور نے ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: آپ کھڑے ہو کر دیکھیے کہ برتن میں روپیہ نظر آتا ہے یا نہیں انھوں نے کچھ فاصلہ سے دیکھ کر عرض کیا: ہاں نظر آرہا ہے۔ فرمایا: ذرا اور پیچھے ہٹ آیئے وہ کچھ پیچھے ہٹ آئے اور فرمایا: اب دکھائی نہیں دیتا ہے، حضور نے حاجی صاحب کو اشارہ کیا انھوں نے تھوڑا سا پانی برتن میں ڈال دیا، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: اب نظر آنے لگا۔ فرمایا: دو قدم پیچھے کو آجائے، روپیہ پھر نمایاں تھا۔ بعدہ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: افسوس یہ ہے کہ میں عربی سے ناواقف ہوں اور آپ انگریزی سے، کیا اچھا ہوتا کہ عربی کتب کا ترجمہ اردو میں ہو جاتا پھر میں انگریزی کر کے شائع کر دیتا۔ اور فرمایا: میرے یہاں کالج کی لائبریری (کتب خانہ) میں ایک کتاب عربی میں ہے۔ جس کا وجود دنیا میں معدودے چند نسخوں پر ہے۔

یعنی ایک تو میرے یہاں اور ایک جلد انگلینڈ گرینج، بھوپال، ریاست رامپور میں اور ایک نسخہ قسطنطنیہ میں ہے۔ ویسے میں چاہتا ہوں کہ اس کا ترجمہ انگریزی میں ہو جاتا لہٰذا اگر حضور فرمائیں تو میں ایک مولوی صاحب کو وہ کتاب دیکر خدمت والا میں بھیج دوں تاکہ وہ حضور سے آکر سمجھ لیں پھر ان سے میں سمجھ لوں گا۔ حضور نے فرمایا بہتر ہے، اس کے بعد ڈاکٹر صاب تشریف لے گئے، حضور نے کچھ مٹھائی تازہ موٹر میں رکھوا دی، چند روز کے بعد ڈاکٹر صاحب کے فرستادہ مولوی صاحب وہ کتاب لے کر آئے اور حضور سے پڑھنا شروع کیا، ہماری آنکھیں شاہد ہیں کہ حضور اس کمیاب بلکہ نایاب کتاب کو بغیر دیکھے بے تکلف مولوی صاحب کو اس طرح سمجھاتے جاتے جیسے کہ حضور نے اس کو بارہا پڑھایا ہے۔ یہ بھی

دیکھا کہ مولوی صاحب پڑھ رہے ہیں اور حضور پیش پیش فرماتے جاتے ہیں، اس کے بعد یہ ہونا چاہیے، یہ باب ہوگا، اور وہی نکلتا، مگر حضور کے سمجھاتے وقت معلوم ایسا ہوتا تھا کہ خالی ہاں ہاں کہنے کے سوا سمجھ میں ان کے کچھ بھی نہیں آرہا ہے۔

غرض مشکل سے تین چار روزہ کو واپس چلے گئے، ان کے جانے کے بعد حضور نے فرمایا کہ مولوی صاحب بے چارے کی سمجھ میں کیا آیا ہوگا۔ اور اگر کچھ ذہن میں آیا بھی ہو تو زیادہ سے زیادہ بریلی کے اسٹیشن تک، یا علی گڑھ پہونچتے پہونچتے بالکل کورے ہی ہوں گے۔ پھر فرمایا ڈاکٹر صاحب کے آنے سے پہلے ایک قسم کا خیال آتا تھا کہ انہوں نے اس علم کے حصول میں اپنی زندگی صرف کردی ہے، نہ معلوم کیا کیا سوالات کریں گے۔ بخلاف اس کے یہاں تو صدہا مصروفیتیں ہیں، خدا جانے میں جواب بھی دے سکوں گا یا نہیں، مگر بحمد اللہ پروردگار عالم نے ان کی پوری تشفی کرادی اور وہ بہت مسرور گئے۔

جامع حالات فقیر ظفر الدین قادری رضوی غفرلہ المولیٰ القوی کہتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے ان سوالوں کے جواب میں کہ کیا وجہ ہے کہ آفتاب قبل طلوع کے معلوم ہونے لگتا ہے اور اسی طرح بعد غروب ہو جانے کے یہی معلوم ہوتا ہے، غالباً اعلیٰ حضرت نے یہ جواب دیا ہوگا جو سید صاحب کے سمجھ میں نہ آیا، اور اسے نہ لکھ سکے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ علم المناظر میں ثابت ہو چکا ہے کہ نگاہ جب دو ملاء مختلف میں ہو کر گزرے جو کثافت و لطافت میں اختلاف رکھتے ہوں تو خطوط شعاعیہ جب ان دونوں ملاء کے ملتقی پر پہونچیں گے ٹوٹ جائے گی، اور جس سمت پر جارہی تھی اس کے نیچے ہو کر گزرے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر دریا یا تالاب میں کوئی لکڑی سیدھی اس طرح قائم کی جائے کہ اس کا ایک حصہ پانی میں ہو اور ایک حصہ باہر تو پانی کی سطح پر جو اس کا حصہ ہے نگاہ سے دیکھنے میں ٹوٹا ہوا معلوم ہوگا۔ کہ پہلے نگاہ ملا ہوا میں گذری پھر ملاء آب میں کہ بہ نسبت ملا ہوا کے کثیف تر ہے، یونہی طلوع وغروب کے وقت آسمان کی طرف دیکھنے میں نگاہ کو دو ملا قطع کرنا پڑتا ہے، ایک عالم نسیم کا کہ کثیف ہے، دوسرا اس کے بعد ہوا کہ بہ نسبت اس کے لطیف ہے، لاجرم خطوط شعاعیہ ملتقی

پر پہونچ کر ٹوٹ جائے گی اور نیچے ہو کر گذرے گی۔

تو افق حقیقی کہ بظاہر نگاہ کو وہیں تک پہونچنا چاہیے تھا اس انکسار کے سبب نگاہ اس سے نیچے پہونچے گی اور آفتاب جانب شرق قبل اس کے کہ افق پر آئے ہمیں مرئی ہوگا۔ اور جانب غرب بعد اس کے کہ افق سے گذر جائے مرئی رہے گا۔ واللہ اعلم۔

مولوی محمد حسین صاحب بریلوی ثم میرٹھی موجد ظلسمی کا بیان ہے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر جنہوں نے ہندوستان کے علاوہ غیر ممالک میں تعلیم پائی تھی اور ریاضی میں کمال حاصل کیا تھا، اور ہندوستان میں کافی شہرت رکھتے تھے اتفاق سے ان کو ریاضی کے کسی مسئلے میں اشتباہ ہوا ہر چند کوشش کی مگر مسئلہ حل نہ ہوا، چوں کہ صاحب حیثیت تھے اور علم کے شائق اس لیے قصد کیا کہ جرمن جا کر اس کو حل کریں، حسن اتفاق سے جناب مولانا سید سلیمان اشرف صاحب بہاری پروفیسر دینیات مسلم یونیورسٹی سے اس کا ذکر کیا، انہوں نے مشورہ دیا کہ آپ بریلی جا کر اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب سے دریافت کیجیے وہ ضرور حل کر دیں گے، ان صاحب نے کہا کہ مولانا یہ آپ کیا فرما رہے ہیں، کہاں کہاں تعلیم پا کر میں آیا ہوں اور حل نہیں کر سکا اور آپ ان صاحب کا نام لیتے ہیں جو غیر ممالک تو کجا اپنے شہر کے کالج میں بھی تعلیم حاصل نہیں کی، بھلا ان سے کیا معلوم ہو سکتا ہے، دو چار دن کے بعد مولانا سید سلیمان اشرف صاحب نے ان کو پریشان دیکھ کر یہی مشورہ دیا، اور موصوف نے پھر ان سے فرمایا تو غصہ بھرے لہجے میں کہا کہ مولانا عقل بھی کوئی چیز ہے آپ مجھ کو کیا رائے دیتے ہیں، اس پر مولانا نے فرمایا: آخر اس میں حرج ہی کیا ہے، اتنے بڑے سفر کے مقابلے میں بریلی جانا تو کوئی چیز نہیں، سیدھی گاڑی جاتی ہے کئی گھنٹے کا سفر ہے آپ ہو تو آیئے آخر ان کی سمجھ میں بھی بات آ گئی۔

چناں چہ مولانا سلیمان اشرف صاحب کو لے کر مارہرہ شریف پہونچے اور وہاں سے والا درجت جناب سید شاہ مہدی حسن میاں صاحب سجادہ نشیں مارہرہ شریف پیرزادہ اعلیٰ حضرت کو لے کر بریلی شریف اعلیٰ حضرت کے دولت کدہ پر پہونچے۔ اور اندر اطلاع

بھیجی۔ اعلیٰ حضرت کی طبیعت ناساز تھی، اس لیے حضرت مہدی حسن میاں صاحب قبلہ نے کہلا بھیجا کہ میں آپ کو دیکھنے کو آیا ہوں، فوراً پردہ ہوا اور یہ تینوں حضرات اعلیٰ حضرت کے پاس پہونچے۔ اعلیٰ حضرت نے حضرت مہدی حسن میاں صاحب کی تعظیم وتوقیر شایان شان فرمائی اور جناب مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کی بھی بوجہ سیادت تعظیم کی، جناب وائس چانسلر صاحب سے بھی مزاج پرسی فرمائی اور تشریف آوری کی غرض دریافت کی، وائس چانسلر صاحب موصوف نے فرمایا کہ میں ریاضی کا ایک مسئلہ دریافت کرنے آیا ہوں، ارشاد ہوا فرمایے، انھوں نے کہا وہ ایسی بات نہیں ہے جسے میں اتنی جلدی عرض کردوں، فرمایا آخر کچھ تو فرمایئے، غرض وائس چانسلر صاحب نے سوال پیش کردیا۔

اعلیٰ حضرت نے سنتے ہی فرمایا کہ اس کا جواب یہ ہے، یہ سنکر ان کو حیرت ہوگئی اور گویا آنکھ سے پردہ اٹھ گیا، بے اختیار بول اٹھے: میں سنا کرتا تھا کہ علم لدنی بھی کوئی شئے ہے، آج آنکھ سے دیکھ لیا، میں تو اس مسئلہ کے حل کے لیے جرمن جانا چاہتا تھا کہ ہمارے دینیات کے پروفیسر جناب مولانا سید سلیمان اشرف صاحب نے میری رہبری فرمائی، مجھے جواب سنکر تو ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا جناب اسی مسئلے کو کتاب میں دیکھ رہے تھے، سنتے ہی فی البدیہہ تشفی بخش نہایت اطمینان کا جواب دیا، بہت شاداں وفرحاں علی گڑھ واپس ہوئے۔

مجھے یہ واقعات سنکر بہت تعجب ہوا اور میں مشکوک رہا، اتفاق سے ۱۹۲۹ء میں میں شملہ گیا، اس زمانہ میں وہ وائس چانسلر صاحب بھی حسن اتفاق سے شملہ آئے ہوئے تھے، اور اسپیشل ہوٹل میں مقیم تھے، میں وہاں گیا، اور ان سے ملا اور کہا کہ میں ایک امر کی تحقیق وتفتیش آپ سے چاہتا ہوں، فرمایا: کل صبح بعد نماز فجر، دوسرے دن سویرے ہی گیا اور ان سے دریافت کیا کہ مجھے معلوم ہوا کہ آپ ریاضی کا کوئی مسئلہ معلوم کرنے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں بریلی تشریف لے گئے تھے، آپ نے اعلیٰ حضرت کو کیسا پایا، فرمایا: بہت ہی خلیق منکسر المزاج، اور ریاضی بہت اچھی خاصی جانتے تھے باوجودے کہ کسی سے پڑھا نہیں ان کو علم لدنی تھا، میرے سوال کا جواب بہت مشکل اور لاحل تھا، ایسا فی البدیہہ جواب دیا گویا اسی

مسئلہ پر عرصہ سے ریسرچ کیا ہے۔اب ہندوستان میں کوئی جاننے والانہیں ہے۔ جب میں نے خود صاحب موصوف کی زبان سے اس کو سنا تو یقین کامل ہوا۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ بریلی سے واپس ہونے پر پروفیسر صاحب نے داڑھی رکھ لی اور نماز کے بھی پابند ہوئے: ﴿ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم﴾

جامع حالات فقیر ظفر الدین قادری رضوی غفرلہ المولیٰ القوی کہتا ہے کہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین صاحب کا کسی مسئلہ ریاضی کی تحقیق میں بریلی شریف آنا، اور اعلیٰ حضرت سے مسئلہ دریافت کرنا، اور اس کا تشفی بخش جواب پانا مسلم جس میں اصلا شک وشبہہ کی گنجائش نہیں۔ رہا یہ کہ وہ کون مسئلہ تھا اور کب آئے اور آنے کے کیا کیا واقعات ہوئے، اس کے متعلق کسی نے اعلیٰ حضرت سے سن کرنہیں بیان کیا۔ تاہم سید ایوب علی صاحب کا بیان زیادہ قابل وثوق ہے۔

میرے علم میں اس کی وجہ یہ ہوئی کہ میرے قیام بریلی شریف کا زمانہ ہے، یعنی ۱۳۲۹ھ کے قبل ایک مرتبہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین صاحب نے علم المربعات کا ایک سوال اخبار دبدبہ سکندری رامپور میں شائع کیا کہ کوئی ریاضی داں صاحب اس کا جواب دیں، اخبار دبدبہ سکندری اعلیٰ حضرت کے یہاں آتا تھا اور مدیران اخبار مذکور کو جو خلوص وعقیدت اعلیٰ حضرت اور ان کے وابستگان کے ساتھ ہے مجھے یقین ہے کہ اب تک ضرور آتا ہوگا، خیر بہر کیف اعلیٰ حضرت نے جب اس سوال کو ملاحظہ فرمایا تو اس کا جواب تحریر فرمایا اور ساتھ ساتھ اسی فن کا ایک سوال بھی جواب کے لیے تحریر فرمایا اور مجھے حکم ہوا کہ اس کی ایک نقل رکھ لی جائے، میں اس زمانہ میں اعلیٰ حضرت کا رسالہ "الموهبات فی المربعات" نقل کر رہا تھا، اس لیے کچھ دلچسپی تھی، جب وہ جواب اور پھر سوال اخبار میں چھپا تو ڈاکٹر صاحب موصوف کی نظر سے گذرا، ان کو حیرت ہوئی کہ ایک عالم دین بھی اس علم کو جانتا ہے، چناں چہ ڈاکٹر صاحب نے اس کا جواب "اخبار دبدبہ سکندری میں چھپوایا، اتفاق وقت کہ وہ جواب غلط تھا اعلیٰ حضرت نے اس کی تغلیظ کی، متحیر تو ڈاکٹر صاحب پہلے ہی سے تھے، اب

ان کو سخت تعجب ہوا کہ ایک عالم دین صرف جانتا ہی نہیں بلکہ اس میں کمال بھی رکھتا ہے، یہ دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کو اعلیٰ حضرت سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا اور علی گڑھ میں اپنے احباب کے حلقہ میں اس کا تذکرہ کیا، لوگوں نے منع کیا کہ ہرگز مت جائیے، وہ بہت ہی سخت مولوی ہیں اور آپ علی گڑھی داڑھی منڈے، مولانا آپ سے بات بھی نہ کریں گے۔ لیکن انہوں نے اپنا ارادہ نہ بدلا، جناب مولانا سید سلیمان اشرف صاحب بہاری سے کہ بڑے زبردست سنی اور اعلیٰ حضرت کے ہم خیال وہم عقیدہ عالم، اس زمانہ میں وہاں پروفیسر دینیات تھے مشورہ کیا، انہوں نے بہت زبردست طریقہ سے نہ صرف مشورہ ہی دیا بلکہ بہت زور دیا اور فرمایا کہ ضرور جائیے، مخالفین نے اعلیٰ حضرت کو مشہور کر رکھا تھا کہ وہ بہت سخت ہیں، تیز مزاج ہیں، ایسا نہیں، آپ ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے اور ان کے اخلاق کو دیکھ کر تعجب کریں گے، یہ مشورہ دیکر ایک خط احتیاطا حضرت صاحبزادہ اکبر مولانا شاہ حامد رضا خاں صاحب حجت الاسلام کے نام لکھ دیا کہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین صاحب ایک مسئلہ ریاضی کے سلسلہ میں اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتے ہیں، ان کی حسب شان خاطر داری ہونی چاہیے، جناب مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کا خیال تھا کہ جب اس غرض سے جاتے ہیں تو اعلیٰ حضرت ہی کے یہاں ٹھہریں گے۔ اس کے بعد ۱۳۲۹ھ میں برادر دینی منشی عزیز الدین صاب قادری رضوی بریلوی مقیم شملہ کی کوشش سے میں شملہ گیا ڈاکٹر صاحب کب گئے اور کیا کیا باتیں ہوئیں اس کے متعلق جناب سید ایوب علی صاحب کا بیان قابل اعتبار ہے۔ ڈاکٹر صاحب نواب ضمیر احمد صاحب کے یہاں ٹھہرے اور ایک وقت خاص پر حاضر ہوئے اور سوالات کیے اور تشفی بخش جواب پائے۔؛

ملک العلما رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اس تحریر سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) ان دونوں فاضلوں کی ملاقات کے سلسلہ میں دو روایتیں ہیں۔ ایک سید ایوب علی کی، دوسری مولوی محمد حسین صاحب میرٹھی کی رحمہما اللہ تعالیٰ۔ اول الذکر میں جرمن وغیرہ کے کسی سفر کے ارادے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اور ملک العلما نے اسی روایت کو راجح قرار دیا

ہے۔اس بنیاد پر وہ سارے خرخشے جو جرمنی کے ذکر سے پیدا ہوتے ہیں ختم ہو جاتے ہیں۔

(۲) سید ایوب علی اور ملک العلما رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما کے بیان میں ان مسائل کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے، جو ان دونوں صاحبان کے تبادلہ خیال میں تحریراً یا تقریراً آئے اگر چہ اس خاص مسئلہ پر اب بھی پردہ پڑا ہوا ہے۔ جو اس سفر بریلی کا اصل محرک بنا۔

(۳) یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اصناف کے مسائل پر تبادلہ خیال رہا۔ جیسا کہ علم مربعات علم مرایا و مناظر، اور کسور اعشاریہ متوالیہ وغیرہ کے الفاظ رہنمائی کرتے ہیں، اس لیے اس طرح سوچنا کہ ڈاکٹر صاحب کو فلاں فلاں مسئلہ میں دل چسپی تھی اس لیے شاید وہی موضوع مذاکرہ رہا ہو، شاید صحیح سمت رہنمائی نہ کر سکے۔

(۴) مولوی محمد حسین صاحب میرٹھی نے اس واقعہ کی تصدیق خود ڈاکٹر صاحب موصوف سے کر لی ہے۔

(۵) ملاقات کی دونوں روایتوں میں حضرت مولانا سید سلیمان اشرف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ذکر ہے۔ اس لیے یہ ڈاکٹر طلحہ رضوی کا اضافہ نہیں بلکہ حضرت فاضل بہاری رحمۃ اللہ علیہ کی ہی تحریر میں موجود ہے۔

۷ / دسمبر ۸۰ء کو احسن العلما حضرت مولانا سید حسن میاں صاحب مارہروی سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کے سلسلہ میں فاضل مضمون نگار کے ذوق تجسس و تحقیق کی تحسین کرتے ہوئے فرمایا۔ یہ تو میرے خاندان کی روایت متواترہ ہے، کیوں کہ اس ملاقات میں میرا خاندان بھی شریک تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے حضرت مہدی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اعلیٰ حضرت کے نام خط لکھوایا تھا۔

لیکن افسوس کہ اب ایسا کوئی نہیں رہ گیا جس سے اس خاص مسئلہ میں تحقیق کی جائے، ایک مفتی اعظم ہیں سو وہ اس عالم میں نہیں، البتہ ڈاکٹر صاحب کے ایک عزیز قریب پاکستان میں ہیں جن کے پاس وہ خط و کتابت ہے جو اعلیٰ حضرت اور ڈاکٹر صاحب میں ہوئی، شاید اس میں اس مسئلہ کا ذکر ہو۔

شرح کلام رضا

تخلیق ارض وسما

سوال:۔ امام احمد رضا قدس سرہ کے الملفوظ حصہ اول کے شروع ہی میں یہ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چار دن میں آسمان پیدا کیا اور دو دن میں زمین: یکشنبہ، دوشنبہ، سہ شنبہ، چہارشنبہ، میں آسمان۔ اور پنجشنبہ اور جمعہ میں زمین۔ یہ قرآن مجید کی سورہ حٰم سجدہ آیت نمبر ۱۱، ۱۲ کے خلاف ہے، الملفوظ کے جتنے نسخے چھپتے ہیں سب میں یہی ہے۔ اس کا کیا مطلب ہوگا؟ قرآن مجید کے خلاف اعتقاد رکھنا چھاپنا کیا حکم رکھتا ہے؟

جواب: کسی قول کا قرآن عظیم کی کسی آیت کے خلاف نظر آنا اور بات ہے، اور فی الحقیقت قرآن عظیم کے خلاف اور بات ہے، ہمارے نزدیک مسئلہ دائرہ میں یہی صورت حال ہے کہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک قول سائل کو قرآن عظیم کی ایک آیت کے بظاہر خلاف نظر آرہا ہے، دراصل قرآن عظیم کے خلاف نہیں ہے۔

سائل نے قرآن عظیم کی آیت اور فاضل بریلوی کے قول میں اختلاف کے وجوہ پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔ اس لیے اب ہم کو ہی دونوں کام کرنا پڑ رہا ہے۔ تو پہلے ہم وجوہ اختلاف واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت کے مندرجہ بالا قول سے حسب ذیل باتیں ظاہر ہوئی:

(۱) پہلے آسمان بنا اور پھر زمین

(۲) چار دن میں آسمان بنا اور دو دن میں زمین۔

(۳) ایام کی تعیین کہ اتوار سے بدھ تک آسمان اور جمعرات و جمعہ کو زمین۔

(۴) جمعہ کے دن بین العصر والمغرب حضرت آدم پیدا کیے گئے۔

اب ہم آیت محولہ کا ترجمہ پھر تجزیہ پیش کرتے ہیں تا کہ وجوہ اختلاف ظاہر ہو سکیں۔

”تم فرماؤ کیا تم لوگ اس کا انکار رکھتے ہو جس نے دو دن میں زمین بنائی۔ اور اس کے ہمسر ٹھہراتے ہو۔ وہ ہے سارے جہان کا رب۔ اور زمین میں اس کے اوپر لنگر ڈالے، اور اس میں برکت رکھی۔ اور اس میں بسنے والوں کے لیے روزیاں مقرر کیں۔ یہ چار دن میں ٹھیک جواب پوچھنے والوں کے لیے، پھر آسمان کی طرف قصد فرمایا اور وہ دھواں تھا، تو اس نے آسمان و زمین سے فرمایا دونوں حاضر ہو، چاہے خوشی سے چاہے ناخوشی سے۔ دونوں نے عرض کی ہم رغبت کے ساتھ حاضر ہوئے۔ تو پھر انہیں سات آسمان کر دیا دو دن میں۔ [سورۃ حم السجدۃ:]

ان آیات بینات میں ہے کہ زمین بنائی پھر آسمان کی طرف قصد فرمایا۔ تو دو دن میں سات بنا دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ زمین کی تخلیق آسمان سے پہلے ہے۔

(۲) آسمان کو دو دن میں زمین کو دو دن میں۔ اور زمین کے اوپر اور اندر کی چیزیں چار دن میں۔

(۳) زمین و آسمان دونوں کو حکم دیا کہ حاضر آؤ تو دونوں مطیع و منقاد ہو گئے۔

(۴) یہ بت زمین و آسمان کے خالق کے ہمسر نہیں ہو سکتے۔

اعلیٰ حضرت کے قول اور آیات مبارکہ کے آخری دو نمبروں کا حال یہ ہے کہ جو بات اعلیٰ حضرت کے قول کے آخری دو نمبروں کی آیات میں ان کا کوئی ذکر نہیں، اور آیت کے دو نمبروں میں جو مذکور ہے۔ قول اعلیٰ حضرت میں اس کے بارے میں تشریح نہیں، اس لیے ان دونوں میں تعارض و اختلاف کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ہاں بقیہ دو نمبروں میں ضرور اختلاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کہتے ہیں کہ پہلے آسمان بنا، آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین بنی۔ بے شک ان دونوں باتوں میں صاف تعارض ہوتا ہے۔ (۲) اعلیٰ حضرت کہتے ہیں: چار یوم میں بنا۔ اور آیت بتاتی ہے دو دن

میں آسمان بنا۔ کہ ان دونوں باتوں میں تدافع معلوم ہوا ہے۔ لیکن ہماری بڑی بھول ہوگی اگر ہم اسی مقام پر جم کر رہ گئے۔ آیئے قرآن عظیم کی گہرائی میں اتریں۔ پہلے زمین بنی یا آسمان؟

تخلیق زمین وآسمان سے متعلق قرآن عظیم کے چار مقام پیش نظر ہیں:

(الف) آیات "حم السجدہ" جن کا ترجمہ اوپر گزرا۔

(ب) آیت سورۂ بقرہ۔ ترجمہ مندرجہ ذیل ہے۔

"وہی ہے جس نے تمہارے لیے بنایا جو کچھ زمین میں ہے۔ پھر آسمان کی طرف استوا (قصد) فرمایا تو ٹھیک سات آسمان بنادیے۔

ان دونوں آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ زمین پہلے بنی بلکہ زمین کے اوپر اور اندر جو ہے وہ بھی آسمان سے پہلے بنا۔

(ج) کیا تمہاری سمجھ کے مطابق تمہارا بنانا مشکل ہے یا آسمان کا۔ اللہ نے اسے بنایا اس کی چھت اونچی کی، پھر اسے ٹھیک کیا، اس کی رات اندھیری کی اور اس کی روشنی چمکائی اور اس کے بعد زمین پھیلائی، اس میں سے اس کا پانی نکالا اور چارہ اور پہاڑوں کو جمایا۔ (سورہ نازعات)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کو پہلے بنایا اس کے بعد زمین پیدا کی۔

(د) بے شک تمہارا پروردگار وہ ہے جس نے آسمان وزمین کو چھ دن میں بنایا۔

(سورۂ یونس)

اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان وزمین مجموعی طور پر چھ دن میں بنے۔ کتنے دن میں زمین اور کتنے میں آسمان؟ آیت مذکورہ میں اس کی کوئی تفصیل نہیں۔

اب ہم اصل مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ تو آیت "الف و ب" زمین اور اس کے متعلقات کی تخلیق کو آسمان سے مقدم ثابت کرتی ہیں۔ اور آیت نمبر ج کا تقاضہ ہے کہ آسمان پہلے بنا زمین بعد میں۔ اس مقام پر ہم دیکھتے ہیں کہ مفسرین بھی دو طبقہ میں بٹے

ہوئے ہیں۔

ابن عباس، زمخشری، اور اکثر مفسرین کا کہنا ہے کہ زمین پہلے بنی۔ اور یہی اس مرفوع حدیث کا مضمون ہے جس کو امام طبرانی، حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے اور بیہقی نے اس حدیث کی تصحیح بھی کی ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ سورہ والنازعات کی آیت مبارکہ "والارض بعد ذلك دخها" اور زمین آسمان کے بعد پھیلائی، کا کیا جواب ہوگا۔ کہ یہ قول اس آیت قرآن کے خلاف ہے۔ تو ان حضرات علمائے کرام نے جو آیات سورہ حم سجدہ و بقرہ کے مطابق قول کرتے ہیں۔ آیت والنازعات کا یہ جواب دیا۔ کہ آیت مذکورہ میں دحـــو کا لفظ جس کے معنی پھیلانا ہے۔ اور سورۂ حم سجدہ میں خلق کا لفظ آیا ہے جس کے معنی پیدا کرنا ہے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ زمین آسمان سے پہلے پیدا تو کی گئی مگر پھیلائی گئی آسمان کی تخلیق کے بعد۔ یہ جواب ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے جو بخاری میں تعلیقاً مروی ہے۔

مگر پھر اس پر یہ نکتہ سوال اٹھا کہ آیات حم سجدہ اور آیت سورۂ بقرہ کا تقاضا یہ ہے کہ زمین کی تخلیق اور اس کے دحو دونوں کے بعد آسمان کی تخلیق ہوئی ہو، اور زمین میں جو کچھ ہے اس کی پیدائش کے بھی بعد آسمان بنا ہو، جیسا کہ آیت بقرہ میں بنایا جو کچھ زمین میں ہے پھر آسمان کی طرف قصد فرمایا۔ اور آیات حم سجدہ میں زمین بنائی، لنگر ڈالے، برکت دی، روزیاں مقرر کیں پھر آسمان، جو تاخیر پر دلالت کرتا ہے۔ زمین اور اس کے متعلقات کی تخلیق کے بعد فرمایا گیا۔

اس لیے آیت والنازعات میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تاویل چسپاں نہیں ہوتی، اور یہی وجہ ہے کہ علما نے اس سے ہٹ کر چار تاویلیں اور کیں۔ کہ آیت مبارکہ والنازعات میں "والارض بعد ذلك دخها" اپنے ظاہر پر نہیں ہے، اور ان سب کے بعد یہ اعتراف کیا کہ "وكلها ان كان تكلفا لكن اضطروا اليه" (حاشیہ جلالین) ہر چند کہ یہ ساری تاویلیں تکلفات ہیں لیکن علما یہ کرنے پر مجبور ہیں۔

قاضی بیضاوی کہتے ہیں: انہ خلاف الظاہر "تاویل ظاہر کے خلاف ہے۔

☆اس کے برخلاف امام تفسیر مقاتل، قتادہ اور سدی اس بات کے قائل ہیں کہ آسمان زمین سے پہلے پیدا ہوا۔ اور یہی قول امام بیضاوی نے اپنی تفسیر میں اختیار کیا ہے جیسا کہ والنازعات کا ظاہر یہی ہے، اوران لوگوں نے آیات سورۂ بقرہ وحم سجدہ کی تاویل کی، اوران کی تاویل نسبۃً لگتی ہوئی ہے۔ امام بیضاوی کہتے ہیں۔ "ثم استوىٰ الى السماء" میں "ثم" کا لفظ تراخی زمانی کے لیے نہیں ہے، صرف تراخی مکانی کے لیے ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جن آیتوں میں "ثم استوىٰ الى السماء" ہے، پھر آسمان کی طرف قصد فرمایا، جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آسمان کا قصد زمین کے بعد ہوا۔ وہاں ثم کے معنی (اس کے بعد) نہیں ہیں، کبھی کبھی پہلے والی چیزوں کو جو نسبۃً کم اہم ہوں زمانہ میں مقدم ہونے کے باوجود اہم چیزوں کے بعد جو رتبہ میں مقدم ہوں لفظ ثم کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ سوایسا ہی یہاں بھی ہے کہ درحقیقت آسمان کو پہلے بنایا۔ لیکن بیان کرتے وقت یہ کہہ دیا کہ پھر آسمان کو بنایا۔ میں نے جلالین شریف ص ۳۹۷۔ بیضاوی شریف جلد خامس ص ۴۵۔ مدارک شریف چہارم ص ۸۹۔ بخاری شریف جلد دوم ص ۷۱۲۔ بیضاوی ص ۱۵۷ کا خلاصہ یہاں لکھ دیا۔ اہل علم اصل بحثوں کو مذکورہ بالا حوالوں میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جب قرآن عظیم کی آیات سے زمین وآسمان دونوں ہی کا ایک دوسرے کے بعد ہونے کا مضمون ہے یعنی آیات کسی ایک کی تقدیم پر قطعی الدلالۃ نہیں ہیں۔ اور جب مفسرین کرام کے اسی کی روشنی میں دو مکتبہ فکر پیدا ہوگئے۔ کہ کوئی زمین کی تخلیق مقدم کہہ رہا ہے اور کوئی آسمان کی، اور آج چودہ سو سال کی تاریخ میں فریقین میں سے کوئی گروہ دوسرے پر قرآن کی مخالفت کا الزام نہیں رکھ رہا ہے۔ تو اگر مولانا احمد رضا خاں صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آسمان کی تخلیق کے مقدم ہونے کی بات کردی، تو ان پر قرآن کی مخالفت کا الزام کہاں تک مبنی برانصاف ہے؟ اس لیے گزارش ہے کہ سائل کو مولانا احمد رضا خاں صاحب کا کلام قرآن کی ایک آیت کے خلاف نظر آیا، اور کوتاہی یہ

ہوئی کہ اس نے والنازعات والی آیت دیکھی ہی نہیں۔

زمین چار دن میں بنی اور آسمان دو دن میں۔ یا آسمان چار دن میں اور زمین دو دن میں؟

اس مسئلہ پر بھی قرآن عظیم نے کوئی قطعی فیصلہ نہیں دیا۔ آیات کے بیان کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔ آیت سورہ یونس میں ہے" آسمان وزمین چھ دن میں بنایا۔ اس آیت میں آسمان وزمین کی مشترکہ مدت تخلیق بتائی گئی۔ دونوں کی علیحدہ علیحدہ مدت بیان نہیں کی گئی۔

جس کی عقلا مندرجہ ذیل صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱) تین دن میں زمین تین دن میں آسمان۔

(۲) چار دن میں زمین دو دن میں آسمان

(۳) دو دن میں زمین چار دن میں آسمان

مزید عقلی صورتیں نکل سکتی ہیں، مگر وہ ہماری بحث سے بے علاقہ ہیں، اس لیے انہیں ذکر کر کے نمبر بڑھانا ہم نے بے فائدہ سمجھا۔

آیت حم سجدہ سے بھی اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے۔ چناں چہ اس میں ہے کہ دو دن میں زمین، دو دن میں آسمان۔ اور چار دن میں وہ چیزیں جو زمین کے اندر یا اس کے اوپر ہیں لیکن اس آیت میں بیان کیے ہوئے دنوں کی مجموعی تعداد آٹھ دن ہو جاتی ہے جب کہ سورہ یونس میں مجموعی تعداد صرف چھ دن بتائی گئی ہے۔

ان دونوں آیتوں میں تطبیق کی ایک ممکن صورت یہ بھی تھی کہ کہا جائے۔ کہ چھ دن اور آٹھ دن میں کوئی منافات نہیں ہے کہ ایسے مقام پر عدد حصر کے لیے نہیں ہوتا، یعنی یہ مطلب نہیں کہ اس سے زائد نہیں ہوسکتا، شیخ محقق اشعۃ اللمعات میں لکھتے ہیں، در ذکر قلیل وکثیر منافاتے نیست از جہت وجود قلیل در ضمن کثیر۔ کم عدد اور زائد عدد میں کوئی تعارض نہیں کہ کم زائد کے اندر ہی ہوتا ہے۔ آسمان سات ہیں یا نو؟ قرآن نے سات

بتائے قدیم، ہیئت داں اور حکما نو کہتے ہیں۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں "ان قیل ان اصحاب الار صادا ثبتوا تسعة، قلت: فیما ذکروه شکوك وان صح فلیس فی الایة نفی الزائد" اگر کہا جائے کہ اہل ہیئت نو آسمان ثابت کرتے ہیں اور قرآن سات، تو میں کہوں گا کہ اولا ان کی باتیں خود مشکوک ہیں اور صحیح ہوں تو قرآن میں سات کا بیان ہے سات سے زائد کی نفی نہیں ہے۔

الغرض یہ تاویل ممکن تھی کہ جس آیت سے چھ دن ثابت اس کا مطلب یہ نہیں کہ آٹھ دن نہیں جب دو دن میں مزید آیت حم سجدہ سے ثابت ہو گئے تو یہی مانا جائے۔

لیکن ائمہ تفسیر میں کوئی بھی اس تاویل کا قائل نہیں، اس لیے یہ خارج از بحث ہے، اسی طرح تین دن میں آسمان اور تین دن میں زمین جیسا کہ اوپر عقلی شقوں میں پہلی شق ہے اس کا بھی قول کسی سے ثابت نہیں۔ اس لیے یہ بھی بحث سے خارج ہے، اب تطبیق کے لیے صرف یہ دو صورتیں رہ جاتی ہیں۔

(۱) زمین چار یوم میں اور آسمان دو یوم میں

(۲) آسمان چار یوم میں اور زمین دو یوم میں

اول کہ اکثر مفسرین کا قول ہے چنانچہ صاحب مدارک کا قول:

"وفی الحدیث ان الله خلق الارض یوم الاحد والاثنین وخلق الجبال یوم الثلثاء وخلق یوم الأربعاء الماء والعمران والخراب فتلک اربعة ایام. وخلق یوم الخمیس السمأ وخلق یوم الجمعة النجوم والشمس والقمر والملائكة وخلق آدم فی آخر ساعة من یوم الجمعة.

(مدارک چہارم ص:۸۹)

حدیث شریف میں ہے کہ اللہ نے یک شنبہ و دو شنبہ کو زمین بنائی، منگل کو پہاڑ اور بدھ کو پانی آبادی۔ یہ چار یوم ہوئے اور جمعرات کو آسمان اور جمعہ کو ستارے چاند سورج فر شتہ آدم علیہ السلام کو جمعہ کی آخری گھڑی میں بنایا۔

اور سورۂ حم سجدہ کی آیت مبارکہ میں چار لفظ کو دو دن مانیں گے تاکہ سورۂ یونس سے مطابقت ہو جائے مدارک میں ہے:

فی اربعة ایا م فی تتمة اربعة ایام، ولا بد من هذا التقدیر لأ نه لو جریٰ علی الظا هر لکا نت ثما نیة ایام . (مدارک چہارم/ص۸۹)

زمین پر جو کچھ ہے چار دن یعنی یہ چار پہلے والے دو دن ملا کر ہوئے تاکہ مجموعی شمار چھ دن ہی رہے) اس تاویل کی ضرورت اس لیے پڑی کہ آیت کا ظاہر مراد لیا جائے تو کل دن آٹھ ہو جاتے ہیں۔

اور اس تاویل کا جواز کلام عرب سے اس طرح پیش کیا ہے۔

"کقولک سرت من البصرة الی بغداد في عشرة أیام والی کوفة في خمسة عشر یو ما. (بیضاوی خامس ص۴۵)

اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا ہے کہ کوفہ تک جانے کے لیے الگ سے پندرہ دن لگے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ بغداد کوفہ کل ملا کر پندرہ دن ہوئے

اسی قول کی ایک دوسری تعبیر حضرت ابن عباس سے بخاری میں مروی ہے کہ خازن نے اسی کو عبداللہ بن سلام، کعب احبار، ضحاک، اور مجاہد کا قول بتایا اور طبری کا مختار کہا۔

"ان اللہ تعالیٰ خلق التربة التی هی الارض بلا دحور لا بسط في یوم الأحد والا ثنین، ثم استویٰ الی السما ء فسوهن سبع سمو ت فی یومین: الثلثاء والاربعا. ثم دحا الا رض وبسطها واخرج ماء ها ومر عاها وجمیع ما فیها في یومین وهما الخمیس والجمعة.

اللہ تعالیٰ نے مٹی جس کو زمین کہتے ہیں، بغیر پھیلائے اور بچھائے دو دن اتوار اور دوشنبہ کو پیدا کیا، پھر آسمان کو دو دن منگل بدھ میں بنایا۔ پھر زمین پھیلائی، اس میں پانی نکالا چراگاہیں بنائیں اور اس میں جو کچھ ہے، جمعرات اور جمعہ کو بنایا۔

الغرض اس قول کا خلاصہ یہ ہے کہ اتوار سے بدھ تک زمین اور اس کے متعلقات بنے اور جمعرات اور جمعہ کو آسمان اور اس کے متعلقات، اس طرح آسمان وزمین کل چھ یوم میں بنے۔ سورہ حم میں جو زمین کے لیے دودن اور متعلقات کے لیے چار دن مذکور ہیں اس کا مطلب الگ سے چار یوم نہیں ہے۔ بلکہ وہ اور یہ ملا کر چار یوم ہے۔

دوسری صورت کے بارے میں امام خازن فرماتے ہیں:

”قیل: اول ما خلق الله القلم، ثم اللوح، فکتب فیه ما کان وما یکون، ثم خلق الظلمة والنور، ثم خلق العرش ثم خلق السماء من درة بیضاء ثم خلق التربة، ثم خلق جمیع ما فیها، ثم خلق آدم في آخر ساعة من ساعات یوم الجمعة، تتکامل جمیع الخلق فی ستة ایام“ .

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے لوح وقلم پیدا کیا، تو اس نے ماکان وما یکون لکھا، پھر روشنی اور تاریکی پیدا فرمائی پھر عرش بنایا پھر آسمان بنایا سپید موتی سے۔ پھر زمین پیدا کی، پھر اس میں جو کچھ ہے وہ بنایا، پھر آدم علیہ السلام کو جمعہ کی آخری ساعت میں بنایا۔ تو پوری مخلوق چھ دن میں ہوگئی۔

اس قول میں ہر ہر دن کی مخلوقات کا الگ الگ بیان تو نہیں ہے۔ لیکن یہ تصریح ہے کہ یہ سب چھ دن میں بنا اور یہ بھی واضح ہے کہ آخری دن جمعہ تھا۔ پس اس حساب سے پہلا دن اتوار ہوا۔ پھر اس قول کی عبارت پر غور کیجیے، تو آسمان اور اس کے متعلقات کے لیے چار جگہ خلق کا لفظ آیا ہے کہ پیدا کیا اور وہ پیدا کیا۔ جس کو نہایت آسانی سے چار دن پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اور زمین ومتعلقات کے لیے دو جگہ خلق کا لفظ جس کا صریح مطلب بھی ہوا کہ زمین کے لیے دو دن صرف ہوئے، حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے لیے الگ سے کسی دن کی ضرورت نہیں کہ یہ دوسرے دن (جمعہ) کی آخری ساعت میں پیدا کیے گئے۔ اور یہ بات فریقین کے نزدیک متفق علیہ ہے کیوں کہ جو لوگ آخری دو دن آسمان کے لیے بتاتے ہیں۔ وہ بھی دوسرے دن (جمعہ) کی آخری ساعت میں حضرت آدم علیہ السلام

کی پیدائش بتاتے ہیں۔

اب صاف ظاہر ہو گیا کہ یہ قول اسی گروہ کا ہے جو ابتدائی چار یوم میں آسمان اور آخری دو دن میں زمین کی تخلیق کے قائل ہیں۔

اور اس قول والوں کے لیے آیات سورہ حم سجدہ کی تاویل نہایت آسان ہے۔ ہم آیات حم سجدہ کو جوں کا توں قبول کرتے ہیں۔ مگر اس قول میں اصل زمین کی تخلیق سے متعلق جو دو یوم آئے ہیں جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

"خلق الا رض یومین" وہی شمار کیے گئے۔ دو دن متعلقات ارض والے نہیں، اور آسمان اور علویات چار دن، دو دن تو وہی جو اسی آیت میں لفظ فقضٰهن سبع سموات في یومین سے ثابت ہے، اور بقیہ دو یوم علویات کے اور حدیثوں سے ثابت ہیں۔ اور یہ تو اوپر ہی معلوم ہو گیا ہے کہ قلیل کثیر کے منافی نہیں، تو ثابت ہو گیا کہ اتوار سے بدھ تک چار یوم آسمان اور متعلقات کے لیے اور دو یوم زمین کے لیے۔

اب اس مقام پر پہونچ کر آپ ملفوظات حصہ اول کے ان جملوں کو پھر دھرائیے۔

اللہ تعالیٰ نے چار دن میں آسمان پیدا کیا، دو دن میں زمین یکشنبہ، دوشنبہ، سہ شنبہ، چہار شنبہ آسمان۔ پنجشنبہ اور جمعہ "زمین"۔

کتنا بڑا ظلم کیا مولانا احمد رضا علیہ الرحمہ نے کہ وہ بات کہہ دی جو علامہ خازن جیسے عظیم مفسر نے اب سے سیکڑوں سال پہلے لکھ دی تھی؟

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آسمان کی تخلیق زمین کی پیدائش پر مقدم، پس اس تقدیر پر آیت: "خلق الأرض فی یومین" کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے یہ فیصلہ کیا کہ زمین کو آسمان کے بعد دو دن میں بنائے گا۔

الغرض ایام تخلیق کے بارے میں بھی مفسرین نے آیات قرآنی میں تطبیق دی، اور تخلیق ارض وسما کے سلسلے میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں صاحب فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر مخالفت قرآن عظیم کا جو الزام تھا اس کی پوری صفائی دے دی۔ البتہ ایک امر

کی وضاحت ضروری ہے: اب تک ہماری جماعت نے اس الزام کا یہ جواب دیا تھا کہ اصل مسئلہ تو یہی ہے کہ زمین آسمان سے پہلے بنی لیکن الملفوظ میں کاتب کی غفلت کی وجہ سے زمین کی جگہ پر آسمان اور آسمان کی جگہ پر زمین تحریر ہو گیا، بادی النظر میں عبارت میں اس کی بڑی گنجائش ہے۔ ایک لفظ کے الٹ پھیر سے سارا معاملہ ادھر سے ادھر ہو سکتا ہے۔ تفسیر نعیمی میں سورۂ ''والنازعات'' کی آیت معہودہ کی تشریح کی گئی۔ زمین پیدا تو آسمان سے پہلے فرمائی گئی تھی، لیکن بچھائی نہ گئی تھی، اس تفسیر کی روشنی میں میرا بھی خیال یہی ہو گیا کہ بات زبان سے ادا ہونے کے بعد صفحہ قرطاس پر آنے تک کئی مراحل طے کرتی ہے، کہ ایک ذرا سی بے توجہی سے زمین آسمان سے بدل سکتی ہے، اس لیے ہو نہ ہو یہ کتابت کی ہی غلطی ہو۔ لیکن ہمارے عزیز رفیق مفتی شبیر حسن (رونا ہی) نے میری توجہ اعلیٰ حضرت کے رسالہ ''کشف حقائق'' کی طرف مبذول کرائی۔ میں اس کتاب کو بہت پہلے پڑھ چکا تھا لیکن بات مستحضر نہ تھی کی یاددہانی پر کتاب کھول کر دیکھی تو مطلع بالکل صاف تھا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

نور احدیت کے پرتو سے نور محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بنا، اور اس کے پرتو سے تمام عالم ظاہر ہوا۔ اول پانی پیدا ہوا پھر اس میں دھواں اٹھا اس سے آسمان بنا۔ پھر پانی کا ایک حصہ منجمد ہو کر زمین ہو گیا، اسے خالق عزوجل نے پھیلا کر سات پرت کر دیا، پھر اسی طرح آسمان کے سات طبقے کیے۔ یوں ہی پانی سے آگ بنی۔ ممکن ہے کہ پانی کسی قسم کی حرارت پا کر ہوا ہوا ہو۔ اور ہوا گرم ہو کر آگ، یا جس طرح مولیٰ سبحانہ تعالیٰ نے چاہا۔ غرض پانی مادہ تمام مخلوقات کا ہے۔

امام احمد و ابن حبان و حاکم کی حدیث میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کل شئی خلق من الماء ہر چیز پانی سے بنی ہے۔ (ص ۸)

اس عبارت میں مختلف روایتوں میں کائنات کی تخلیق سے متعلق جو تفصیلات آئی

ہیں، اعلیٰ حضرت نے ان کو باہم مربوط کیا ہے، اور زمین و آسمان میں ابتدا آسمان سے ہی فرمائی ہے۔

تفسیر نیشاپوری میں بھی اسی کو اختیار فرمایا ہے اور مختلف دلائل سے مبرہن فرمایا ہے، مگر امام اہل سنت کی توضیح و تشریح میں ایک کم مایہ طالب علم کی جد جہد کا یہ خلاصہ ہے۔

اگر قبول خاطر ہو تو آئندہ الملفوظ شائع کرنے والے ناشرین سے گذارش ہے کہ اس مقام پر ایک مختصر حاشیہ لگا دیں کہ تقدیم تخلیق سما کا قول بھی مختلف ائمہ نے کیا ہے، اور اس کو دلائل سے مؤید بھی کیا ہے، اور کسی صاحب کو کوئی اختلاف ہو تو اسی رسالہ کے صفحات ان کے رشحات کے لیے بھی حاضر ہیں۔

وقت اور زمانہ

(تحقیقی مضمون)

طبع انسانی کی بوقلمونیت اور رنگارنگی کی اس سے واضح مثال اور کیا ہوگی کہ مشکل سے ہی کوئی ایسی چیز ہوگی جس کے بارے میں انسان ہر طرح کا اتفاق رائے رکھتے ہوں، اور یہ اختلاف فی الطبع اس حد تک پہونچ چکا ہے کہ وہ چیزیں جن کو وہ رات دن بدیہی کہتے ہیں جب اس کی بھی تحقیق پر اتر آتے ہیں، تو متضاد اقوال کا ایک انبار لگ جاتا ہے۔

وقت، روز، زمانہ جسے بچے سے لے کر بوڑھے تک جانتے ہیں اور اپنی زندگی میں ہر دم اس کا چرچہ کرتے رہتے ہیں۔ اس کی تحقیق میں بھی انسانی مفکرین متفق الرائے نہیں اور مختلف نظریئے اس کی حقیقت کے بارے میں موجود ہیں۔

(۱) زمانہ کا خود وجود نہیں یہ ہمارے وہم کی پیداوار ہے۔

(۲) زمانہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرح واجب الوجود ہے اور جسم وجسمانیت سے پاک ہے۔

(۳) سارے حوادث اسی گنبد مینائی میں وجود پاتے ہیں، اس لیے یہ آسمان بریں ہی زمانہ ہے۔

(۴) یہ زمانہ آسمان تو نہیں لیکن اس کی گردش اور حرکت کا نام ہے۔

(۵) اور ایک بڑے گروہ گروہ فلاسفہ کا خیال ہے کہ یہ زمانہ نہ تو آسمان نہ آسمان کی حرکتیں بلکہ اس کی مقدار اور پیمانۂ حرکت فلک کا نام ہے۔

(۶) گذشتہ خیالات خرافات، زمانہ ایک حادثہ معلوم جس سے دوسرے واقعہ مجھولہ کا اندازہ لگایا جائے، جیسے ہم کہتے ہیں فلاں واقعہ طوفان نوح سے اتنے پہلے کا ہے اور

فلاں اتنے بعد کا ہے، بس نہ تو یہ صرف وہم نہ واجب الوجود، نہ آسمان نہ اس کی حرکت کا نہ حرکت کا پیمانہ صرف سیدھا سادھا طوفان نوح ہے جس سے ہم دوسرے واقعات کا اندازہ لگاتے ہیں۔

(شرح مواقف جلد پنجم)

اس ساری موشگافی میں سچ پوچھو تو زمانہ کی حقیقت کھوگئی اور مذاہب پیدا ہو گئے اس تحقیق سے تو لاعلمی ہی اچھی تھی۔

وہ اندھیرا ہی بھلا تھا کہ قدم راہ پہ تھے
روشنی لائی ہے منزل سے بہت دور مجھے

زمانہ کی تحقیق سے قطع نظر ایک دوسرا اہم سوال اس کے بارے میں یہ ہے کہ حوادث عالم میں اور زمانہ میں کون سا تعلق ہے۔ آیا یہ تمام حوادث کے لیے صرف ظرف ومکان کا مرتبہ رکھتا ہے۔ یا ان کے وجود وعدم حسن وقبح پر وقت اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر وقت سعد ہے یا نحس۔ منحوس ہے یا مبارک، شبھ ہے، یا اشبھ۔ اور دوسری بحث سے زیادہ مفید کارآمد اور انسان کے روزمرہ میں کام آنے والی ہے۔ زمانہ کی اس دوسری حقیقت سے بحث کرتے ہوئے اگر اس کی حقیقت کے بارے میں مذکورہ بالا نظریوں کو سامنے رکھا جائے تو بحث بہت کچھ آسان ہو جاتی، کیوں کہ جو لوگ سرے سے زمانے کے وجود کے ہی قائل نہیں ہیں۔ یہ سوال پیدا ابھی نہیں ہوسکتا کہ زمانہ میں کوئی چیز ہے۔ یا وہ سعد ونحس ہوسکتا ہے۔

ہاں بقیہ رائے میں اس کی گنجائش نکلتی تھی لیکن یہاں تو جو لوگ زمانہ کی حقیقت سے بحث کرتے ہیں وہ اپنے خالص طبعیاتی نظریہ کی بنا پر اور سائنٹیفک اصولوں پر۔ اور جو لوگ اس کے سعد ونحس اور تاثیر وعدم تاثیر کی گتھیوں کو سلجھاتے ہیں وہ زیادہ تر وہ لوگ ہیں جن کی انگلیاں سیارگان فلک واجرام سماوی کی نبض پر ہوتی ہے۔ اور جو قوموں کے عروج وزوال کا افسانہ ڈوبنے والے اور طلوع کرنے والے ستاروں کی زبان حال سے سنتے ہیں، اور صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ حکما وفلاسفہ یا محققین وقت حقیقت زمانہ اور وقت کی تاثیر کی کوئی اہمیت نہیں

دیتے، اور اس کو ماننا انتہائی احمقانہ خیال کرتے ہیں، جب کہ نجومی اور رمال اس سارے ہنگامہ رنگ و بو کو رفتار زمانہ کا زیر و بم اور تبسم زہرہ و جلال مریخ سے تعبیر کرتے ہیں۔

چناں چہ اس آخر الذکر طبقہ میں سال وماہ، روز و شب، صبح و شام، ہر ایک کے سعد و نحس ہونے کے بارے میں، اور ہر ایک کی تاثیر اور اس وقت کے موافق کام کا ایک مکمل ضابطہ اور تغیری قانون مرتب کیا ہے جو مدتوں سے اس گروہ کا فنی دستاویز ہے، ہفتہ میں سات دن ہوتے ہیں، وہ لوگ دن کو ساعتوں میں تقسیم کرتے ہیں، اور ہر دن کی ہر ساعت کے سعد و نحس ہونے کی تفصیل اور اس کے موافق کاموں کا بیان کرتے ہیں۔ ذیل میں مثال کے طور پر صرف سنیچر کے ساعتوں کی تفصیل دی جاتی ہے۔ ساعت اولیٰ۔ اس کا مالک سورج۔ یہ محبت کے لیے مناسب، دوم کا مالک زہرہ۔ یہ نحس کسی کام کے لائق نہیں، (۳) عطارد کے لیے۔ اس میں سفر اور اعمال حسب مناسب (۴) قمر کے لیے۔ یہ کام کے لائق نہیں خصوصاً بیع و شرا (۵) زحل۔ عداوت و دشمنی کے لیے لائق (۶) مشتری۔ قضائے حاجات کے لیے (۷) مریخ۔ کسی کام کے لائق نہیں۔ (۸) سورج۔ یہ سعید اور ہر کام کے لیے مناسب (۹) زہرہ۔ محبت کی تعویذ کے لیے (۱۰) عطارد۔ سعید اور ہر کام کے لیے (۱۱) قمر سعید۔ کتابت طلسمات کے لیے (۱۲) زحل نحس صرف عداوت۔ اسی طرح پورے مہینہ کو ۲۸ منزلوں پر تقسیم کرتے ہیں جس کو چاند کہ پورے ماہ میں طے کرتا ہے اور ہر منزل میں چاند کے ہونے کے وقت بحیثیت سعادت و شقاوت کے خاص اثرات مرتب ہوتے ہیں جن کا مختصر حال حسب ذیل ہیں۔

(۱) شرطین، نحس اعمال شر کے موافق (۲) بطین، مردوں کے موافق (۳) ثریا، عورتوں، دواؤں، مسافروں کے موافق (۴) ویران، نحس، عداوت اور فساد فی الارض کے موافق (۵) صنعہ صلاح و فلاح انہیں کی رفتار اور کسی کام کے کئی وقت کے لیے نحس و سعد ہونا انہیں رفتار کی وجہ سے ہے۔ اس کی واضح مثال عوام الناس میں مشہور و معروف وہ خیال ہے کہ جب چاند برج عقرب میں ہوتا ہے تو یہ شادی کے لیے انتہائی نحس ثابت ہوتا ہے۔

ایک سال کا ذکر ہے کہ قمر در عقرب میں تیرہ براتیں نکلیں اور شادیاں ہوئیں۔ مگر ان میں سے ایک بھی کامیاب نہ ہوئیں، کسی میں طلاق، کہیں جلدی موت، کسی میں فاقہ مستی، اور کسی میں آپس کی دشمنی پیدا ہوئی وغیر ذلک من الخرافات۔

اور یہ سعد و نحس کا خیال کسی زمانہ میں اتنا عام تھا کہ اس روشنی کے زمانہ میں بھی ہندوستان کے مسلمان عوام ہر ماہ کی ۳/۱۳/۲۳/۸/۱۸/۲۸ سخت منحوس خیال کرتے ہیں اور ماہ صفر کی تیرہ تاریخوں تک حتی الامکان شادی بیاہ نہیں کرتے۔ دوسرے طرف ہندو طبقہ سفر، حضر، شادی، بیاہ، ہروت، بوائی، جوتائی، تجارت، محنت، مزدوری۔ ہر ہر قدم پر شبھ گھڑی اور مناسب پچھتر کا خیال رکھتا ہے۔ اور ان کی پوری زندگی جنم کنڈلی اور پتروں میں گرفتار نظر آتی ہے۔ سعد و نحس کا ایک طلسم زار جس میں مسلمان قدرے کم لیکن ہندو سر سے پا تک گرفتار ہیں

یہاں یہ جان لینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ وقت کے سعد و نحس اور موثر ہونے کے خیال کی بہت کچھ گرم بازاری کے باوجود کوئی ٹھوس دلیل ایسی نہیں جس سے اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیا جاسکے۔ جہاں تک ہم سمجھتے ہیں زمانہ کی تاثیر کے حمایتیوں کی طرف سے اسی قسم کی بات کہی جاسکتی ہے۔ یاد رہے تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جب زحل مشتری کے مقارن ہوتا ہے لڑائیاں کثرت سے ہوتی ہیں اور کسی بادشاہ کی موت ہوتی ہے۔ جب زحل زہرہ کے مقارن ہو تو بھاؤ چڑھ جاتا ہے اور قحط پڑ تا ہے۔ سمین العارف یا فلاں ستارہ سعد و نحس عمل محبت و جملہ حوائج شادی بیاہ وغیرہ (۶) ہقعہ، سعد تمام اعمال خیر کے لیے مناسب (۷) ذراع، اعمال صالحہ و تعلیم و تعلم کے اقسام کے موافق (۸) نژۃ، سعد لیکن عداوت وغیرہ کے موافق (۹) طرفہ، نحس عداوت وغیرہ کے لیے (۱۰) جبھہ، نحس نقل مکان کے لیے مناسب (۱۱) خرثان، علاج وغیر کے لیے مناسب (۱۲) صرفہ، نحس صحت حجر کے لیے ناموافق، (۱۳) سماں، صالح للفساد (۱۴) غفر، دواؤں وغیر کے لیے لائق (۱۵) زبانہ، سعد، (۱۶) اکلیل، سعد و نحس سفر کے لائق نہیں، (۱۷) قلب، سعید ہتھیار اور جانوروں کی خریداری کے موافق (۱۸) شولہ، سعید (۱۹) متوسطہ، موافق (۲۰) نعائم، سعد بڑی صنعتوں

کے لائق ،(۲۱) بلدہ، نحس کھیتی سفر وغیرہ کے لیے ناموافق (۲۰) سعد الذابح، نحس انجام کار کے لیے (۲۱) سعد بلع ، سعد و نحس خریداری کے لیے موافق (۲۲) سعد السعود، تمام اعمال کے لیے موافق (۲۳) انجام کار کے موافق (۲۴) فرع، مقدم ہر کام کے لائق ، (۲۵) فرع موخر سعید جمل، ادویہ نافعہ کے موافق (۲۶) شاہر، عمل وسفر کے موافق ، (۲۷) پھر ان ۲۸ منزلوں کی ترکیب سے بارہ برج بنتے ہیں، حمل، ثور جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو، حوت، اور یہ بارہ برج محل اور ٹھکانہ میں ان سات مشہور سیاروں کے جو اس دنیا کے گرد چکر لگاتے ہیں: یعنی قمر، عطارد، زہرہ، شمس، مریخ، مشتری، زحل۔ یوں تو ہر برج ان ساتوں سیاروں میں سے کسی نہ کسی کا خاص ٹھکانہ ہے لیکن سیارے اپنی رفتار کے سلسلہ میں اپنے مخصوص برج کے علاوہ دیگر بروج سے بھی ہو کر گزرتے ہیں اور اس خاص اثرات عام پر مرتب ہوتے ہیں (شمس السعادت الکبریٰ جلد اول) اور دنیا میں مختلف اوقات میں جب طلوع کرتا ہے تو فلاں اثر عالم پر مرتب ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ پیشین گوئیاں جو ان امور کو سامنے رکھ کر کی جاتی ہیں ان کی صداقت اس امر کی صاف گواہ ہے کہ حوادث عالم کے پیچھے وقت کی سعادت وشقاوت کام کر رہی ہے، جیسے مذکورہ بالا شادیوں کی مثال یا دربار غزنوی کا وہ مشہور واقعہ جب کہ اس نے البیرونی سے امتحاناً کہا کہ یہ بتاؤ میں عمارت کے باہر کس دروازے سے جاؤں گا، اس نے جواب لکھ کر رکھ دیا، محمود دیوار توڑ کر باہر نکلا اور کاغذ پڑھا تو اس میں لکھا تھا کہ کسی دروازے سے نہ جائے گا، بلکہ دیوار توڑ کر باہر جائے گا، محمود نے اس کو کوٹھے سے نیچے پھکوانے کا حکم دیا اور وہ اوپر سے گرایا گیا۔ لیکن اتفاق سے ایک مسہری پر گرا اور بچ گیا، جب بادشاہ کے سامنے لایا گیا تو نوٹ بک نکال کر اس امر کی پیشین گوئی بھی دکھادی۔ ان شہادتوں سے یہی پتہ چلتا ہے کہ حوادث عالم میں وقت کا ہاتھ ضرور ہے لیکن اس کو کیا کیجئے گا کہ جہاں اس قسم کے واقعات ملتے ہیں، اس میں یہ بھی دیکھا گیا تھا کہ وہ غالباً ۵۸۰ھ میں سبعہ سیارہ کا برج میزان میں قران ہوا، انوری نے از روئے علم نجوم پیشین گوئی کہ آج شب شدید آندھی آئے گی اور مکانات گر

جائیں گے، اتفاق کہ اس رات میں اتنی ہوا بھی نہ چلی کہ میناروں کے چراغ گل ہوں، بلکہ سال بھر ہوا اتنی کم رہی کہ کھلیان کے کام میں زحمت ہوئی، بادشاہ بہت خفا ہوا اور انوری کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اور اس نے یہ اعتراف کیا کہ

ع اے مرسل الریاح تو دانی نہ انوری

اس لیے اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ درحقیقت کارخانہ حیات کے بست وکشاد میں نہ تو اجرام سماوی کو کوئی دخل ہے۔ نہ تو زمانہ اور وقت کو، ہاں زیادہ سے زیادہ علامات میں دست قدرت کے پوشیدہ کارناموں کے جو جب چاہتا ہے ان علامتوں کے مناسب امور ظہور پذیر ہوتے ہیں، اور جب چاہتا ہے اس کے خلاف بھی کرشمہ افزائی فرماتا ہے۔

درحقیقت کر رہی ہے کام ساقی کی نگاہ
میکدہ میں گردش مینا برائے نام ہے

اس سلسلہ میں اسلام نے ایک معتدل راستہ اپنے ماننے والوں کے لیے پیش کیا ہے اور احادیث کریمہ میں اس سلسلہ میں واضح رہنمائی ملتی ہے، کیوں کہ نشاۃ اسلام کے وقت عرب میں بھی اس قسم کے خیالات بری طرح لوگوں پر مسلط تھے، پورے عرب میں کاہنوں، رمالوں، نجومیوں اور آگم جانیوں کی حکومت تھی اور انسانوں کی گھڑی گھڑی سعد ونحس میں گرفتار تھی، چناں چہ مسلمانوں کو اس خیال سے سختی کے ساتھ روکا گیا کہ وقت کی تاثیر بھی کوئی چیز ہے، اور ماہ وسال، یا روز وشب بھی حوادث عالم پر کچھ اثر انداز ہوتے ہیں۔ مندرجہ ذیل حدیثوں سے اس امر پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

لا عدویٰ ولا طیر ۔ لاهامة ولا صفر (بخاری شریف)
لا عدویٰ ولا هامة ۔ ولا نوء ولا صفر (مسلم شریف)

صلی لنا رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم صلوٰة الصبح با لحدیبیة فی اثر السماء فلما انصرف قال: هل تدرون ما قال ربکم؟ قالوا: الله ورسولنا اعلم، قال: قال: اصبح عبادي مومن بي اکافر بي، فاما

من قال مطر بفضل الله فذالک مو من بي و کا فر بالکوا کب واما من قال مطر بنوء فذالک کا فربي ومومن بالکوا کب . (مسلم شریف)

وعن ابی هريرة قال: قال رسول الله صلی الله تعالیٰ عليه وسلم: ما قال ربکم عزوجل: علی عبا دي من نعمة لا اصبح بها کفرين يقولون کوکب وبا لکواکب . (مسلم شریف)

وعن ابن عباس فيه نزل ﴿وتجعلون رزقكم وانتم تكذبون﴾ عن ابی هريرة قال: قال رسول الله صلی الله تعالیٰ عليه وسلم: يو ذيني ابن آدم يسب الدهر، وانا الدهر، بيدی الامر، متفق عليه . لاعدوی ولاهامة ولا صفر وان تكن طرية فی شی ففي المراة والدار والفرس . (مشکوٰۃ)

مذکورہ بالا احادیث سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوئے۔

(۱) دہر کی تاثیر کوئی چیز نہیں، عالم میں موثر حقیقی صرف ایک ذات ہے، اس لیے زمانہ یا وقت کی نحوست یا سعادت کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

(۲) خصوصیت کے ساتھ صفر کی نحوست جو عرب اور عجم دونوں جگہ یکساں مسلم ہے اور آج تیرہ سو برس بعد بھی جاہل مسلمان جس میں بری طرح گرفتار ہیں۔ اسلام میں اس کی کوئی حقیقت نہیں، بلکہ یہ بھی اور مہینوں کی طرح ایک مہینہ ہے۔ جس طرح دوسرے مہینوں میں ہر کام ہوسکتا ہے۔ اس میں بھی ہوسکتا ہے۔

(۳) یونہی پچھتر اور گھڑیاں نہ تو کسی کے لیے منحوس ہوسکتی ہے نہ مبارک، اس لیے اس کی تاثیر کی بنیاد پر کوئی کام کرنا یا کسی کام سے رکنا اسلام سے روگردانی ہے۔

(۴) اخیر میں ایک عام حکم ہے کہ اسلام میں نہ صرف وقت و زمانہ بلکہ کوئی چیز بھی کسی کے لیے سعد و نحس نہیں ہوسکتی، یہ تو قسمت کے ہیٹوں اور تدبیر کے بزدلوں کا ڈھکوسلہ، عزم بلند و ہمت جواں کے لیے تو راہ کا ہر پتھر اور زیادہ برانگیختہ کرنے والا اور ہر رکاوٹ قدم تیز کرنے والی ہوتی ہے۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

اسلام نے ابتداً اس قسم کے خیال رکھنے کی اور اس پر عمل کرنے کی سخت ممانعت فرمائی۔اور اگر زندگی میں کوئی ایسا موقع آجائے کہ ابنائے زمانہ کی موافقت میں کسی امر کے سعد ونحس ہونے کی بحث پیدا ہو جائے تو اس وقت ایک سچے مسلمان کی طرح اس سے بے نیازانہ گذر جانے کا حکم دیا ہے۔

عن عروة بن عامر قال ذكرة الطيرة عند رسول فقال أحسبنا الفال وترد مسلما، فاذا رأى احدكم ما يكره فليقل: اللهم لا يأت با لحسنات الا أنت، ولا يدفع بالسيئات الا انت، ولاحول ولا قوة الا بالله .(مشكوة)

ہاں وقت کی تاثیر اور اس کی سعادت،نحوست سے قطع نظر اسلام نے وقت کی اہمیت کو پوری طرح تسلیم کیا ہے،اور پیغمبر اسلام نے فطرت کے اٹل قانون کی شکل میں فرمایا"کل امر مرهون بأ وقا تها" ہر کام کے لیے قدرت کی طرف سے ایک وقت مقرر ہے،کہ ایک سکنڈ بھی ادھر ادھر نہیں ہوسکتا۔اس لیے انسانوں کو وقت کی قدر کرنی چاہیے،اور مسلسل جدو جہد اور پیہم کوشش سے وقت کو رائگاں ہونے سے بچانا چاہیے،اور امر کی انجام دہی میں کاہلی اور سستی نہ برتنا چاہیے ورنہ ہوسکتا ہے کہ اک ذرا غفلت اور کوتاہی سے کام کا وہ مناسب وقت نکل جائے جسے قدرت نے اس کی تکمیل کے لیے مقرر کیا تھا۔اور ہمیں ہاتھ مل کر کہنا پڑے۔

قہر ہے تھوڑی سی غفلت بھی طریق عشق میں
آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

دوسری طرف اپنی انتھک کوشش میں ناکامیاب ہو کر بیٹھ نہ جانا چاہیے کہ ہوسکتا ہے کہ ابھی اس کام کی تکمیل کا وقت ہی نہ آیا ہو۔جو قدرت کی طرف سے اس کام کے لیے مقرر ہے،اس لیے ایک دفعہ پھر اسی عزم سے کوشش کرنا چاہیے۔

مشکلے نیست کہ آساں نہ شود   مرد باید کہ ہراساں نہ شود

پس وقت قدرت کا ایک قیمتی عطیہ ہے جس کے ساتھ ہماری زندگی کے تمام افعال کا گہرا تعلق ہے، اسے رائگاں ہونے سے بچانا اور بھرپور اپنے صرف میں لانا نہایت ضروری ہے، اسی حقیقت کی طرف پیغمبر اسلام نے مذکورہ بالا جملہ میں اشارہ فرمایا ہے، تو نبی اسلام نے اوقات کی فضیلت کو ایک زندہ حقیقت کی طرح تسلیم کیا ہے۔ اور جہاں وہ سعد ونحس ہونے کے تصور کی بیخ کنی کرتا ہے، وہیں اوقات کو ایک دوسرے سے افضل مانتا ہے، چناں چہ مطلقاً زمانہ کے بارے میں اشارہ نبوی ہے:

سب سے افضل میرا زمانہ ہے، پھر صحابہ کا، پھر تابعین کا، پھر تبع تابعین کا (حدیث) مہینوں کے افضل ومفضول ہونے کے بارے میں حسب ذیل تشریح موجود ہے:

رمضان شریف سب مہینوں میں افضل کہ اس میں قرآن نازل ہوا۔ پھر ربیع الاول کہ اس میں حضور سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ پھر رجب کہ خدا کے محترم مہینوں میں سے ہے۔ پھر شعبان کہ کثرت نوافل کی وجہ سے رسول اللہ کا مہینہ ہے۔ پھر ذوالحجہ کہ حج کا وقت ہے۔ پھر شوال کہ اشہر حرم میں ہونے کے ساتھ ساتھ رمضان کی بقایا رحمتوں کے نزول کا مہینہ ہے، پھر ذوالقعدہ کہ اشہر حرم میں سے ہے۔ پھر محرم کہ گذشتہ امتوں میں یہ بڑا اہم مہینہ تھا، بقیہ مہینے فضائل میں برابر ہیں۔

(قرآن واحادیث فتاویٰ عزیزیہ ملخصًا)

مندرجہ ذیل راتیں افضل مانی گئی ہیں:

شب عید الاضحیٰ، شب عید الفطر، شب برأت، شب عرفہ، شب قدر، (مدارج النبوۃ) بحوالۂ حدیث، لیلۃ الجمعہ (شب جمعہ) و بحوالۂ زرقانی، شب میلاد، معراج

دنوں میں یہ ایام افضل تسلیم کیے گئے ہیں:

یوم عرفہ، یوم جمعہ، عشرہ اولیٰ ذوالحجہ، (عامہ کتب احادیث) عید و بقرعید، دسویں محرم۔ اور ساعتوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

نصف شب یا سحر کا وقت، جمعہ کے دن کی ایک ساعت، ہر دن نماز عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک (حصن حصین) مذکورہ بالا تشریح میں جن اوقات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں کیے گئے اعمال کا اجر وثواب کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔اور ان اوقات میں ملاء اعلیٰ کی طرف سے مختلف دینی دنیوی خیر وبرکت کا نزول ہوتا ہے۔اور رحمت الٰہیہ بے شمار انعاموں کے ساتھ اپنے بندوں پر متوجہ ہوتی ہے۔اور دین ودنیا کے ہر کام میں ان کی دست گیری فرماتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ ساری باتیں ان اوقات کی فضیلت پر دلالت کرتی ہیں۔جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اسلام نے اوقات کی فضیلت کو ایک زندہ حقیقت کی طرح تسلیم کیا ہے۔

چناں چہ اسی فضل وبرتری کے لحاظ سے مختلف اوقات میں مختلف کاموں کی تخصیص وتعیین بھی ملتی ہے۔صحیح حدیث میں ہے۔ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ نے فرمایا:

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو سفر کے لیے جمعرات کا دن محبوب تھا۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خرج یوم الخمیس في غزوة تبوک وکان یحب.

امام تورپشتی فرماتے ہیں کہ:اختارہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم الخمیس؛ لأنه یوم مبارک ترفع فیه اعمال العباد الی اللہ (المرقات)

یوم عاشورہ کو اچھے کھانوں کے لحاظ سے خصوصیت حاصل ہے!

من وسع الی اهله وعیاله فی یوم عاشوراء وسع اللہ علیه في سائر السنه. (بیہقی بحوالہ مکاشفہ)

اچھے کپڑوں اور خوشبو کے لیے جمعہ کا دن مختار ہے:ما علیٰ احدکم ان وجد ان یتخذ ثوبین یوم الجمعه سوی ثوبین یخته. (مشکوۃ)

اور اگر غور سے دیکھا جائے تو اسلام کے بیشتر افعال کو کسی نہ کسی وقت کے ساتھ خاص علاقہ ہے، مثلاً اچھے کپڑے اور نماز سے قبل کچھ شیرینی عید کے دن مستحب، اس کے برخلاف قبل نماز کچھ نہ کھانا اور بعد نماز نمکین کھانا بقرعید کے روز، غسل کے لیے یوم جمعہ،

یوں ہی افضل وقت میں نماز سے افضل ہونا، اور مکروہ مفضول میں مکروہ ممنوع۔ روزے کے لیے رمضان کے مقدس ایام۔ یہ سب کے سب اس کے اعجاز ہیں کہ کسی دن کو اہل فضیلت اور خصوصیت واہمیت کی بنا پر کسی خاص کام کے لیے مقرر کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ امر اسلامی قوانین کی روح ہے سو فیصدی میل کھاتا ہے بلکہ ایسا ہونا ہی بہت ہے، کیوں کہ ہر کام جب بھی ہوگا کوئی نہ کوئی خاص وقت ہی ہوگا، اس لیے اس کی خصوصیت کا لحاظ ہے، اگر کام بھی متعین ہو تو یہ صرف احسن و بہتر ہوگا بلکہ معنیً پیروی رسول ہوگی۔

دیکھو! رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں سفر سیکڑوں در پیش ہوئے ہوں گے لیکن حضور نے اکثر سفر خمیس کے روز کیا اور اس کو مستحب و بہتر سمجھا۔ حضرت عائشہ اپنی رشتہ دار عورتوں کی رخصتی کی رسم کے لیے شوال کا مہینہ عمدہ تصور کرتیں۔ ساتھ ہی ایک سوال کیا جاسکتا ہے کہ جب اسلام میں بھی کچھ پھر کر ہی سہی وقت کے ساتھ اعمال وافعال کی تعین جائز رکھی ہے تو پھر عملا اس میں اور گذشتہ سعد ونحس کی تخئیل میں کیا فرق ہے، یہ تو ایسا ہی ہوا کہ کوئیں سے نکال کر قید میں ڈال دیا۔ یہ سوال ادنیٰ غور سے حل ہوسکتا ہے۔ اسلام نے شوم ونحس کے خیال کو بالکل ختم کردیا جب کہ سارے مفاسد کا سرچشمہ یہی تھا، اور اب صورت حال یہ ہوگئی کہ دن سب اچھے ہیں جن میں افضل فلاں فلاں دن ہیں، ہر کام ہر دن ہوسکتا ہے لیکن اگر فلاں دن کیا جائے تو اور خوب۔ ظاہر ہے کہ سعادت، وشقاوت کی دنیا میں عقیدے کا یہ انقلاب عظیم ہے جس سے دل کی دنیا کے ساتھ ساتھ عمل مشاہرہ بھی یکسر بدل جاتی ہے، ذیل میں ہم تاریخ اسلام سے دو ایسے ہی واقعے نقل کرتے ہیں جس سے ان دونوں خیال کے افراد کا استعمال عملا بالکل نمایاں ہوجاتا ہے۔

۱۰۹۹ء میں بیت المقدس کے سقوط کے بعد مصری علویوں کی فوج اسے واپس لینے اور ستر ہزار مسلمانوں کے خون کا انتقام لینے کے لیے مقام عسقلان میں جمع ہوئے۔ اگست ۱۰۹۹ء میں مسلمانوں کو اس اجتماع کی خبر گاڈفرے کو ہوئی، اس نے فوراً اپنی تمام فوجوں کو جمع کیا اور دوسرے سرداروں کو واپس جانے سے روکا، یوں ہی جمعیت ساتھ لیکر مسلمانوں سے

لڑنے کے لیے روانہ ہوئے۔ ۱۳ راگست کو دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا، مسلمانوں کا لشکر شیعہ حضرات میں شریک تھا، بعض فوجی سرداروں نے جنگ کا استخارہ کیا، استخارہ راس نہ آیا اتنے میں عیسائیوں نے حملہ کر دیا لیکن مسلمان بے حس و حرکت خاموش کھڑے رہے، آخر مسلمانوں کو شکست ہوئی اور افضل جو اس فوج کا سپہ سالار تھا بڑی مشکل سے جان بچا کر عسقلان بھاگا، عیسائی افواج حیرت کرتے ہیں، معلوم نہیں مسلمانوں کو کیا ہو گیا تھا کہ بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ (تاریخ عالم اسلام جلد سوم)

ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ فال اور نحوست کے پرانچے اڑا دیے، اور رسول گرامی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی امت کو استخارہ راس نہیں آیا تھا، اور نحوست ہی کی روح ہے جو انسانوں کو اپاہج بنا دیتی ہے، فوجوں کے عزائم پست کر دیتی ہے، قوموں کی قسمتیں بدل دیتی ہے، اور بنی آدم سے عمل کی قوت سلب کر لیتی ہے۔ اور اسی لیے اس پر ہادی اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے روک لگائی تھی تا کہ عالم عقائد کی یہ افیون ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے دل سے نکل جائے۔

مذکورہ واقعہ کے برخلاف حضرت علی کرم اللہ نے اپنے ایام خلافت میں کسی جہاد کا عزم مصمم فرمایا اور تمام تیاریاں مکمل کر لیں، کسی نے کہا حضور جس دن کا ارادہ رکھتے ہیں منحوس ہے، ارادہ ترک فرما دیجیے۔ آپ نے اس کی بالکل پرواہ نہ کی اور اسی دن کوچ کا حکم دیا اور تشریف لے گئے، دشمن سے مقابلہ بھی ہوا قائد جیش اسلامیہ نے استخارہ کی پرواہ کیے بغیر نہایت بے جگری کے ساتھ ان فوجوں کی کمان کی اور اللہ نے فتح دی، جب آپ واپس آئے تو اس شخص کو بلا کر فرمایا: میں نے قصداً اس دن اس کے لیے سفر کیا کہ تم جیسے کمزور ایمان والوں کا قیاس دور ہو۔ اگر میں رک جاتا تو تم اس کو اپنے لیے سند بنا لیتے اور وقت کی نحوست پر تمہیں دلیل مل جاتی۔ (مفتاح السعادت)

اس سے بالکل واضح ہو گیا کہ اگر پہلا خیال سرتاسر جہالت اور اپاہج بنانے والا ہے تو خیال دیگر سرتاسر حیات اور کارزار حیات میں انسان کی ہمت بڑھانے والا ہے۔

تصویر یا تمثیل

(تحقیقی مضمون)

محمد شفیق صاحب کیفی کا مراسلہ شائع ہوا جس میں فوٹو کے مسئلہ کے بارے میں یہ کہا گیا کہ یہ مسئلہ اب تک لاینحل ہے۔ حالانکہ چٹان میں فوٹو سے متعلق مراسلوں سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ آج کل کے روشن خیال علما اسے جائز کہتے ہیں، دوسرا فریق اسے نا جائز۔ رہ گیا یہ خیال کہ ایک فریق اپنے خیال سے رجوع کر کے دوسرے کی بات مان لے اور اس مسئلہ میں کوئی متفقہ فیصلہ ہو جائے۔ میرے خیال میں اس قسم کے مسائل میں آج تک یہ نہ ہوا ہے اور نہ آئندہ ہونے کی امید ہے۔ اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ دونوں فریق کے دلائل آپ دیکھیں اور اپنی عقل سے فیصلہ کریں۔

مسئلہ تصویر کے دو الگ الگ رخ ہیں جنھیں باہم ملا دیا گیا ہے۔ ایک ہے: تصویر کشی اور دوسرا: تصویر گھر میں رکھنا اور اسے استعمال میں لانا۔ چٹان میں زیادہ تر بحث مسئلہ کے پہلے رخ پر کی گئی ہے۔ مجوزین نے زیادہ شخصیتوں کا سہارا لیا ہے جن میں ایک سید سلیمان صاحب ندوی اور دوسرے ابوالکلام صاحب آزاد ہیں۔ جہاں تک سید صاحب کا تعلق ہے میرے خیال میں شاہ معین الدین کی اس تشریح کے بعد جو ۲۳ ستمبر کے چٹان میں شائع ہوئی، اب ان کا نام نہ لیا جائے گا اور کیا بہتر ہو کہ مولوی ابوالکلام آزاد صاحب بھی اپنی شرعی رائے ظاہر فرما دیں تا کہ ان کے بارے میں لوگوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے۔

لیکن حق یہ ہے کہ سارے مولویوں کے وفور علم کا اعتراف کرنے کے باوجود مسائل کے فیصلہ کا یہ طریقہ شرعی نہیں ہے کہ آج کل کے فلاں مولوی صاحب نے یہ کام کیا

ہے لہذا جائز ہوا۔ خود مسئلہ فوٹو پر تذکرہ میں مولانا آزاد صاحب کے جو خیالات ہیں وہ یہی بتاتے ہیں کہ مسئلہ شرعی اور چیز ہے اور کسی عالم کا ذاتی عمل اور چیز ہے، چناں چہ آپ لکھتے ہیں "تصویر کا کھینچوانا رکھنا شائع کرنا سب ناجائز ہے، یہ میری سخت غلطی تھی کہ تصویر کھینچوائی تھی اور الھلال کو باتصویر نکالا تھا"۔

اس لیے بحث صرف اس امر میں رہ جاتی ہے کہ دلائل شرعیہ سے بھی فوٹو کی حرمت ثابت ہے یا نہیں؟ اور اس سلسلہ میں بھی صرف یہی امر مابہ النزاع رہ گیا ہے کہ فوٹو تصویر ہے یا نہیں، اور حدیث شریف میں جہاں تصاویر کی ممانعت آئی ہے اس میں فوٹو داخل ہے یا نہیں؟

عربی ایک وسیع زبان ہے جس میں ایک ہی شے کی مختلف حالتوں کا لحاظ کر کے اس کے مختلف نام رکھے گئے ہیں لیکن استعمال میں ایک نام کا اطلاق دوسرے پر ہوتا رہتا ہے۔

مثلاً تمثال عربی میں مجسمہ کو کہتے ہیں، عینی شرح بخاری میں ہے:

"التمثال ما له جرم وشخص". تمثال وہ شبیہ ہے جس میں جسم و جثہ ہو۔

عربی کی متداول لغت منجد میں مجسمہ بنا کر اس کے نیچے لکھ دیا ہے "التمثال" مولوی عبدالحفیظ بلیاوی کی اردو عربی ڈکشنری میں ہے مجسمہ۔ تمثال۔ لیکن خود تمثال کو اہل عرب نہایت بے تکلفی سے تصویر اور نقش کے معنیٰ میں بولتے ہیں۔ سیوط۔

سرخسی میں ہے: "النبي صلى الله عليه وسلم اهدى اليه ثوبا عليه تمثال الطائر فاصبحوا قد محىٰ وجههٗ.

یہاں کپڑے کی تصویر کو تمثال کہا گیا ہے۔

بخاری میں ہے:

"عن عائشة قالت: قدم النبي صلى الله عليه وسلم من سفر وعلقت درنو ما فيه تما ثيل فا مر في أن انزعه"

یہاں بھی پردے کی تصویر کو تمثال کہا گیا ہے

اسی طرح تصویر اس نقش کو کہتے ہیں جو قلم اور ہاتھ کی مدد سے تیار کی جائے، منتہی الارب میں ہے۔ تصویر صورتہائے برانگیختہ از چوب۔ لیکن عرب نہایت بے تکلفی سے اسے تمثال وغیرہ کے معانی میں بولتے ہیں۔ امام نے اپنی صحیح میں ایک باب باندھا ہے" بالتصاویر" علامہ عینی اس کی شرح میں فرماتے ہیں: جمع تصویر یعنی صورۃ۔ اور محمد حسن الاعظمی معجم الاعظم میں لکھتے ہیں:

التصویر: السیئجو، بت، تمثال، مورت، صورت، عکس، تصویر۔

اور ایک لفظ ہے صورت جو اپنے معنی وضعی کے لحاظ سے ان سب کو عام ہے، منتہی الارب میں ہے: الصورۃ بالضم پیکر۔ صاحب معجم الاعظم نے لکھا ہے: الصورۃ: شکل، حلیہ۔ منجد میں ہے "الصورۃ الشکل کل ما یصور" یہاں تک کہ اس کا اطلاق فوٹو پر بھی ہوتا ہے۔ چناں چہ فرد نہان تومل نے منجد کے نئے اڈیشن میں جو ایک مختصر سے معجم کا اضافہ کیا ہے اس میں ایک سوبیس فوٹو ہیں جنہیں وہ ان کے الفاظ میں ذکر کرتا ہے۔ "تزئین متنبہ۔ ۱۲۰ صورۃ۔ مجلۃ العرب جمادی الاولیٰ ۱۳۷۵ھ" کے ٹائٹل پیج پر ایک فوٹو کے متعلق ہے: "اتری الصورۃ من الیسار" بلکہ اہل عرب کا تو دستور ہی یہی ہے کہ اکثر عکسی تصاویر کو وہ صورت لکھتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے مطالعہ سے اس میں پندرہ جگہ خود ہم نے دیکھا ہے۔ اس تفصیل کے ذکر کرنے سے ہمارا منشاء یہ ہے کہ وہ لوگ جو فوٹو کے جواز میں کہا کرتے ہیں کہ حدیث میں ممانعت تصویر کی آئی ہے۔ اور تصویر ہاتھ سے بنائی ہوئی صورت کو کہتے ہیں فوٹو تصویر میں داخل نہیں۔ انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ اصل لغت میں اگرچہ یہ معنی تصویر کے ضرور ہیں لیکن استعمال میں تصویر جس طرح مجسمہ وغیرہ کو کہتے ہیں اسی طرح فوٹو کو بھی۔ اور اگر زمانۂ رسالت مآب میں عکسی تصاویر کا رواج ہوتا تو بلاشبہ لفظ تصویر صورۃ کے ہم معنی ہو کر سارے ان جگہوں پر بولا جاتا، چاہے وہ مجسمہ ہو چاہے قلم سے بنائی تصویر ہو، چاہے عکسی فوٹو ہو۔ پھر ایک بات اور قابل غور ہے کہ جدید عربی میں فوٹو کے

لیے جونام ہے وہ ہے صورت شمسیہ۔عبدالحفیظ بلیاوی،سید سلیمان ندوی،محمد حسن الاعظمی،
پھر کیا یہ ایسے ہی نہیں ہیں جس طرح قلم سے بنائی ہوئی تصاویر کے ساتھ توضیحی صفت لگادی
جاتی ہے یہ روغنی تصویر ہے، یہ آبی تصویر ہے، یہ پنسل کی تصویر ہے، یہ رنگوں کی تصویر ہے پس
اگران توضیحی صفات کے لگادینے کے بعد بھی اگر یہ مختلف تصویر تصویر ہونے سے نہیں نکلتی
سب تصویر میں داخل رہتی ہیں۔تو فوٹو میں توضیحی صفت شمسی، یعنی (یہ رنگوں کی نہیں عکسی
تصویر ہے) لگادینے سے وہ تصویر ہونے سے کیسے خارج ہوجائے گا۔حالاں کہ اب سے
قبل علمائے ملت اسلام بالاتفاق انہیں الفاظ حدیث کی وہ ساری قسمیں مراد لیتے تھے جو ان
کے زمانہ تک ایجاد ہو چکی تھیں۔علامہ محمد بدرالدین عینی بخاری کی حدیث:ان اصحاب
هذه الصور يعذبون يوم القيامة" کی شرح میں فرماتے ہیں:"وقد دل حديث
الباب انه لا فرق فی تحريم التصوير بين ان تكون الصورة لها ظل
اولا،وبين ان تكون مدهونة او منقوشة أو منقورة أو منسوجة. امام نووی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ شرح مسلم میں فرماتے ہیں:"قال اصحابنا وغيرهم من العلماء
تصوير صو رة الحيوان حرام شديد التحريم وهو من الكبائر، لانه مستو
عد عليه بهذ الوعيد الشديد المذكور فی الاحا ديث سواء كا ن في ثوب
أوبساط أودرهم أو دينا ر أو فلس أو اناء أو حا ئط أو غيرها. ولافرق في
هذا كله بين ماله ظل ولا ظل له . هذا تلخيص مذهبنا وبمعنا ه قال
جماهير العلماء من الصحا بة والتابعين ومن بعدهم . ظاہر ہے کہ یہ تصویر کی
ساری تفاصیل بلفظہ حدیث میں نہیں آئی ہیں مگر علما اس لفظ تصویر وصورت میں ان سب کو
داخل فرماتے ہیں کہ صورتیں خواہ ڈھال کے بنائی جاتیں، خواہ تراش کے بنائی جاتیں، خواہ
کھود کر کسی چیز پر ہوں، سب کا بنانا حرام ہے۔اب اس تعمیم کے پیش نظر ہم نہیں کہہ سکتے کہ
مجوزین فوٹو کے باب میں لکڑی کے قلم کا سہارا کب تک لیے رہیں گے۔

پھر ایک پر لطف حقیقت یہ ہے کہ حسب روایت محمد حسن الاعظمی (المعجم الاعظم

ص ۱۶۵۷) مصور کا اطلاق جس طرح ہاتھ سے تصویر بنانے والے پر ہوتا ہے اسی طرح سنگ تراش پر ہوتا ہے، اسی طرح فوٹو گرافر پر ہوتا ہے۔ تو تصویر اور فوٹو کے لفظی ہیر پھر سے چاہے فوٹو کو بچا لیا جائے لیکن فوٹو گرافر تو ضرور اس وعید میں آہی جائے گا جو حدیث میں مصوروں کے لیے آئی ہے۔

ارشاد نبوی ہے: اشد الناس عذابا یوم القیامة المصورون "
(مسلم ج ۲ ص ۲۰۱)

اور اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ فوٹو تصویر نہیں ہے تو اس کے صورت ہونے سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا جیسا کہ ہم نے لفظ صورت کی تشریح میں مختلف کتب لغت سے پیش کیا ہے، جن احادیث سے تصویر کشی کی ممانعت آئی ہے اس میں صرف تصویر کا ہی لفظ نہیں بکثرت احادیث میں صورت کے رکھنے بنانے کی ممانعت بالتشریح ہے۔

"ان الملائکة لایدخلون بیتا فیه کلب ولا صورة، ان الذین لا یضیعون الصور یعذبون یوم القیامة یقال لهم احیوا ما خلقتم ". پس جب فوٹو صورت میں داخل ہے اور صورت گری کی ممانعت حدیث سے ثابت ہے تو فوٹو گرافی کس طرح جائز ہوگی۔

یہاں تک کہ جو کچھ ہم نے عرض کیا مجوزین کی اس تاویل کے متعلق تھا کہ حدیث میں لفظ تصویر ہے اور تصویر ہاتھ سے بنائی ہوئی صورت کو کہتے ہیں۔ اس لیے فوٹو تصویر نہیں اور نہ فقہی نقطہ نظر سے مسئلہ زیر بحث میں لفظ تصویر کوئی کلیدی لفظ نہیں ہے کہ اس میں ذرا تر میم سے حدیث کا حکم بدل جائے۔ اصول فقہ کا مسئلہ ہے کہ جب کسی جزئی کے لیے کوئی حکم شرعی ہو اور اس حکم کی علت بھی شریعت نے بیان کر دی ہو تو وہ علت اگر اسی کی ہم جنس کسی دو سری چیز میں پائی جاتی ہو تو وہی حکم شرعی اس دوسری جزئی پر بھی لاگو ہوگا۔ مثلا شراب کی حرمت قرآن و حدیث سے ثابت ہے اور صاحب شرع نے اس حرمت کی علت بھی بیان

کر دی ہے کہ نشہ ہے۔ پس جہاں جہاں نشہ پایا جائے گا حرمت کا حکم لگا دیا جائے۔ اب بھنگ کے لیے قرآن وحدیث میں کوئی حکم نہ ملے ہم اس حکم حرمت کو اس سے بھی متعلق کر یں گے، کیوں کہ اس میں بھی نشہ ہے پس اس مسئلہ تصویر میں بھی یہ دیکھنا چاہیے کہ حرمت کی وجہ کیا ہے: "عن عائشة قالت دخل علي رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم وانا مسترة بقرام فيه صورة، فتلون وجه رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم ثم تناول الستره فهتكه، ثم قال ان من أشد الناس عذابا يوم القيامة الذين يشبهون بخلق الله " اورایک روایت میں ہے: "اشد الناس عذابا عند الله يوم القيامة الذين لضاهون بخلق الله تعالىٰ"، جس سے معلوم ہوا کہ حرمت تصاویر کی علت خلق الٰہی کے ساتھ مشابہت ہے پس کیا یہ علت فوٹو میں نہیں پائی جاتی ؟ اگر پائی جاتی ہے اور ضرور پائی جاتی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ یہ حرام نہ ہو۔ فرض کرو حدیث میں صرف مجسمہ کا ذکر ہوتا اور اس کی حرمت کی یہی وجہ بیان کی جاتی تب بھی فوٹو اس علت کی بنا پر حرام ہوتا۔ کہ اس میں بھی مشابہت بخلق اللہ ہے۔ پھر یہ غور کرنا چاہیے کہ تصویر کا وہ کونسا بنیادی مقصد ہے جو فوٹو سے حاصل نہیں ہوتا، پھر یہ کیا تعجب کی بات ہے کہ اس کے مقاصد تو سب وہی ہوں جو تصویر کے لیکن اس کا حکم شرعی وہ نہیں جو تصویر کا ہو۔

ع   بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

یہ بحث تصویر گری سے متعلق تھی یہ بہرحال حرام ہے۔

تصویر کا دوسرا رخ: اس کا گھر میں رکھنا اور استعمال کرنا اس کے بارے میں شرعی حکم یہی ہے کہ اگر بہت چھوٹی ہوں کہ کھڑے ہو کر دیکھیں اور وہ زمین پر ہوں تو اعضائے تصویر ظاہر نہ ہوتے ہوں۔ یا تصویروں کا چہرہ مٹا دیا گیا ہو، یا حقیر جگہوں میں ہوں جیسے فرش یا صف نعال وغیرہ، یا ضرورت شرعی شدید ہو تو رکھ سکتے ہیں۔

نجدی تحریک کی تاریخی حقیقت

حرمت اسلام کی غارت گری نجد کی مذہبی تحریک کا شرمناک پس منظر

بارہویں صدی کی ابتدا میں جزیرۃ العرب کے بالائی حصہ نجد سے ایک سیاسی تحریک مذہب کے نام پر اٹھی، اس تحریک کے قائدین کا منشا تو صرف اقتدار کی کرسیوں پر قبضہ جمانا تھا لیکن لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کرنے اور عوام الناس میں اپنا اثر ورسوخ پیدا کرنے کے لیے ابتدا سارا زور توحید کی تعلیم، نماز کی تبلیغ اور شرک کی مخالفت میں کیا جاتا تھا، اور چوں کہ جزیرۃ العرب میں حصول اقتدار کے لیے مسلمانوں سے لڑنا ناگزیر تھا جہاں ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسلمان ہی مسلمان تھے، اقتدار کی کرسیوں پر بالکلیہ انہیں کا قبضہ تھا اور بڑے حد تک اسلامی قوانین بھی نافذ تھے، اس لیے جب اس نومولود تحریک سے متاثر ہو کر نجدی خواص وعوام کی بھیڑ ساتھ ہوگئی تو مسلمانوں پر حملہ کرنے، ان کا مال لوٹنے اور خاص حرمین طیبین میں قتل وغارت گری کا بازار گرم کرنے کے لیے جواز اس طرح پیدا کیا گیا کہ اس وقت عام طور سے مسلمان شرک میں مبتلا ہو کر دائرہ اسلام سے خارج ہو گئے، اس لیے ان سے جہاد فرض اور ان کا مال اور جان مباح ہے، کیا انقلاب ہے کہ آج سے دو سو سال قبل جس خون اور مال کو محمد ابن عبداللہ فداہ ابی وامی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس جزیرۃ العرب میں خدا کے دیے ہوئے اختیار سے یہ کہہ کر حرام قرار دیا تھا:

"امرت أن أقاتل النا س حتی یشھد وا أن لا الہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتو الزکوٰۃ فاذا فعلوا عصموا منی دماء ھم واموالھم"

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جہاد کرتا رہوں کہ وہ لا الہ الا

اللہ محمد رسول اللہ پڑھنے لگیں، نماز اور روزے کے پابند ہو جائیں، اگر وہ یہ کرنے لگیں تو ان کا ما ل ان کی جان محفوظ ہو گی۔

بارہ سو سال بعد ٹھیک اسی جزیرۃ العرب میں اسی جان و مال کو محمد ابن عبد الوہاب اپنے خصوصی اختیار سے یہ کہہ کر حلال کر رہا ہے:

امامن قال لا اله الا الله محمد رسول الله وهو يقيم علىٰ شركه، يدعو الموتى، ويسأل لهم قضاء الحاجة، وتفرج الكربات، هذا كافر مشرك حلال الدم والمال وان قال لا اله الا الله محمد رسول الله، وصلى وصام وزعم انه مسلم . (احمد بن ناظر نجدی بحوالہ محمد ابن عبد الوہاب ص ۶۳)

جو "لا اله الا الله محمد رسول" پڑھتا ہے اور یہ شرک کرتا ہے کہ مردوں کو پکارتا ہے اور ان سے ضرورتوں اور مصیبتوں کا حل چاہتا ہے وہ کافر و مشرک ہے، اس کی جان و مال حلال ہے، اگرچہ کلمہ پڑھتا رہے، نماز روزہ ادا کرتا رہے اور اپنے کو مسلمان سمجھتا رہے۔

اس بے باک انسان نے مذکورہ بالا حدیث کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں۔ لیکن لوگ یہی باور کرا رہے ہیں کہ وہ تو عامل بالحدیث اور بڑے محبّ سنت تھے۔ بس اب اس نادرشاہی اعلان کے بعد کیا تھا یہ نجدی مجاہدین کلمہ اور نماز کے لیے پروپگنڈے کے سائے میں بزرگوں کی قبروں کو ڈھاتے، یادگار مسجدوں کو کھودتے، جس مسلم آبادی میں پہنچتے قتل اور غارت گری کا بازار گرم کرتے، مسلمانوں کی جان و مال پر ٹوٹ پڑتے، اور خدا اور رسول کی سر زمین پر خالص دار الاسلام میں بزعم خویش جہاد کا مزہ لوٹ رہے تھے۔ اور ٹھیک انہیں خطوط پر یہ تحریک آگے بڑھی، پروان چڑھی اور اپنے کمال کو پہنچی۔ حد یہ ہے کہ پایہ تخت مفتوحہ علاقے و مال غنیمت اور وہ قوم جس سے جہاد کیا جانے والا تھا ایک ایک کر کے سارے لوازمات بہت پہلے ہی بانی تحریک محمد ابن عبد الوہاب کے ذہن میں واضح طور پر متعین تھے کہ اس لیے مسلمانوں پر حملہ کیا جائے گا، غارت گری کے بعد غنیمت بنا کر ان کا مال ہتھیا لیا جائے گا اور ان کی مقہور و مظلوم نعشوں پر نجدی امیروں کی عظمت کا تخت بچھے گا، ہم دیکھتے

ہیں کہ تحریک کے بالکل ابتدائی دور میں ابن عبدالوہاب نے امیر یمنیہ کو ان الفاظ میں شر کت کی دعوت دی تھی۔"انی ارجوان اقمت بنصر لا اله الا الله ان یظهرك الله تعالىٰ نجد أو أعرابها" (محمد ابن عبدالوہاب مسعود عالم ندوی/ص ۳۲)

مجھے امید ہے کہ اگر تو لا الہ الا اللہ کی مدد کے لیے کھڑا ہو گیا تو اللہ تجھ کو غالب کرے گا اور تو نجد اور اس کے دیہاتوں پر غالب آئے گا، اس کا مالک ہوگا۔

اور اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد جب امیر محمد ابن مسعود سے عہد و پیان ہو رہے تھے تو ان الفاظ میں فتوحات کا وعدہ کیا گیا تھا رہی دوسری شرط سو انشاء اللہ تمھیں فتوحات اور غنیمتوں میں اتنا کچھ مل جائے گا کہ اس طرح کا خیال بھی دل میں نہ آئے گا۔

(کتاب مذکورہ ص ۳۹)

ان عبارتوں میں پایہ تخت، بادشاہ، مال غنیمت، اور غنیم بڑے واضح طور پر نمایاں ہیں، اس کے نتیجے میں ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء میں ریاض اس جہاد کا شکار ہوا، امیر محمد ابن سعود بھائیوں اور بیٹوں نے معاندین کی خوب خوب خبر لی اور جدال وقتال کا سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا، آخر ۱۱۸۷ھ میں عبدالعزیز ابن سعود کے تازہ حملہ کی خبر پا کر ابن ورش شہر چھوڑ کر بھاگ گیا اور قلب نجد پر امیر عبدالعزیز کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ (کتاب مذکورہ ص ۴۶)

واضح ہو کہ جن لوگوں کے خلاف یہ شاندار فتح حاصل کی گئی تھی، قتل اور غارت گری کا بازار گرم ہوا تھا وہ سب کے سب مسلمان اور محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی امت تھے۔ ریاض میں جو مال غنیمت حاصل ہوا اس کی بھی ایک جھلک قابل ملاحظہ ہے۔

صرف فتح ریاض کے وقت ان پر (محمد عبدالوہاب پر) چالیس ہزار قرض تھا، یہ مال غنیمت سے ادا کیا گیا۔ (کتاب مذکورہ ص ۴۳)

عراق اور فارس کے حاجیوں پر بھی اس جہاد کی بجلی کوندی، عراق اور فارس کے حاجیوں کے قافلے جو وہابی علاقہ سے گذرتے نجدی دوستوں کی چھیڑ چھاڑ کا شکار ہونے لگے۔ (کتاب مذکورہ ص ٦٦)

۶۱ھ میں یزید نے میدان کربلا میں خود امام عالی مقام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تن نازنین کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کرایا، بارہ سو سال کے بعد ۱۲۱۶ھ میں نجدی مجاہدین نے کربلا میں ان کی تربت پاک کے ساتھ جو گستاخیاں کیں اس کی لرزہ خیز داستانیں ملاحظہ فرمائیں۔ سعود تمام نجد، جنوب حجاز، اور صنعا سے ایک لشکر جرار لے کر کربلا کے ارادے سے چلا، اور بلد الحسین کربلا کے باشندوں پر حملہ کیا، اس پر دھاوا بول دیا، شہر پناہ کی دیوار پر چڑھ گئے، اور زبردستی داخل ہو گئے، اور اکثر باشندوں کو تہ تیغ کیا، اور اس قبہ کو جوان کے اعتقاد کے مطابق حسین کی قبر پر بنایا گیا تھا منہدم کروایا، قبہ کے آس پاس کے چڑھاوے کی تمام چیزیں لے لیں، قبہ زمرد یاقوت اور جواہرات سے آراستہ تھا اس کے علاوہ جو کچھ مال ومتاع (ہتھیار لباس سونا چاندی قیمتی مصاحف اور بے شمار چیزیں) ملا سب لے لیا اور شہر میں ایک پہر سے زیادہ نہیں ٹھہرے، اور ظہر کے وقت تمام مال ومتاع لے کر وہاں سے نکل آئے اور اس کے باشندوں میں سے تقریبا دو ہزار قتل کیے گئے۔

یہ مان لیجیے کہ کربلا کے تمام باشندے کافر و مشرک تھے، پھر یہ حملہ جہاد کے کس خانے میں شمار ہوگا؟ اعلائے کلمۃ الحق تاسیس حکومت الٰہیہ جو جہاد کا اولین مقصد ہے اس کا دور دور تک پتہ نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چند خوں خوار ڈاکو خون خرابے لوٹ مار کے بعد شہر والوں کو خاک وخون میں تڑپتا چھوڑ کر چنپت ہو گئے۔

۱۲۱۹ھ میں اس مجاہد جلیل کا رخ حرم اور بلد الحرام کی طرف ہوا جس کے لیے حضور سرور کائنات نے فرمایا تھا: "ان هذه البلد حرمه الله بعد خلق السموات والارض فهو حرام بحرمة الله الى يوم القيامة وانه لم يحل القتال فيه لاحد قبلي ولم يحل لي الاساعة من النهار، فهو حرام بحرمة الله الیٰ يوم القيامة"۔

بے شک اس مقدس شہر کو اللہ نے حرام قرار دیا، ابتدائے آفرینش سے تو اب وہ قیامت تک اللہ کے حرام کیے سے حرام ہے، اس میں کسی کے لیے بھی لڑائی حلال نہیں، نہ

مجھ سے پہلے نہ میرے بعد، میرے لیے بھی صرف ایک گھڑی کے لیے حلال ہوا تھا، اب وہ اللہ کے حرام کرنے سے قیامت تک کے لیے حرام ہے۔

اسی بلد اللہ الحرام میں یہ مجاہدان اولو العزم تلواریں چمکاتے، قتل وخون ریزی کرتے، اور جہاد کا ثواب فراہم کر رہے تھے۔

سعود ابن عبد العزیز ایک فاتح کی حیثیت سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوا، باشندوں کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں کی گئی ہے۔ سعود نے کوئی بیس دن قیام کیا، اس دوران نجدی مسلمان ان قبوں کو گراتے رہے تا آں کہ مکہ کے تمام مشاہد اور قبے زمین کے برابر کر دیے گئے، سعود عبد المعین کو امیر بنا کر خود حرم کو مشرکانہ آلودگیوں سے پاک کرنے کی طرف متوجہ ہو گیا، وہ مشرکانہ آلودگیاں کیا تھیں جن سے حرم کو پاک کیا گیا، اسی راوی کا بیان ہے کہ کعبہ کے جواہر اور قیمتی ذخیرے فاتحین میں تقسیم کیے گئے اور قبے گرائے گئے۔

(کتاب مذکورہ ص ۷۸، ۷۹)

کہا یہ جاتا ہے کہ سعود نے باشندوں کو آزادی، لیکن ہوا یہ کہ ''بعض مجاور بھی قتل کیے گئے'' یہ بعض کتنا وسیع ہے اور ان مظلومین ومقہورین کی تعداد کتنی ہے اسے مقتولین سے تعلق رکھنے والوں سے پوچھنا چاہیے، لیکن ہمارے سامنے تو اتنی جاندار شہادتیں ہیں جن پر یہ الزام لگایا ہی نہیں جا سکتا کہ ان لوگوں نے وہابیت دشمنی میں یہ روایتیں گڑھ لی ہوں گی۔

مولوی حسین احمد مدنی صدر دار العلوم دیوبند اپنی کتاب ''الشہاب الثاقب'' پر تحریر کرتے ہیں جب کہ وہ غلبہ پا کر حرمین شریفین پر حاکم ہو گئے تھے، ہزاروں کو تہ تیغ کر کے شہید کیا اور ہزاروں کو سخت ایذائیں پہونچائیں۔

نواب صدیق حسن خاں ترجمان وہابیہ ص ۵۱، ۵۲) پر رقم طراز ہیں۔

وہ لشکر مکہ میں پہونچا، اس نے اہل مکہ کو زیروزبر کر کے تین مہینہ تک اس کا حصار کیا، اہل مکہ کا توشہ ختم ہو گیا۔ ناچار انہوں نے اطاعت قبول کی وہاں کے سرداروں اور شریفوں کا قتل کیا اور کعبہ کو برہنہ کر دیا اور دعوت وہابیت قبول کرنے پر لوگوں کو مجبور کیا۔

شاید غلاف کعبہ بھی کوئی مشرکانہ آلودگی تھی جس کے خلاف جہاد اور کعبہ سے جس کی صفائی ضروری تھی، مکہ شریف کے بعد مدینۃ النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی باری آئی۔

مدینہ منورہ ۱۸۰۴ء میں فتح ہوا، وہاں ایک شخص حسن قلعی شہر پر قابض ہو گیا تھا اور شہر کو سپرد کرنے سے پہلے قبہ شریف کے خزانے پر قبضہ کر کے اپنے خاص لوگوں میں تقسیم کر دیا، فتح کے کچھ ہی بعد سعود مدینہ پہنچا اور قبہ کھول کر جو کچھ تھوڑا بہت بچا تھا اپنے قبضہ میں کر لیا۔ شاید یہ سوچا جاتا کہ قبہ رسول کی بے حرمتی ایک اجڈ فوجی نے کردی تھی خود امیر سعود ہوتے تو یہ بات نہ ہوتی لیکن امیر نے بچا کھچا لوٹ کر بتا دیا، نہیں جی لنکا میں سب باوہ ہاتھ کے ہیں۔

نواب صدیق حسن صاحب ترجمان وہابیہ میں لکھتے ہیں:

پھر مدینہ منورہ گیا، وہاں کے لوگوں پر بغویہ باندھا، مزار مقدس نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو برہنہ کیا، اور اس کے خزائن ودفائن سب لوٹ کر درعیہ لے گیا۔ ان اقتباسات کو بار بار پڑھیے کہیں سے بھی اسلامی جہاد کی کوئی جھلک نظر آتی ہے۔

کیا کعبہ شریف کو لوٹنا، اس کا غلاف نوچ لینا، قبہ رسول کی غارتگری اسلامی جہاد ہے؟ اگر اسلامی جہاد یہی ہے تو کافرانہ شورش کیا ہوگی؟

پھر حجاج ابن یوسف کیوں بدنام ہے؟ ابرہۃ الاشرم پر کیوں لعنت بھیجی جاتی ہے۔

الغرض وہابیت کی پوری تاریخ قدم قدم پر اس امر کی شہادت فراہم کرتی ہے کہ تحریک وہابیت بھی دنیا کے اور تمام مطلق العنان فاتحین کی جابرانہ سرگرمیوں کی طرح نجد کے ایک شیخ کے جذبۂ استحصال واقتدار پرستی کا ثمرہ تھی۔ اور کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ دوسروں نے دنیا کو دنیا کہہ کر حاصل کیا، اپنی ہوس ملک گیری کی کوئی شرعی تاویل نہیں کی، اور یہاں شیخ نے اپنی ٹھیٹ دنیا پرستی کے منہ پر غازہ پھیر دیا، اپنے جذبۂ استحصال پسندی کی حسین وایماندارانہ تاویل کی، جس فوج کو مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کے لیے بھیجا اس کے ہاتھ میں ایسا پرچم دے دیا جس پر کلمہ توحید ثبت تھا اور اس تحریک کے نقطہ عروج

تک پہنچتے پہنچتے تو اس کی ہوس ملک گیری اتنی نمایاں ہو کر سامنے آگئی کہ وہ لوگ بھی جو ابتداء میں تحریک کے سخت موید تھے چیخ اٹھے اور شدید صدائے احتجاج بلند کی۔ رئیس الاحرار مسٹر محمد علی جو اپنی سادہ لوحی سے ایک زمانہ میں ابن سعود اور اس کی جارحانہ کاروائی کے پر زور حامی تھے، حرمین شریفین پر وہابی تسلط ہو جانے کے بعد وہاں کا آنکھوں دیکھا حال دہلی کی جامع مسجد میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

میں خدا کے گھر میں بیٹھا ہوں اور اس کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں، مجھے ابن سعود سے ذاتی عداوت نہیں، نہ میری مخالفت یا حمایت کسی ذاتی غرض پر ہے، جو کچھ میں نے آنکھوں سے دیکھا وہی کہوں گا اور صاف صاف کہوں گا خواہ اس سے کوئی جماعت خوش ہو یا ناخوش؟ سلطان ابن سعود اور ارکان حکومت بار بار اور ہر کلام میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی رٹ لگاتے تھے لیکن میں نے تو یہ پایا کہ انہوں نے کتاب اللہ اور سنت رسول دنیا کمانے کے لیے آلہ بنا رکھا ہے، جو لوگ ڈاکہ ڈالتے ہیں اور چوری کرتے ہیں برا کرتے ہیں، لیکن جو لوگ قرآن و حدیث کو آڑ بنا کر دنیاوی حکومت حاصل کرتے ہیں، چوروں اور ڈاکوؤں سے بھی برا کرتے ہیں۔ (مقالہ محمد علی حصہ اول ۹۵،۹۶)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

نجد اور نجدیوں کا یہی کارنامہ ہے کہ مسلمانوں اور صرف مسلمانوں کے خون میں ان کے ہاتھ رنگیں ہیں، اور غالباً اس وقت بھی یمن کے مسلمانوں پر جنگ کی تیاری ہے حالاں کہ سر گلبرٹ سے حدود حرم کے سامنے ہی ملاقات کر کے انہوں نے برطانیہ سے معاہدہ کیا ہے کہ برطانوی انقلاب کے حدود کے خلاف کبھی قدم نہ اٹھائیں گے۔

(مقالات محمد علی اول ص ۱۲۷)

عبد الماجد دریا آبادی (جو ابن سعود کے حملہ حجاز کے زمانہ میں اس کی قلمی جنگ کے عینی شاہد بلکہ شریک کار تھے جو ہندوستان بھر میں سعودیوں اور غیر سعودیوں میں لڑائی گئی) اپنی کتاب (محمد علی کی ڈائری) میں نہایت دل سوزی اور قلبی اذیت کے ساتھ شاہ ابن

سعود کی آمرانہ چالوں کا ماتم کرتے ہیں۔

خلافت کمیٹی اپنا نقطۂ نظر ڈیڑھ سال قبل سلطان ابن سعود کے سامنے یوں واضح کر چکی ہے:

ہندوستانی مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حجاز پر کوئی شاہ یا سلطان حکومت نہیں کر سکتا، بلکہ وہاں ایک ایسی جمہوریت قائم کرنی چاہیے جو غیر مسلم اغیار کے اثر سے بالکل پاک ہو، اس وقت اراکین حجاز کی ایک عارضی کمیٹی حکومت قائم ہو جائے اور مستقل حکومت کا فیصلہ اسلامی کانفرنس پر رکھا جائے، ۲۴/اکتوبر ۱۹۲۴ء کو اس کا جواب تار پر وصول ہو گیا۔ آپ کے اور مسلمانان ہند کے صحیح خیالات کا شکریہ آخری فیصلہ دنیائے اسلام کے ہاتھ میں ہے، ۲۲/نومبر کو نجد کے قاضی القضاۃ عبداللہ بن بلہید کا تار موصول ہوا کہ سلطان نے نجد سے مکہ روانہ ہوتے وقت یہ تقریر کی "میں مکہ معظمہ پر قبضہ کرنے نہیں جا رہا ہوں۔ اب مکہ معظمہ میں بغیر شریعت کے کوئی سلطان نہیں ہوگا، وہاں کی پالیسی ابنائے عالم اسلام کی مرضی کے مطابق ہوگی، ہم جملہ نمائندگان عالم اسلام کی کانفرنس مکہ معظمہ میں کریں گے، دسمبر ۱۹۲۴ء میں جو دعوت نامہ سلطان کی طرف سے موتمر اسلامی میں شرکت کے لیے آیا اس نے تو شک وشبہہ کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی، طویل عبارتوں کے درمیان یہ عبارتیں تھیں:

میں خدائے برتر کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ میرا مقصد حجاز پر تسلط یا حکومت کرنا نہیں، حجاز میرے ہاتھ میں اس وقت تک ایک امانت ہے جب تک اہل حجاز خود اپنے میں سے ایسے حاکم کا انتخاب نہ کرلیں جو عالم اسلام کی بات ماننے والا ہو، ہم ایک استفتا عام عنقریب جاری کریں گے جس میں حاکم حجاز کے انتخاب اور عالم اسلام کی نگرانی کے متعلق استفتاء ہوگا۔ اور پھر ہم اس امانت کو ان اصول کے ماتحت اس حاکم کے سپرد کر دیں گے۔

محمد علی کیا اب بھی اعتماد نہ کرتے، کیا اتنی تصریحات کے بعد بھی غیر مطمئن رہتے، آج اتنا زمانہ گذرنے کے بعد بھی ان بیانات کو پڑھ کر فیصلہ کیجئے کہ محمد علی کا اعتماد کسی سادہ

دلی کا نتیجہ تھا۔ لیکن ۱۱ر جنوری کو سلطان کے اعلان بادشاہت کا تار آ گیا، رائٹر کا یہ ذرا سا تار محمد علی کے لیے بم کے گولے سے کم نہ تھا، ایک مصیبت عظمیٰ کا پیام تھا ہائے! چاہا کیا تھا ہوا کیا، سوچا کیا تھا نتیجہ کیا نکلا، مانگا کیا تھا ملا کیا، سلطان کے اعلان ملوکیت کے بعد وسط جنوری میں ان کے نام حسب ذیل تار صدر جمعیت خلافت کی طرف سے روانہ ہوا۔ ہم حیران ہیں کہ اخبارات حجاز آپ کو بادشاہ منتخب کرنے اور نیز آپ کے اس کو قبول کرنے کی خبریں شائع کررہے ہیں، ہم متوقع تھے کہ حکومت حجاز کا فیصلہ آنے والی موتمر کے ذریعہ ہوگا جس کو آپ نے مدعو کیا ہے، ہم ان غیر متوقع واقعات کے متعلق جس نے فکر پیدا کردی ہے مستند اطلاع کا تشویش سے انتظار کررہے ہیں۔

لب ولہجہ اس سے زیادہ نرم اور مودبانہ کیا ہو سکتا تھا، لیکن زبان کی نرمی کہیں حقائق کی سختی کو بدل سکتی ہے، کسی ملک نے آج تک دلائل کی قوت کے سامنے اپنے لشکر جرار کو بے ہتھیار کردیا ہے، کسی فرمانروا نے تاریخ کے طول وعرض میں کسی بے قوت انجمن اور محض کاغذی اور زبانی زور رکھنے والی کمیٹیوں کی ڈر سے تخت وتاج سے دست برداری کی ہے، فطرت بشری کبھی اتنی متواضع نہیں ہوتی ہے، ہمارا ابھی یہی کہنا ہے کہ تحریک وہابیت ایک ٹھیٹ دنیاوی تحریک تھی جس کو دلائل کی قوت سے کوئی سروکار نہ تھا، حق وباطل کا کوئی امتیاز نہ تھا، صرف دنیاوی اور سیاسی اقتدار مدنظر تھا اور بس۔

☆☆☆

تبلیغی جماعت کے احوال

"تبلیغی جماعت" دہلی کی ایک گم نام مسجد سے بگولے کی طرح اٹھی اور ہندوستان کے پورے افق پر طوفان بن کر چھا گئی۔ اس کے اس قبول عام کی پشت پر کچھ تو اس کے نعرے "کلمہ" اور "نماز" کی دلکشی کام کر رہی ہے، کچھ اس کے اور دوسروں کی انتھک جد وجہد کا اثر ہے اور کچھ جاہل اور بے عمل عوام کو (جو اس احساسِ ندامت کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں کہ ہم عصیاں شعار اور علم وعمل کے تہی دست نیکیوں سے خالی ہیں) یہ سبز باغ ابھار رہا ہے کہ بیک گردش چلہ آلودگی کی اس پستی سے نکل کر صحابہ اور انبیا کی صف میں کھڑے ہو گئے۔

صد سالہ دور چرخ ہے ساغر کا ایک جام
نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

وہ سمجھتے ہیں اس "چلت پھرت" میں تفریح الگ رہی، جنت کا ریزرویشن بھی ہو گیا۔ آج سے ہی جنت کے دروازے پر حوریں ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔

لیکن جہاں تک اس نعرہ کا تعلق ہے یہ نعرہ تو ہمیشہ سے مسلم قوم کے پاس رہا ہے اور اپنی پوری دلکشی کے ساتھ، کون سی اسلامی جماعت ہے جس کا بنیادی مقصد یہ نعرہ نہیں تو کیا ان صدیوں کی طول طویل مدت میں کسی جماعت کو ایسے پرجوش حمایتی نہ ملے جو ہندوستان گیر پیمانے پر اس نعرہ کی روح پھونک سکیں۔

ہو سکتا ہے یہاں کچھ لوگ "وہابی تحریک" کی مثال دیں کہ اسی نعرہ کے ساتھ ایک بیک سارے ہندوستان میں انفلوئنزا کی طرح پھیل گئی تھی اور اس کی شدت کا یہ عالم تھا کہ "ڈبلو ڈبلو" ہنٹر کو اپنی رپورٹ میں ان کی شدید ترین جارحانہ جد وجہد کا اعتراف کرنا پڑا۔

لیکن یہ حقیقت اب ڈھکی چھپی نہیں رہ گئی ہے کہ "وہابی تحریک" بھی ہندوستان

میں انگریزوں کے دودھ پر ہی پل کر جوان ہوئی۔ ان کی سیاسی حمایت، اخلاقی تائید، اور مالی امداد بھی حاصل کر کے ہی یہ جماعت جہاد کا سوانگ رچا سکی اور ہندوستانی مسلمانوں کی اس متحدہ طاقت کو جسے مولانا فضل حق علیہ الرحمہ اور ان کے رفقا انگریزی سامراج کے خلاف استعمال کر رہے تھے جہاد کے نام پر اس کا رخ افغانی مسلمانوں کی طرف پھیر سکی۔

پس اگر تبلیغی جماعت بھی کوئی ایسی تحریک ہے جس کے نعرۂ توحید کا سارا فائدہ غیروں کو پہونچتا ہے، اور جس کے ہر ہر سجدۂ اخلاص کا دام اینٹی اسلام طاقتیں پہلے ہی ادا کر چکی ہیں تو خدارا بتایئے اس جماعت کو اسلام اور مسلمانوں سے کیا علاقہ؟

الغرض نعرے کی دلکشی بجا اور اس کی تاثیری قوت بھی مسلم، لیکن ہم کو اس سے الگ ہو کر گہرائی میں اترنا ہوگا اور کسی دوسری مومیائی کو تلاش کرنا ہوگا جس نے ایسی مردہ قوم میں یہ روح پھونک دی۔

اسی طرح دنیا کی تمام جماعتوں میں مخلص ترین ورکروں کی کمی نہیں۔ کئی ایک سیاسی جماعتوں تک میں بے حد محنت کرنے والے اور اپنے مقصد سے بے لاگ اخلاص رکھنے والے موجود ہیں۔ پھر بھی جو تبلیغی جماعت کے مساعی اور اس کے پھیلاؤ اور وسعت گیرائی میں ہے، وہ اوروں میں کہاں۔ بقول شخصے

ع مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب اس کے مخلص بانیوں کی کرامت ہے، حقیقت یہ ہے جو اللہ کے کام کے لیے نکلتا ہے قدرت اس کے ہاتھوں سے محیر العقول کارنامے بھی کرا دیتی ہے۔ جس کو دیکھ کر دنیا دار حیرت زدہ رہتے ہیں۔

اور یہی وہ بات ہے جسے بڑی شدت کے ساتھ رنگ دیکر پورے زور بیان اور تبلیغی دوروں کے درمیان رونما ہونے والے ہزاروں محیر العقول واقعات کی شہادتوں کے ساتھ بیان بھی کیا جاتا ہے۔ تبلیغی امرا ہوں کہ مامورین، رعنائی تخیل کی پوری کرشمہ سازیوں کے ساتھ اس کا اظہار کرتے نہیں تھکتے۔

لیکن میں نہایت ادب سے گزارش کروں گا کہ یہ ''کفر'' تبلیغی موحدین کے منہ سے کب سے نکلنے لگا۔ آخر یہی لوگ تو ہیں جن کی زندگیاں بزرگوں کی قبریں کھودتے اور ان کی کرامتوں کا جنازہ نکالتے گزری ہے، تو کیا جو بات خواجہ اجمیری اور سرکار بغداد رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی طرف منسوب ہو کر شرک اور گمراہی ہو جاتی تھی۔ بیمہ کمپنیوں سے کمائے ہوئے منافعوں اور بینک کے سودی کاروبار سے حاصل کی ہوئی آمدنیوں کے بل پر کی گئی تبلیغی کے دوروں میں آکر ایمان وآگہی بن گئی۔

میں نہایت دل سوزی سے مسلمانوں کے سنجیدہ طبقہ کو اس تضاد کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کی تبلیغی حضرات کی پوری میجنگ باڈی اسی نقطۂ خیال پر صمیم قلب سے ایمان لانے والی ہے۔ جو بزرگوں کے مزاروں پر جا کر ان سے کچھ مانگنا تو ایک طرف رہا ان کے وسیلے سے خدا سے بھی مانگنا شرک اور گمراہی قرار دیتا ہے، اور آج بھی زبان وقلم کی پوری توانائی اسی امر کی تبلیغ میں صرف ہوتی ہے کہ ان صاحبان مزار بزرگوں میں کیا دھرا ہے۔ وہ تو ہماری دعا کے منتظر ہیں۔ ان سے کیا مانگنا وہ کیا کر سکتے ہیں۔

جب تبلیغ کی ساری کرشمہ سازیوں کے پیچھے غیبی قوتوں کی کارفرمائیوں کا ایک سحر کار منظر پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ بستی نظام الدین کے مرکز میں سیکڑوں آدمی روز آرہے ہیں جا رہے ہیں۔ کھا رہے ہیں جماعتوں کو بھیجا جا رہا ہے۔ آخر یہ محیر العقول اخراجات جو بادشاہوں سے بھی پورے نہ ہو سکیں کہاں سے آتے ہیں؟ اجی بس اللہ دیتا ہے۔

آپ کو معلوم نہیں گورنمنٹ بھی حیران ہے، کتنی دفعہ سی آئی ڈی تحقیقات کے لیے آئی اور حضرت جی نے گودام کی کنجی پھینک دی، اس نے ہر طرف تلاش کیا ایک دانہ بھی نظر نہ آیا۔ حیران حضرت جی کے سامنے آیا آپ نے دوبارہ فرمایا آپ پھر جا کر دیکھیں۔ اب دوبارہ پھر گیا تو جہاں ابھی چند منٹ پہلے ایک دانہ نظر نہ آیا تھا ہزاروں بورے قطار اندر قطار بھرے پڑے ہیں۔

یا للعجب جو بات درگار نظام الدین کی طرف منسوب کر کے اگر کہہ دی جائے تو

ایوان توحید میں زلزلہ آجائے۔ ابھی اس درگاہ سے چند قدم پہلے عین توحید ہوگئی اور حضرت جی کے ہاتھ پر عین ایمان بن گئی۔ کہیں ہم کو یہ تو نہیں سمجھایا جارہا ہے کہ بات میں کچھ نہیں رکھا ہے بات دراصل یہ ہے کہ جب تک خانقاہ نظام الدین ویران نہ ہوگی بستی نظام الدین آباد نہیں ہوسکتی۔

ذہن وفکر کے لیے انتہائی اہم موڑ ہے۔ خاصان خدا کی یہ سروسامان جماعت ہر تین یا چھ مہینے کے بعد ہندوستان کے کسی بھی صوبہ میں ایک اتنی بڑی نماز کانفرس کرڈالتی ہے جس کی کم از کم نفری تیس چالیس ہزار ہوتی ہے جس کے لیے نہ کوئی پروپیگنڈہ نہ پبلسٹی، حد یہ ہے کہ اشتہار کی ایک چٹ بھی نہیں چھپتی اور انتظام کا یہ عالم کہ رہنے کے لیے چھولداری، ایک نہیں سیکڑوں، کھانے کا معقول انتظام، دور سے آنے والوں کے لیے بس سروس گویا ایک عارضی شہر بس جاتا ہے۔ شاید ہم کو لاعلمی کا طعنہ دیا جائے کہ کھانے کا انتظام جماعت نہیں کرتی، دکانیں لگوادی جاتی ہیں اور شریک ہونے والے دام دے کر کھاتے ہیں۔ اس جماعت کا سارا ریکارڈ خفیہ ہی رہتا ہے۔ اس لیے تحریری ثبوت کا کہاں امکان لیکن شریک ہونے والوں کی زبان سے ہم نے خود سنا کہ اس گرانی کے زمانہ میں اجتماع کا مارکیٹ بھاؤ یہ تھا کہ چار پانچ آنہ میں ایک شخص اچھی طرح آسودہ ہوجاتا ہے۔ یہ جماعت کے ماہرین اقتصادیات کی چابک دستی ہے یا جماعت کی روایاتی کرامت۔

وضو کرنے کا انتظام تو جماعت کی طرف سے ہی ہوتا ہے۔ لکھنؤ کے اجتماع کی داستان یہ ہے کہ اس عارضی شہر میں انتظام ایسا تھا کہ تیس ہزار آدمی پندرہ منٹ میں وضو کر لیتے۔ اس غیر معمولی انتظام پر آخر کچھ سرمایہ خرچ ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ شاہانہ اخراجات کہاں سے پورے ہوتے ہیں؟ سرمایہ کون دیتا ہے اور اگر مادی اور انسانی ذرائع ہیں تو ان کی یہ کامل رازداری کیوں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کے اظہار سے مقدس دامنوں کی دھجیاں اڑ جاتی ہوں اور دینی جماعت کے اخلاص کی کیچلی اتر جاتی ہو۔ جماعت کا عام جواب یہ ہے کہ اللہ دیتا ہے، خدا کی عطا اور دین برحق لیکن اس کی عطا و دین کا سارا کوٹا

صرف جماعت کے حق میں ریزرو ہو کر کیسے رہ گیا؟ حضرت جی کی کرامت ہے لیکن یہ کرامتیں اور بزرگوں کے لیے ماننا تو شرک تھیں۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ مسلم دشمن فرقہ پرست طاقتیں جو ہر تھوڑے وقفہ کے بعد ہندوستان کے کسی نہ کسی گوشہ میں ایک عام فساد برپا کر کے لوٹ مار کے ذریعہ خارجی طور پر مسلمانوں کو معاشی حیثیت سے مفلوج کر رہی ہیں۔ وہی ان سادہ لوح بزرگوں کے ذریعہ اسلام میں ایک نئی رہبانیت داخل کر کے داخلی طور پر مسلمانوں کو معاشیات سے بے پروا کر رہی ہیں۔ کیوں کہ اس تعلیم کی حقیقی روح اللہ کے لیے دنیا ترک کرنے والے، اپنے وقت کو دین کے لیے فارغ کرنے، بال بچوں سے بے پروا ہو کر چلوں پر چلے چلالے کا اجتماعی پروگرام ہے جس کا نتیجہ خطرناک ہو سکتا ہے اور یہ خطرہ اور بڑھ جاتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو عام مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں ان بزرگوں کے لیے اجتماع میں کمر کسے ہوئے جھاڑو دیتے ہیں، خیمے لگاتے ہیں اور کھانا کھلاتے ہیں۔ یہ اور اس قسم کے مختلف سوالات ہیں جن کا جواب اس جماعت کے لٹریچر میں ایک پراسرار اور مقدس خاموشی کے سوا کچھ نہیں۔

شیر بیشۂ اہل سنت کی تحریک کا مبصرانہ جائزہ

کہتے ہیں کہ شیر بیشۂ اہل سنت حضرت مولانا حشمت علی خاں صاحب لکھنوی علیہ الرحمہ ۸؍محرم ۸۰ھ کو دن میں دس بجے رحلت فرما گئے، ان کے ساتھ ایک قرن ختم ہو گیا، تاریخ کا ایک دوران کے آنکھ بند کرتے ہی تمام ہو گیا اور ایک ہنگامہ پرور عالم ان کے ساتھ ہی ابدی نیند سو گیا۔

محبت رسول کی کتنی محفلیں سونی ہو گئیں، معاندین رسالت سے مجادلے اور مناظرے کی کتنی بساطیں سرد پڑ گئیں، اور دنیا ایک ملت مرحومہ کی پاسبانی کرنے والے ایک چوکس نگہ باں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی۔ آہ ایک متبحر عالم نہ رہا، کہ زباں داں مناظر نہ رہا، ایک زندہ دل صوفی نہ رہا، ایک شب زندہ دار عابد نہ رہا، ایک عندلیب زمزمہ سنج نہ رہا، ایک دھاڑنے والا شیر نیستاں نہ رہا، بلکہ سچ پوچھو تو وہ کیا گیا آثار سلف کا ایک اور تاج محل ڈھ گیا۔

جب تک وہ رہا اپنوں کی سرد مہری، غیروں کی ایذا رسانی، دوستوں کی مہربانی، اور دشمنوں کی عداوتوں کے طوفان میں مضبوط چٹان کی طرح جما رہا اور وقت کا کوئی دھارا اس کے پائے ثبات میں لغزش نہ لا سکا، وہ اللہ و رسول کے دشمنوں سے لڑتا رہا، ان کی دسیسہ کاریوں کے راز کو فاش کرتا رہا، اور عواقب و نتائج سے بے پرواہ کبھی بھی کفر و طغیان سے صلح نہ کر سکا، بجلیاں چمکتی رہیں، بادل گرجتے رہے، طوفان آنکھ دکھاتا رہا اور مصائب نے بار بار جھنجھوڑا لیکن اس کی زبان حق بیان شمع حقیقت کی لو کسی طرح نہ بجھی نہ تھرتھرائی اور

ہزار بار نتائج سے ہو کے بے پرواہ اسی کا نام لیا جس کا نام لینا تھا

وہ جس کو خلوص قلب کے ساتھ حق سمجھتا رہا وہی کہتا رہا، چاہے دوست خفا ہوں یا دشمن ناراض، اپنے ساتھ چھوڑ دیں یا غیر نیزے سنبھالیں، خویش و اقارب سرزنش کریں یا پرائے موت کا جام تیار کریں، اور عجب نہیں کہ اس کی اس ادا پر کل میدان محشر میں رحمت کو

جوش آجائے وہ پکار اٹھے۔

ع یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے

خدا سمجھے مخالف پریس نے اپنی پوری طاقت صرف کردی اور باوری دنیا میں ڈھول پیٹ دیا کہ طبقہ اہل سنت دجماعت فسادی اور مسلمانوں میں جنگ وجدال کی آگ بھڑکانے والا ہے، اور اپنے حلوے مانڈے کی خاطر جلب منفعت اور حصول زر کی خاطر اور ارادات ورہبری چمکانے کے لیے مسلمانوں کو ملنے نہیں دیتا اور ان میں کفر وفسق کی چنگاریوں سے آگ بھڑکا تا رہتا ہے۔ اور اس کے ثبوت میں انہیں مرحوم مولانا حشمت علی خاں صاحب کی ذات پر دعویٰ کی دلیل اور ہر جھوٹ کی شاہد بتائی جاتی ہے۔ اس پر وپگنڈے کے پیش نظر ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ تنہا ایک شخص جب حصول زر کی خاطر غیر منقسم ہند کے تقریبا دس کروڑ اور منقسم ہند کے تقریبا چھ کروڑ مسلمانوں کو لڑاتا رہا تو کم از کم نواب حیدر آباد اتنا مالدار ضرور ہو گیا ہوگا، آغا خاں یا ملا طاہر جتنا سرمایہ دار تو ضرور ہوگا۔ اگر حصول زر کا طریقہ یہ اتنا ہی کامیاب ہے تو ہر شہر میں اس کی کوٹھیاں ہوں گی اور ہر علاقہ میں اس کی عشرت گاہیں، لیکن یہ کتنی دردناک حقیقت ہے کہ جب ان کا وصال ہوا تو وہ اپنی معیشت سے تنگ تھے اور ان پر کافی قرض لدا تھا اور وہ اپنے بچوں کو تحریر کرتے ہیں۔ عزیزو! طویل علالت کے سبب سے بالکل تنگ ہو گیا ہوں اور آمدنی محدود سے محدود، تم لوگ کسی طرح گزر بسر کرو اور تعلیم حاصل کرو۔ جب کہ دوسری طرف کتنے شیخ الاسلاموں، امن کے علم بر داروں، اور ملت کے خیر خواہ حکیموں کی موت وحیات میں بغیر کسی مادی سبب کے روپیوں کی ریل پیل ہے اور سرمایوں کا انبار ہے جس کے سہارے عظیم کوٹھیوں اور طویل خانقاہوں کا جال پھیلا ہوا ہے، اور حضرت کے قدم جہاں پہنچ جاتے ہیں ایک نئی بلڈنگ جنم پالیتی ہے، نہ معلوم یہ کونسا خفیہ دست غیب ہے کہ یہ بدنام فسادی بے چارہ بقول معاندین زندگی بھر حصول زر کے لیے لوگوں کو لڑاتا رہا لیکن وفات پائی تو معلوم ہوا کہ ہاتھ خالی تھے اور یہ نیک نام امن پسند بغیر کسی کوشش کے ہی چھپر پھاڑ کر پا رہے ہیں۔

اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ الزام تراشیوں سے قطع نظر ان کی تحریک کا مبصرانہ جائزہ لیں۔ آیا واقعی ان کا پیغام غیر مفید اور باعث ضرر تھا، یا اسلامی تنظیم کا ایک ناگزیر عمل تنقید تھا جس کے بغیر کوئی جماعت زندہ نہیں رہ سکتی اور کوئی حق و باطل کے میل سے نہیں بچ سکتا۔ مولانا مرحوم اپنی ساری زندگی ان مشہور و معروف بتان محراب و منبر کے خلاف جدوجہد کرتے رہے جو تقدیس کے گنبد میں بیٹھ کر ایک طرف تو اسلام کی عزت، اس کے نا موس اور رسول اللہ کی حرمت سے کھیلتے رہے، ان کا قلم مذہبی عیاشیوں میں مبتلا اور دماغ فکری بے راہ رویوں سے داغ دار رہا۔ دوسری طرف بزعم خویش مذہبی سربراہی اور قیادت دین کے بھی دعوے دار تھے، اور بدقسمتی سے عوام و خواص کی ایک بڑی بھیڑ بھی ان کے گرد جمع ہوگئی تھی جو ان کا ہر مصرع اٹھاتی اور ہر شعر پر گرہ لگاتی۔

مولانا مرحوم نے اس پورے طائفے کے خلاف زندگی بھر دین و دیانت کی پوری ذمہ داری کے ساتھ ایک مقدس تحریک جاری رکھی، پوری شدت کے ساتھ یہ ظاہر کرتے رہے کہ دین میں نئی راہ نکال کر یہ لوگ خود دین سے نکل گئے، خدا اور سول کی بغاوت کر کے اسلام کے دائرے سے الگ ہو گئے، اس لیے مسلمان ان گمراہوں سے آگاہ رہیں، ان سے راہ ورسم نہ بڑھائیں، ان سے تعلقات مہر و محبت نہ قائم کریں، ان سے شادی بیاہ نہ کریں، ان کو اپنے سے الگ رکھیں اور اپنے کو ان سے دور رکھیں، کہیں اپنی وہ بیاری صحت مند مسلمانوں میں نہ پھیلا دیں، کہیں یہ لوگ اپنی گمراہی کے جراثیم صحیح العقیدہ مسلمانوں میں بھی داخل نہ کر دیں۔ پس یہاں دو اہم اور بنیادی سوال ہیں جن سے ساری صورت حال واضح ہو جائے گی۔

(۱) تکفیر اور اس کے متعلقہ احکام کی اسلام میں کوئی گنجائش ہے یا نہیں؟

(۲) اگر تکفیر اسلام میں ایک ثابت شدہ حقیقت ہے تو جن لوگوں کے خلاف یہ حکم لگایا گیا واقعۃً وہ ایسے تھے یا نہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی حبیبہ الکریم

علم تفسیر اور کتب تفاسیر

امابعد قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام، اسلام کی بنیادی کتاب، عقائد احکام کا اجمالی اور تفصیلی بیان۔ عبرت وبصیرت ورہنمائی کا خزانہ، تاریخ وحقائق، دستاویزی وزنبیلہ، زبان وبیان کا معجزہ، شعر نہیں مگر روح کی بالیدگی اور انسانی چاپ کی لذتوں کا نغمہ ابدی۔ نحو وصرف، فصاحت وبلاغت، معانی وبیان۔ کس کس چیز کا نام لیا جائے، بیان کی طاقت عاجز اور زبان خاموش، متکلم ساکت اور روشنائی خشک

﴿لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾

[الکهف:۱۰۹]

تیرے کلام کی رعنائیاں بیان نہ ہوئیں ☆ ہزار کام لیا ہم نے خوش بیانی سے

مگر انسان نے اپنی طاقت بھر کوشش کی۔

(۱) اہل تحریر نے قرآنی الفاظ کو صفحات پر نقش کرنے کے لیے الگ اسلوب بنائے۔ اور قرآن عظیم کو مختلف طرز انداز سے تحریر کیا، جس کی تفصیلات سے اس موضوع سے متعلق کتابیں مزین ہیں۔ اور الفاظ قرآنی میں کچھ الفاظ کو دیگر تحریر سے ممتاز لکھا جاتا ہے جس کے لیے خاص فن رسم قرآن وجود میں آیا۔

(۲) پڑھنے والوں نے الفاظ قرآن کو زبان سے ادا کرنے کے لیے اصول بنائے جن کو فن تجوید وقراءت کہا جاتا ہے۔ اور حروف کی ادائیگی کے لیے مختلف نفیس تراز اور مدوزجر کے لیے لحن اور لہجے وجود میں آئے۔ سرکار رسالت مآب ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: اقرأ القرآن بلحون العرب۔ اور فرمایا: زینوا القرآن باصواتکم.

(۳) معانی وبیان، فصاحت وبلاغت کے بیان کے لیے اہل زبان نے اعجاز القرآن کے موضوع پر بہت سی کتابیں تحریر فرمائیں۔ اور انھیں یہ اقرار کرنا پڑا کہ زبان وبیان کا جو اسلوب قرآن میں ہے وہ عرب انشا پردازوں سے بالکل الگ تھلگ ہے جسے سن کر انسان سر دھن سکتا ہے مگر اس کی پیروی یا نقل ناممکن ہے۔

(۴) قرآن کے مفاہیم اور مدلولات، اس کے اسرار ورموز کی تفصیل اور تعبیر یہ علم تفسیر کا بنیادی مقصد ہے۔ اور جیسا کہ ہم نے اوپر تحریر کیا کہ قرآن میں گذشتہ فرقوں کی تاریخ اور ان کے گزرے ہوئے حالات، عقائد واعمال وغیرہ متعدد بلکہ کثیر امور کا بیان ہے، اس لیے علماے تفسیر نے اپنے اپنے دور کے موافق کسی ایک موضوع کی آیات کی تفسیر کی جیسے تفسیرات احمدیہ، تفسیر قرطبی، تفسیر کبیر الاحکام۔ کسی نے تاریخ وروایات کی طرف اپنا رخ زیادہ رکھا جیسے تفسیر خازن، تفسیر ابوسعود وغیرہ، کسی نے محض ترجمہ پر زور دیا۔ کسی نے تاویل کو بڑی وضاحت سے بیان کیا جیسے تفسیر بیضاوی۔

قرآن عظیم اصل میں تو دین وشریعت کے عقائد، احکام کی تفصیل رشد وہدایت کا ابدی پیغام ہے۔ مگر ضمناً اور طبعاً بے شمار علوم وفنون کے مسائل اس انداز میں ہوتے ہیں جس کو ایک مصری مصنف نے، اپنی کتاب القرآن ینبوع العلم والعرفان۔ میں بیان کیا ہے خود قرآن عظیم کا ارشاد ہے: ﴿ونزلنا علیک الکتاب تبیانالکل شئ﴾ ہم نے تم پر کتاب اتاری جس میں ہر شے کا بیان ہے۔ جس کی وضاحت امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ان الفاظ میں کی ہے۔ جمیع العلم في القرآن لکن. تقاصر عنه افهام الرجال.

تفسیر جو مضامین قرآن کی تفصیل وتوضیح کا علم ہے اس کے بارے میں علامہ ابن خیاط نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''کشف الظنون'' میں علم تفسیر کے عنوان سے متاخرین علماے تفسیر کا حال لکھا:

کچھ مصنفین نے تو اپنی تفسیر کو اپنے پسندیدہ علم وفن سے بے تحاشا بھر دیا، ایسا معلوم

ہونا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اسی علم کے مسائل کے بیان میں نازل کی گئی۔ حالاں کہ قرآن میں تو ہر چیز کا بیان ہے۔ نحوی مصنف کا خیال یہ ہے کہ اس کتاب کا نزول شریف مسائل نحو اور بیان کے لیے ہے، تاریخ کے علم کا ماہر سلف سے مروی ہر روایت کو تفسیر میں پھیر دیتا ہے، روایت چاہے صحیح ہو یا غلط۔ اور ہر مفسر قصہ کے بیان، مسائل اور طرفین کی دلیل کے ساتھ تفسیریں بھر دیتا ہے، حکیم اور فلسفی کو قرآن کی تفسیر میں حکما اور فلاسفہ کے اقوال اور ان کی ردو قدح، ترجیح و تنقید کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ اور مبتدع قرآن کی تمام آیتوں کو توڑ مروڑ کے اپنے عقائد فاسدہ اور افکار باطلہ کی تائید اور تقویہ میں صرف کرتا ہے۔

جب کہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ نظم قرآن کے مدلولات کو قواعد عربیہ، قوانین ادبیہ اور قواعد شرعیہ اور احادیث کریمہ کی روشنی میں حسن اعتدال اور دیانت داری کے ساتھ ظاہر کیا جائے، اس معیار کو نظر رکھ کر علماے دین نے تفسیر کی تین کتابیں درس نظامی میں شامل کیں، مختصر ترین تفسیر جلالین۔ متوسط تفسیر مدارک التنزیل۔ اور بسیط تفسیر بیضاوی

جلالین تفسیر سے زیادہ ترجمہ اور شافعی فقہ کی تائید ہے۔ بیضاوی اپنے بسیط ہونے کی وجہ سے پوری پڑھائی مشکل۔ مدارک شریف ایک متوسط تفسیر ہے۔ صاحب کشف الظنون فرماتے ہیں: مدارک التنزیل وحقائق التاویل علم تفسیر میں عبداللہ بن احمد بن محمد والنسفی متوفی ۷۰۱ھ کی متوسط کتاب ہے جس میں مندرجہ ذیل خوبیاں ہیں:

(۱) قرآن کی عبارتوں کی نحوی ترکیب۔

(۲) علم بدیع کے بارے میں اور اشارات کی باریک بینیوں کی توضیح۔

(۳) اہل سنت و جماعت کے اقوال سے مزین۔

(۴) گمراہوں اور مبتدعین کی اباطیل سے خالی۔

(۵) نہ تھکا دینے والی طوالت نہ فہم مراد میں خلل ڈالنے والا اختصار۔

(۶) کشاف میں زمخشری نے اعتزال کے لیے جو خفیہ کاری کی تھی اس کو چھان کر نکالنا۔

(۷) قرأت سبعہ کی طرف اشارات۔

ان تمام خوبیوں کو مساوات کے ساتھ بیان کرنا امام نسفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا بہت بڑا کمال ہے، لیکن موجودہ دور میں بہتوں کی پستی کی وجہ سے ان تمام خوبیوں کو ہضم کرنا طالب علموں کے لیے بڑا مشکل ہے۔اور مدارک شریف کی شرح یا حاشیہ بھی نہیں جس سے یہ مشکل آسان ہو۔ایک کتاب الاکلیل شائع ہوئی تھی لیکن وہ ناکافی تھی،شاید اسی لیے اب نایاب ہوگئی۔

ہمارے رفیق حضرت مولانا عبداللہ خاں صاحب عزیزی گونڈوی علماے مدرسین اہل سنت میں گراں قدر اعلیٰ مقام پر فائض تھے،اللہ تعالیٰ نے انھیں علم وعمل کی دولت سے مالا مال فرمایا،جب وہ اشرفیہ میں تھے تو مدارک التنزیل بڑے ذوق سے پڑھاتے تو ان کی درس گاہ میں مدارک پڑھاتے وقت وعظ کی محفلوں کی طرح نعرے لگتے تھے۔

میں درس وتدریس کے بارے میں اکثر سوچتا رہتا ہوں،عرصہ ہوا ان سے گزارش کی تھی کہ اس مشکل مرحلہ کو آسان کردیں۔مدارک شریف کی ایک اچھی شرح لکھ دیں،سال بسال کے بعد میری یہ آرزو پوری ہوتی نظر آئی اور حضرت مولانا نے جلد ثالث کی شرح سے اپنے کام کی ابتدا کی،اس وقت بھی درس نظامی اور عالیہ دونوں کورس میں وہ داخل نصاب ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مولانا کی یہ کاوش پایہ تکمیل کو پہونچے کہ اس سب سے پڑھنے بلکہ پڑھانے والوں کا بھلا ہوگا۔ سبحانک لاعلم لنا إلا ماعلمتنا انک انت العلیم الحکیم .

علم تاریخ کے بارے میں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

....

علم ''تاریخ'' اگر اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس کا سارا مواد خیر وشر کے دائرے میں منقسم ہے، اور اس کی تدوین اور تحریر، اور تعلیم وتعلم کے بنیادی فائدے بھی دو ہی ہیں، جن کو قرآن عظیم کی مختلف روایتوں میں بیان کیا گیا ہے۔

(۱) ﴿فَتِلْکَ بُیُوتُهُمْ خَاوِیَةً بِمَا ظَلَمُوْا، إِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَاتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ﴾ [النمل: ۵۲]

تو یہ ان کے گھر ڈھے پڑے ہیں بدلا ان کے ظلم کا۔ بے شک ان میں نشانی (عبرت) ہے جاننے والوں کے لیے۔

(۲) ﴿وَذَکِّرْهُمْ بِأَیَّامِ اللّٰهِ، إِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ﴾ [ابراھیم: ۵]

اے حبیب آپ انھیں ایام اللہ کی یاد دلایئے ان میں نشانیاں (نصیحت ورحمت) ہیں، شکر اور صبر کرنے والوں کے لیے۔

علامہ طاش کبریٰ زادہ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''مفتاح السعادۃ'' جلد اول ص ۲۳۱ر میں ''علم تاریخ'' کی توضیح میں ان دونوں فائدوں کو نہایت ایجاز وبلاغت کے ساتھ بیان کیا۔

والغرض منه الوقوف على أحوال الماضية. وفائدته العبرة بتلك الأحوال والنصح بها وحصول ملكة التجارب بالوقوف على تقلب

الزمان یتحرز عن المضار ویستجلب نظائرھا من المنافع .

علم تاریخ کی غرض گذشتہ حالات پر اطلاع ہے جس کا فائدہ ان حادثات سے عبرت حاصل کرنا ہے اور ان سے نصیحت فراہم کرنا ہے، اور انقلابات زمانہ سے تجربہ کاری کی مہارت کا حصول ہے۔ تاکہ نقصان دہ امور سے بچ کر ان کی ہم پلہ بھلائیوں سے فائدہ حاصل کیا جائے۔

پس علم تاریخ کے بنیادی فوائد یہی دو امر ہوئے۔ کہ معذبین پر نازل ہونے والے حوادث اور مہلکات سے عبرت حاصل کی جائے اور ایسے اسباب وعوامل سے پرہیز کیا جائے جن کا انجام ہلاکت و بربادی ہو۔ اور انعام یافتہ اقوام کے تذکرہ سے ایسے اسباب ملل کی تلاش اور ان سے نصیحت وہدایت فراہم کی جائے جن کا انجام دنیاوآخرت کی بھلائی ہو۔

حضورﷺ کے احوال وکوائف آپ کے اقوال وافعال اور آپ کی بارگاہ سے سند قبول پائے ہوئے دوسروں کے اقوال وافعال جن کو اصطلاحی زبان میں حدیث کہا جاتا ہے۔ عالم انسانیت کی اتنی عظیم وجلیل ''تاریخ'' ہے کہ ساری کائنات کی خیر وخوبی، سود وبہبود اور صلاح وفلاح اسی کے دامن رحمت سے لپٹی ہوئی ہے۔

اس عظیم تاریخی سرمایہ کی حفاظت وصیانت اور آئندہ نسلوں تک اس کی نشرواشاعت، تدریس وابلاغ کی ذمہ داری حضور سید عالمﷺ نے اپنی امت اجابت کے سر ڈالی۔

چناں چہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر جب آپ کے ارد گرد ایک لاکھ سے زائد انسانوں کا مجمع تھا۔ آپ نے حقوق انسانی کے بنیادی منشور کی دفعات کا اعلان فرما کر ارشاد کیا۔

فلیبلغ الشاھد الغائب. (بخاری شریف جلد اول ص ۲۱)

جو لوگ یہاں موجود ہیں ان تک پہونچادیں جو نہ آسکے، اسی موقع پر آپ نے یہ

بھی فرمایا:

نضر الله عبدا سمع مقالتی فدعاه ثم اداها الی من لم یسمعها.

(بخاری شریف)

اللہ تعالیٰ اس شخص کو تروتازہ رکھے جس نے میرا پیغام سنا تو اس کو یاد رکھا۔ پھر ان تک پہونچایا جنھوں نے نہ سنا۔

کبھی آپ نے اس طرح تاکید فرمائی۔

بلغوا عنی ولو آیۃً. (بخاری جلد اول)

مجھ سے لوگوں میں پھیلاؤ خواہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو۔

شمع رسالت کے پروانوں نے عاشقانہ وارفتگی کے ساتھ آپ کے فرمان پر عمل کیا اور

(۱) عہد رسالت میں ہی الفاظ حدیث قید تحریر میں لائے گئے۔

(۲) لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ انھوں نے اپنی خداداد قوت حافظہ کو اس کار خیر میں استعمال کیا۔

(۳) فتوحات اسلامی کی وسعت کے ساتھ ساتھ حاملان حدیث صحابہ کا مقدس گروہ بھی حدود اسلام کے گوشہ میں پھیل گیا تھا۔ اور بقول علی ابن ابوزرعہ

توفی النبی ﷺ ومن راٰه وسمع عنه زیادة علی مآته الف انسان من رجل وامراة کلهم قدر وواعنه سماعا وروية.

ایک لاکھ سے زائد مردوں اور عورتوں نے حضور ﷺ کو دیکھا اور سنا اور ان سے دیکھنے اور سننے کی روایت کی یعنی پورے عالم اسلام میں علم حدیث کو پھیلایا۔

(۴) پھر بکھرے ہوئے علما و محدثین سے ان کے عہد کے لوگوں میں روایتیں سننے اور ارشادات رسول ہزار ہا ہزار میل کا سفر کرنے والوں کا ایک سلسلہ ہے، حیرت ہوتی ہے کہ ایک حدیث کی تصدیق بلکہ ایک لفظ کی تحقیق کے لیے طالبان حدیث نے مدینہ سے مصر

کا سفر کیا۔ اور شام وعراق کے علما ومحدثین نے مکہ کی گلیوں کی خاک چھانی۔

(۵) اور بعد کے محدثین اور ائمہ نے راویوں کا کذب وصدق پرکھنے کے لیے اصول مرتب کیے۔ اور پانچ لاکھ اصحاب حدیث کے شخصی حالات کی تاریخ مرتب کی، جس میں نسب وخاندان، تاریخ پیدائش وموت، کہاں کہاں رہے، کس کس سے علم حدیث حاصل کیا، کیا کھایا، کیا کمایا، کاذب وفاسق تو نہ تھے، حافظہ کمزور تو نہیں تھا، ضبط وعدالت کی حالت کیا تھی۔ ان کی ادائیں قابل قبول ہیں یا نہیں۔ جسے دیکھ کر دنیا والے انگشت بدنداں ہیں۔

ڈاکٹر اشپرنگر نے لکھا:

کوئی قوم دنیا میں نہ ایسی گذری نہ موجود ہے، جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا سا فن ایجاد کیا، جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

اور پروفیسر، سورتھ اسمتھ اقرار کرتا ہے:

”کوئی شخص یہاں (سیرت رسول) کے متعلق نہ خود دھوکہ کھا سکتا ہے نہ دوسرے کو دھوکہ دے سکتا ہے۔ کہ یہاں دن کی روشنی موجود ہے“۔ یعنی سیرت رسول کی چھوٹی سے چھوٹی بات تاریخ وسیر میں مذکور ہے، اور مضبوط شہادتوں سے ثابت ہے۔

یہ تو ہماری قدیم دینی وعلمی تاریخ کا حال تھا۔ مگر آج ہم جن حالات سے گذر رہے ہیں ان کا حال کچھ اس طرح بیان کیا جائے گا۔ کہ

تعلیم گاہوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ مسلسل جاری ہے۔ ادارہ کے کیمپس میں بے حد فراخی اور وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ عمارتیں نہایت طویل وعریض، اور پرفضا وشاندار ہوگئی ہیں۔ زیب وزینت اور آرائش، فنشنگ قابل دید ہے۔ طلبا سے دانش کدے آباد ومعمور ہیں۔ اور تاجروں کی توجہ سے ہمارے بزرگوں کے علمی ذخائر کے مخطوطے شائع اور دستیاب ہیں۔

سال بسال ہزاروں ہزار کی تعداد میں علما، فضلا، مفتی ومفکر، اساتذہ اور دانش ور پیدا ہو رہے ہیں۔

لیکن ان تمام شان وشکوہ، اہتمام وطم طراق کے بعد ان اداروں سے پیدا شدہ فضلا کے انبوہ عظیم میں چند استثنائی شخصیتوں کو چھوڑ کر تعلیمی اہداف کے ہر مورچہ پر باصلاحیت افراد کا قحط الرجال ہے۔ سناٹا ہے اور بھیانک سناٹا۔

اور اب دنیاوی تعلیم حاصل کرنے والوں کی طرح، دینی تعلیم والوں کا مطمح نظر بھی یہی ہو گیا ہے کہ جو علم ہماری روزی کا کفیل نہ بن سکے اس علم کی ہم کو ضرورت نہیں۔ اللہ اللہ

متاع دین ودانش لٹ گئی اللہ والوں کی ☆ یہ کس کافر ادا کا غمزہ خوں ریز ہے ساقی

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے سبزہ زاروں سے ☆ وہی آب وگل ویراں وہی طبریز ہے ساقی

بلکہ حدیث نبوی کے پاک اور سچے الفاظ میں:

إن الله لايقبض العلم انتزاعاينتزعه من العباد. لكن يقبض العلم بقبض العلماء، حتى اذالم يبق عالم اتخذالناس رؤوسا جهالا فسئلوا فافتوا بغير علم فضلوا وأضلوا. (بخاری شریف کتاب العلم)

قریب قیامت علم اٹھالیا جائے گا مگر اس طرح نہیں کہ لوگوں کے سینوں سے سلب کرلیا جائے۔ بلکہ اس طرح کے آہستہ آہستہ علما ختم ہو جائیں گے۔ اور جب علمائے ربانی نہ رہیں گے تو ناچار لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے، اور ان سے سوال کریں گے، تو وہ فتویٰ دیں گے۔ خود گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو گمراہ کریں گے۔

اس دردناک تاریخ کے درمیان اوپر ہم نے استثنائی شخصیتوں کا ذکر کیا تھا۔ انھیں میں سے ایک ہمارے رفیق حضرت علامہ مولانا محمد عاصم صاحب ہیں۔ جو اس برباد شدہ قافلہ علم میں پرشور حدی خوانی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

آپ نے عام ذوق کے خلاف اپنی ذاتی کاوش سے اردو تراجم حدیث کے موضوع پر اپنا ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا اور ڈگری حاصل کی۔

اس کے بعد سے آج تک مسلسل تاریخ کی مختلف النوع راہوں کی خاک چھان رہے ہیں۔

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

(وصال شیر بیشۂ اہل سنت)

کہتے ہیں کہ شیر بیشۂ اہل سنت حضرت علامہ حشمت علی خان لکھنوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ۸ محرم الحرام ۱۳۸۰ کو دن میں دس بجے رحلت فرما گئے۔ ان کے ساتھ ایک قرن ختم ہو گیا، تاریخ کا ایک دوران کے آنکھ بند کرتے ہی تمام ہو گیا اور ایک ہنگامہ پرور عالم ان کے ساتھ ہی ابدی نیند سو گیا۔ محبت رسول کی کتنی محفلیں سونی ہو گئیں، معاندین رسالت سے مجادلے اور مناظرے کی کتنی بساطیں سرد پڑ گئیں، اور دنیائے ملت مرحومہ کی پاسبانی کرنے والے ایک چوکس دیدہ ور سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی۔

آہ! ایک متبحر عالم نہیں رہا، ایک شب زندہ دار عابد نہیں رہا، ایک زبان داں مناظر نہ رہا، ایک زندہ دل صوفی نہ رہا، ایک عندلیب زمزمہ سنج نہ رہا، ایک دہاڑنے والا شیر نیستاں نہ رہا۔ بلکہ سچ پوچھو تو وہ کیا گیا آثار سلف کا ایک اور تاج محل ڈھہ گیا۔ جب تک وہ رہا اپنوں کی سرد مہری، غیروں کی ایذا رسانی، دوستوں کی مہربانی اور دشمنوں کی عداوتوں کے طوفان میں مضبوط چٹان کی طرح جما رہا۔ وقت کا کوئی دھارا اس کے پائے ثبات میں لغزش نہ لا سکا۔ وہ اللہ ورسول۔ جل جلالہ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ کے دشمنوں سے لڑتا رہا، ان کی دسیسہ کاریوں کا راز فاش کرتا رہا اور عواقب ونتائج سے بے پرواہ کبھی کفر وطغیان سے صلح نہ کر سکا۔ بجلیاں چمکتی رہیں، بادل گرجتے رہے، طوفان آنکھ دکھاتا رہا اور مصائب وآلام نے بار بار جھنجھوڑا۔ لیکن اس کی زبان حق بیان سے شمع حقیقت کی لو کسی طرح نہ بجھی نہ تھرتھرائی۔

ہزار بار نتائج سے ہو کے بے پرواہ
اسی کا نام لیا جس کا نام لیتا تھا

وہ جس کو خلوص قلب کے ساتھ حق سمجھتا رہا وہی کہتا رہا، چاہے دوست خفا ہوں یا دشمن ناراض، اپنے ساتھ چھوڑ دیں یا غیر نیزے سنبھالیں، خویش واقارب سرزنش کریں یا پرائے موت کا جام تیار کریں، اور عجب نہیں کہ اس کی اس ادا پر کل میدان محشر میں رحمت کو جوش آجائے اور پکار اٹھے

ع یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

خدا سمجھے مخالف پریس نے اپنی پوری طاقت صرف کر دی ہے، اور باہری دنیا میں ڈھول پیٹ دیا ہے کہ طبقہ اہل سنت و جماعت کا فسادی، مسلمانوں کی جماعت میں آگ بھڑ کانے والا، اپنے حلوے مانڈے کی خاطر جلب منفعت اور حصول زر کے لیے اپنی ارادت وپیری کی دوکان چمکانے کے لیے مسلمانوں کو ملنے نہیں دیتا، اور ان میں کفر وفسق کی چنگاریوں سے آگ بھڑکا تا رہتا ہے اور اس کے ثبوت میں انہیں حضرت علامہ حشمت علی خاں صاحب علیہ الرحمہ کی ذات پر دعویٰ کی دلیل اور ہر جھوٹ کی شاہد بتائی جاتی ہے۔ اس پروپیگنڈ کے پیش نظر ہم تو سمجھتے ہیں کہ جب تنہا ایک شخص حصول زر کی خاطر غیر منقسم ہند کے تقریباً دس کروڑ، منقسم ہند کے تقریباً چھ کروڑ مسلمانوں کو لڑاتا رہا تو کم از کم نواب حیدر آبا دجتنا مالدار ضرور ہو گیا ہوتا، آغا خاں یا ملا طاہر جتنا سرمایہ دار تو ضرور ہو گیا ہوتا۔ اگر حصول زر کا یہ طریقہ اتنا ہی کامیاب ہے تو ہر شہر میں اس کی کوٹھیاں ہوتیں اور ہر علاقہ میں اس کی عشرت گاہیں۔ لیکن یہ کتنی دردناک حقیقت ہے کہ جب ان کا وصال ہوا تو وہ اپنی معیشت سے تنگ تھے۔ وہ اپنے بچوں کو تحریر کرتے ہیں:

''عزیز! طویل علالت کے سبب بالکل تنگ ہو گیا ہوں اور آمدنی محدود سے محدود، تم لوگ کسی طرح گزر بسر کرو اور تعلیم حاصل کرو''۔

جب کہ دوسری طرف کتنے شیخ الاسلاموں، امن کے علمبرداروں اور ملت کے خیر خواہوں، حکیموں کی موت وحیات میں بغیر کسی مادی سبب کے روپیوں کی ریل پیل اور سرما یوں کا انبار ہے۔ جس کے سہارے عظیم کوٹھیوں اور طویل خانقاہوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ اور

حضرت کے قدم جہاں پہونچ جاتے ہیں ایک نئی بلڈنگ جنم پا لیتی ہے۔ نہ معلوم یہ کون سا خفیہ دست غیب ہے کہ یہ بدنام فسادی بے چارہ بقول معاندین زندگی بھر حصول زر کے لیے لوگوں کو لڑا تا رہا، لیکن وفات پائی تو معلوم ہوا کہ ہاتھ خالی ہے۔

اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ الزام تراشیوں سے قطع نظر ہم ان کی تحریک کا مبصرانہ جائزہ لیں۔ آیا واقعی ان کا پیغام غیر مفید اور باعث ضرر تھا یا اسلامی تنظیم کا ایک ناگزیر عمل تنقید ہے جس کے بغیر کوئی جماعت زندہ نہیں رہ سکتی، اور کوئی حق باطل کے میل سے نہیں بچ سکتا۔ مولانا علیہ الرحمہ اپنی ساری زندگی مشہور و معروف بتان محراب و منبر کے خلاف جدوجہد کرتے رہے، جو تقدیس کے گنبد میں بیٹھ کر ایک طرف تو اسلام کی عزت، اس کے ناموس رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حرمت سے کھیلتے ہیں، ان کا قلم مذہبی عیاشیوں میں مبتلا اور دماغ فکری بے راہ رویوں سے داغ دار رہا۔ دوسری طرف بزعم خویش مذہبی سربراہی اور قیادت دینی کے بھی دعوے دار تھے، اور بدقسمتی سے عوام وخواص کی ایک بھیڑ بھی ان کے اردگرد جمع ہو گئی تھی، جو ان کا ہر مصرع اٹھاتی اور ہر شعر پر گرہ لگاتی۔ مولانا علیہ الرحمہ نے اس پورے طائفہ کے خلاف دین و دیانت کی پوری ذمہ داری کے ساتھ ایک مقدس تحریک جاری رکھی اور پوری شدت کے ساتھ یہ ظاہر کرتے رہے کہ دین میں نئی راہ نکال کر لوگ خود دین سے نکل گئے ہیں۔ خدا اور رسول کی بغاوت کر کے اسلام کے دائرے سے الگ ہو گئے ہیں۔ اس لیے مسلمان ان گمراہوں سے آگاہ رہیں، ان سے رسم و راہ نہ بڑھائیں، ان سے تعلقات مہر و محبت نہ قائم کریں، ان سے شادی بیاہ نہ کریں، ان کو اپنے سے الگ رکھیں، کہیں وہ اپنی بیماری صحت مند مسلمانوں میں نہ پھیلا دیں، کہیں یہ لوگ گمراہی کے جراثیم صحیح العقیدہ مسلمانوں میں بھی نہ داخل کر دیں۔ (ماخوذ از فیض الرسول)

سرفروشان حق کے امیر

(تذکرہ مجاہد ملت)

حضور مجاہد ملت:

دنیا کی اس روز افزوں اور ترقی پذیر آبادی میں کروڑوں بلکہ اربوں انسان کے بعد کوئی ایک ایسا فرد کامل پیدا ہوتا ہے کہ انسانیت کو جس پر فخر ہوتا ہے اور زندگی جس پر ناز کرتی ہے۔

حضور مجاہد ملت حضرت مولانا الشاہ محمد حبیب الرحمٰن صاحب قبلہ قدس سرہ العزیز انہیں عدیم المثال مردان حق اور خاصان خدا میں سے تھے جو دست قدرت کا شاہکار ہوتے ہیں۔

ان کے قلب مبارک میں عشق شاہ مدینہ اور محبت میر بغداد کا الاؤ دہک رہا تھا۔ ان کا سینہ لاہوتی اسرار اور عرفان الٰہی کا مدینہ تھا۔ اور دماغ اسلامی فکر د آگہی کا انمول گہوارہ، ان کا چہرہ زندگی بھر شمع حق نما کی طرح ظلمتوں کے ہجوم میں مسکراتا رہا، اور ان کے پائے عزم وثبات سے باطل کا طوفان ٹکرا ٹکرا کر ہٹتا رہا، طاغوت کی کوئی طاقت نہ ان کی آواز دبا سکی نہ جادہ حق سے انھیں ہٹا سکی۔

صدائے حق کسی صورت سے دب نہیں سکتی
نہ دب سکیں گے خدا کی پکار ہیں ہم لوگ

بلاشبہ حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حق کی پکار تھے اور خدا کی آواز جو نہ دبنا جانتے تھے نہ لچکنا، افسوس موت کے ہاتھوں نے وہ آواز دبا دی، وہ صدائے حق خاموش

کردی۔ آہ وہ مرد حق آگاہ نہ رہا، وہ شیر نیستان الٰہی نہ رہا جس نے ظلم کی آندھیوں کا کلیجہ چیر ڈالا۔ شاید اب صدیوں بعد دنیا اس قسم کی آواز سن سکے؟

سرور از حجاز آید نہ آئد

وگر دانائے راز آید نہ آئد

مولانا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو پہلی بار میں نے آج سے لگ بھگ ۴۸ سال قبل دار العلوم اشرفیہ کے سالانہ جلسہ امتحان کے وقت دیکھا تھا، میں چوں کہ بالکل بچہ اور ابتدائی طالب علم تھا، اس لیے ان کے امتحان گاہ کا منظر نہ تو دیکھ سکا، سننے میں یہ ضرور آیا کہ پورے طلبہ میں ان کے علمی وقار اور فکری دبدبہ کا غلغلہ ہے خصوصا علوم آلیہ منطق وفلسفہ میں ان کے ید طولیٰ کا عام چرچا تھا، البتہ جلسہ میں انہیں جی بھر کر دیکھا اور آج ۴۸ سال کے بعد بھی مجھے کل کی طرح یاد ہے کہ مولانا اس وقت ناگپوری تہ بند اور کرتے میں ملبوس تھے جس کے اوپر صدری تھی، اور صدری کی اوپری جیب میں نہایت عمدہ اور قیمتی چھوٹی سے گھڑی جس میں چمڑے کا تسمہ بندھا ہوا تھا جسے تقریر کے دوران بار بار جیب سے نکال کر آپ وقت دیکھ لیا کرتے تھے۔ سر پر دو پلی ٹوپی اور ٹوپی کے نیچے بال، مجھے یہ چمڑے کی چین اور وہ بھی جیبی گھڑی میں نئی چیز معلوم ہوئی، میں نے پوچھا ایسا کیوں ہے، کسی نے بتایا یہ مولانا کا تقویٰ ہے، دھات کی چین لگانا منع ہے۔

داڑھی بالکل کالی تھی اور لب خوب ترشی ہوئی، لبوں کے کنارے مونچھوں کا گچھہ کچھ نمایاں تھا، سیاہ داڑھی میں چہرہ گلاب کے پھول کی طرح رخ وشاداب تھا، ہونٹ خاص طور سے تر وتازہ تھے اور دانت بالکل سفید، اعضا پر گوشت ضرور تھے لیکن ہاڑ گوڑ پتلے اور مجموعی طور سے جثہ دبلا معلوم ہوتا تھا۔

تقریر آپ کی گولہ بازار میں ہوئی، عنوان غالبا وہابیہ کی توہین رسالت تھی۔ کیا کہا؟ اس وقت میری اتنی سمجھ ہی نہ تھی کہ میں اس کو محفوظ رکھ سکوں لیکن غور کرتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ جوش بیان اور ہجوم مضامین میں ایک عظیم تصادم تھا کہ کون کس پر غالب آتا ہے،

اور اس کے وقت کے پورے ماحول سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے خلاف یہ کس مجرم نے ایسی گستاخی کی ہے جس سے پورے عالم میں تلاطم برپا ہے۔

مولانا گویا اس وقت ایک عالم ہی نہیں تھے پورا عالم بنے ہوئے تھے، بعد میں مدت تک آپ کے علم و فضل، حکمت و دانائی اور ریاست و امارت کا چرچا رہا اور ایک طرح ان کی ذات سے ہم کو یہ خود اعتمادی ملتی رہی کہ ہماری جماعت میں بھی اس پائے کے لوگ ہیں۔

آخری ملاقات دو سال قبل غالبا بحر ڈیہہ کے کسی جلسہ میں ہوئی جہاں حضرت کے مریدین بلکہ جاں نثاروں کی بھاری تعداد ہے، جلسہ میں شرکت کے علاوہ میری ان سے غرض یہ تھی کہ میں خود اپنے گھر میں حضرت سے ایک میلاد پڑھوانا چاہتا تھا، آپ نے وعدہ بھی فرمایا بعد میں مسلسل سفر کی وجہ سے آپ وقت نہ دے سکے، تو معذرت کا ایک خط بھی لکھا تھا۔

یہ وقت حضرت کی طرف مخلوق خدا کے رجوع عام کا تھا، جہاں پہونچ جاتے بھیڑ لگ جاتی، ضرورت مندوں کا ہجوم آگے پیچھے لگا رہتا، کوئی مرید ہونا چاہتا، کوئی تعویذ کا خواستگار ہوتا، کسی کو دعائے خیر کی حاجت ہوتی، تو کوئی برکت کے لیے اپنے گھر میں لے جانا چاہتا، غرض کہ شب و روز کے بیشتر حصہ میں آپ بے حد مصروف رہتے۔

اس کے باوجود حضرت نے میرے ساتھ بے حد عنایت فرمائی اور کٹک کے مناظرہ میں شریک نہ ہونے کی شکایت کی، میں کیا عرض کروں اس وقت بحر ڈیہہ میں آپ کے دم قدم کی کیا برکت تھی، اور کیسا کیف تھا اس کے بعد بھی میں بحر ڈیہہ آتا رہتا ہوں، مگر کیا عرض کروں۔

تیرے بغیر یہاں کا عجیب عالم ہے
بھرے ہیں جام و سبو بزم شوق برہم ہے

بیچ کے ۴۵، ۴۶ سال میں بار بار حضرت کا نیاز حاصل ہوا اور ملاقاتوں کا تأثر اب تک تازہ ہے۔ ایک یادگار ملاقات وہ بھی ہے جب ان کی زندگی کے حالات لکھنے کے لیے

میں ان کے وطن مالوف دعام نگر حاضر ہوا، اس وقت حضرت اعتکاف میں تھے، دن میں اشراق کے بعد تھوڑی دیر آرام کرتے پھر ضرورت مندوں کی حاجتیں رفع فرماتے، جس میں تعویذ گنڈے سے لے کر زمین داری کے رفع درگزر تک سارے معاملات ہوتے۔

اسی دوران حضرت نے ایک غیر مقلد کے سوال کے جواب بھی املا کرائے، ان کے الفاظ کے فوائد و مصالح کا ذکر فرماتے۔ انھیں اوقات میں سے تھوڑا وقت اپنے حالات کے لیے بھی مجھے دیا۔ رات کا بیشتر حصہ ذکر و فکر اور یاد الٰہی میں گزارتے، میں نے یہ نوٹ کیا کہ عشا کی سنت اور وتر کے درمیان روزانہ داڑھی میں کنگھا کرتے۔

کئی دن غسل بھی فرمایا، فرش مسجد پر ایک بڑا لگن رکھا گیا جیسے ہماری طرف گڑ پکانے کا کڑاہ ہوتا ہے، اس میں بیٹھ کر غسل فرماتے تا کہ غسالہ مسجد میں نہ گرے اور حالت اعتکاف میں آپ غسل کے لیے مسجد سے باہر بھی نہ ہوں۔

اس سفر میں آپ کی دو باتوں سے میں بے حد متاثر ہوا، ایک تو یہ کہ میری درخواست پر وہ بے اختیار رونے لگے، اور فرمایا کہ میں ایک بے حقیقت انسان میرے حالات لکھ کر کیا کرو گے، اور جب میں نے حد سے زیادہ اصرار کیا تو فرمایا میرے حالات میں یہ ضرور لکھ دینا کہ حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے در کا ایک کتا اور ادنیٰ غلام ہے اور کچھ نہیں۔ دوسری بات جو مجھے بے حد غیر معمولی نظر آئی وہ ان کے اہل وطن کا رجوع عام تھا۔

افطار کے وقت فرش کے اخیر کنارے پر ایک گوشہ میں ایک بڑی چٹائی دستر خوان کی طرح حضرت کے سامنے بچھا دی جاتی، خود حضرت کے مکان سے وافر مقدار میں کھانا اور افطار آتی، روزانہ دستر خوان پر آس پاس کے پچیسوں آدمی جن میں ۴۰، ۵۰ میل دور تک کے آدمی ہوتے، اپنی اپنی افطاری ساتھ میں لے کر آتے، حضرت ہی کے دستر خوان میں وہ سب بھی رکھا جاتا، سب ساتھ کھاتے اور کچھ تبرکاً دستر خوان سے واپس اپنے گھروں کو لے جاتے، میرے لیے یہ بات بے حد حیرت ناک تھی، حضرت کے ساتھ صرف افطار کی برکت حاصل کرنے کے لیے لوگ اتنی اتنی دور سے اس کثرت سے آتے ہیں، میں نے ہم

عصر بزرگوں کا دربار بھی دیکھا ہے، خود اپنے وطن میں حضور مجاہد ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا جو قبول عام اور رجوع خلق ملا تھا الا ماشاء اللہ کسی میں نہ پایا۔

ایک یادگار ملاقات بھمن گاؤں ضلع بستی کا مناظرہ بھی ہے، وہاں حضور مجاہد ملت قدس سرہ کی غیر معمولی محنت، مسلسل کام اور بے آرام، جدوجہد نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ وہ مناظرہ عجیب وغریب قسم کا کھانا، مناظرہ تحریری تھا اور لگ بھگ ۲۴ر گھنٹہ مسلسل چلتا رہتا تھا، نماز کا وقت ہوتا تو وہیں نماز پڑھ لی جاتی، کھانے کے لیے تھوڑا وقفہ ملتا۔ کام کی آسانی کے لیے رات ودن کے علیحدہ علیحدہ گروپ بنائے گئے تھے، اور ہر گروپ پابندی سے اپنی اپنی ڈیوٹی ادا کرتا۔ مقابل کے آئے ہوئے سوال کو پڑھنا، اس کے جواب تیار کرنا، مزید سوال کی ضرورت ہوتو اسے ترتیب دینا، اور سب کی نقلیں تیار کرا کے مخالف کو بھیجنا، یہ سارے کام اسٹیج پر ہی ہوتے تھے، مناظرے میں بیشتر وقت بارش ہوتی رہی۔ اس لیے سامعین جو بڑی تعداد میں دور دور سے جمع ہو گئے تھے ادھر ادھر چھپے رہتے، مناظروں کی ٹیم ہی دونوں طرف اسٹیج پر چھتری لگا کر جمع رہتے۔ بارش کی وجہ سے تخت پر فرش نہیں بچھ سکتا تھا، رات میں گیس کی روشنی کا اضافہ ہو جاتا، اس سارے منظر میں جو چیز مجھے حیرت میں ڈالنے والی تھی وہ حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی محنت شاقہ تھی۔ رات ڈھلے جب بیشتر مناظرین بھی جھونکے لینے لگے آپ جوانوں کے جوش کے ساتھ بارش کی چھینٹیں برداشت کرتے، اگر کوئی آپ کو بچانے کے لیے چھتری درست کرتا فرماتے رہنے دو، رہنے دو کام کرو، کام کرو، پوری تندہی سے مخالف کی تحریریں سننا، پھر سب کو ہدایت دینا، جوابات بتانا، جوابوں کی نشاندہی کرنا، تحریر مکمل ہو تو سن کر بھیجنے کی اجازت دینا، یہ تو اس ٹیم کے ساتھ آپ کا طرز عمل تھا، جس کے سربراہ آپ تھے۔

دوسری ٹیم کی بھی عملی سربراہی آپ کے ہی سر تھی، ہر چھوٹے بڑے مسئلہ کے لیے وہ لوگ بھی آپ سے ضرور استصواب کرتے۔ الغرض تین چار یوم کی لگ بھگ ۲۴ر گھنٹے کی مسلسل محنت اور آپ کے چہرہ پر تھکن کے آثار نہیں، میں ان کے بڑھاپے کو دیکھتا اور ان کی

اس محنت کو اور عش عش کرتا۔ اس موقع پر مولانا مشتاق احمد صاحب نظامی کی ایک غیر معمولی سعادت مندی بھی نا قابل فراموش ہے، تیسرے دن جب مخالفین کا کس بل نکل گیا اور وہ میدان مناظرہ سے اٹھ گئے تو میں نے حضرت مجاہد ملت سے رخصت چاہی کہ اب کام ختم ہے اور میرے لیے دار العلوم کی مصروفیت ہے۔ نظامی صاحب نے بھی رخصت چاہی۔ کام واقعی تمام تھا، اس لیے ہم دونوں کو ہی رخصت مل گئی، ہم لوگ تین میل پیدل چل کر اس طرح آئے کہ پورے راستے میں گھٹنوں گھٹنوں پانی بھرا تھا، اعضا شل اور جسم تھک کہ چور تھا، مخالفین کو معلوم ہوا کہ علامہ نظامی تو چلے گئے بس پھر کیا تھا شور مچا دیا کہ سنی مناظر بھاگ گئے، لوگ حضرت کے پاس آئے اور آپ نے فوراً واپسی کے لیے خط لکھا، ادھر ہم لوگ تھکے ماندے موٹر پر بیٹھے ادھر حضرت کا خط نظامی صاحب کو ملا، میں ان کی سعادت مندی کو داد دونگا کہ یہ معلوم ہوتے ہوئے بھی کہ اب عملاً ہماری وہاں ضرورت نہیں۔ صرف حضرت کے حکم پر الٹے قدم اسی طرح تین میل پیدل واپس لوٹے جیسے آئے تھے جب کہ میں تعمیل ارشاد نہ کر سکا، جو لوگ نظامی صاحب کی شخصیت سے واقف ہیں وہ اس اطاعت شعاری کو خوب سمجھ سکتے ہیں۔

ایک یادگار ملاقات میرے گھر پر ہوئی (حضرت کا یہ کرم تھا کہ مبارک پور آتے تو میرے گھر قیام فرماتے) جاڑے کا موسم تھا، صبح سویرے وضو کے لیے میں نے پانی گرم کرا دیا، حضرت نے گرم پانی استعمال کرنے سے انکار فرما دیا، اور مسجد کے برف جیسے ٹھنڈے پانی سے وضو فرمایا۔ میں نے بہت اصرار کیا تو کہنے لگے، گرم پانی سے وضو کرنے سے عادت بگڑے گی۔ جب گرم پانی ہوگا تو ٹھنڈے پانی سے وضو کرنے میں زحمت وستی لاحق ہوگی۔ اس لیے میں اس سے پرہیز کرتا ہوں۔ اس توجیہ سے میرا جی مطمئن تو نہ ہوا لیکن میں خاموش ہو گیا، اب سوچتا ہوں کہ چاہے یہی وجہ رہی ہو چاہے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیث مبارک تھی: منع النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الوضو ممامست النار۔

بہر حال یہ غایت درجہ کا اتقا اور بڑا مجاہدۂ نفس ہے۔ اس وقت میرے سامنے کچھ اور بزرگوں کی تصویریں بھی آئیں اور میرا دل حضور مجاہد ملت کی عظمت سے معمور ہو گیا۔

ایک دفعہ حضرت گھر تشریف لائے تو خیال ظاہر فرمایا کہ میں سویرے ہی چلا جاؤں گا، میں نے سویرے ہی ناشتہ تیار کرا دیا اور چاہا کہ حضرت نماز کے بعد تناول فرمالیں۔ ہزار کوشش کے بعد بھی حضرت نے اس وقت سختی سے منع فرمایا اور فرمایا ناشتہ دان میں رکھ دو ضرورت ہو گی تو میں کھالوں گا۔ اس واقعہ پر میں نے بارہا قیاس آرائی کی، حضرت نے شاید روزے کی نیت کر لی تھی، اس لیے نہیں کھایا۔ یا اشراق سے پہلے کھانے کا معمول نہیں تھا اس لیے نہیں؟ جو کچھ بھی ہو۔ یہ ایک عظیم کیریکٹر کی علامت تھی کہ پہلی صورت میں سحری کے لیے خود تکلیف اٹھالی اور مجھ سے نہیں کہا جب کہ میں اس کو سعادت سمجھتا اور دوسری صورت میں آپ کے ضبط اوقات کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

ایک دفعہ حضرت کے ساتھ مبارک پور سے بنارس جانا ہوا۔ اعظم گڑھ بس اسٹیشن پر ایک سادھو نے کسی مندر کے لیے چندہ کی اپیل کی۔ ہمارے سامنے بھی ایسے مناظر آتے رہتے ہیں۔ چندہ نہ دیا لیکن بولتے یا کہتے بھی نہیں۔ مگر مجاہد ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کے جواب میں فرمایا چوں کہ ہمارے یہاں مورتی جائز نہیں اس لیے میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ اظہار حق کی یہ جرأت حضرت والا اپنے ساتھ لے گئے۔

کلکتہ میں آکر ایک پریس خریدا، جام نور نام کا ایک پرچہ بھی شائع ہونے لگا، پھر وہ بند ہو گیا، آپ نے وہ پریس۔ اپنے ایک ملاقاتی فرزند کو دیا کہ وہ اسے تجارتی اصول پر چلائے۔ انہوں نے اسے اپنی بے اعتدالیوں کی نذر کرنا شروع کیا، ایک بار آپ ان کے صاحبزادے کے یہاں تقاضے میں جا رہے تھے، ہم بھی ساتھ ہو لیے، اس وقت حضرت مجاہد ملت کے صبر وضبط اور تحمل کو دیکھ کر ہمیں سخت حیرت ہوئی۔ آپ کی حیثیت کا کوئی آدمی تقریباً آدھ گھنٹہ باہر دروازہ پر کھڑا رہے، اور جب صاحب معاملہ برآمد ہوئے تو آپ بیٹھنے کے لیے کیا کہتے ان کے طرز کلام سے یہ معلوم ہوتا کہ وہ خود صاحب حق ہیں اور حضرت

صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مجرم اور مسئول، اس سختی سے کلام کیا کہ سننے والوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا مگر حضور مجاہد ملت صبر وتحمل، نرم گفتاری اور خوش اخلاقی کی تصویر بنے رہے، میں نے دل میں سوچا یہ بھی تصوف کا کوئی مقام ہوگا، جس کی عملی مشق کے لیے حضرت نے اس تند خو بد اخلاق آدمی کو تاکا ہے۔

بھیلواڑہ صوبہ راجستھان کے ایک جلسہ میں حضرت کی زیارت ہوئی، مغرب کے بعد وظیفہ میں بیٹھے اور عشا پڑھ کر باہر نکلے، دستر خوان پر کافی دیر انتظار کرنا پڑا، جلسہ میں ابتدائی تقریر کے لیے مصر ہوئے اور مائک پر تشریف لائے، پورا وعظ سوز وگداز اور رقت آفرینی سے لبریز رہا لیکن جو چیز اب تک میری نگاہوں میں گھوم رہی ہے وہ حضرت کا چہرہ انور ہے، جلسہ میں روشنی معمول سے زیادہ تھی، اس اجالے میں آپ کا چہرہ بلا مبالغہ آئینہ کی طرح چمک رہا تھا کہ ایسی غیر معمولی چمک کہ انسان دیکھتا ہی رہ جائے۔ سفید کرتا، سفید صافہ، سفید داڑھی، اور بقعہ نور بنا ہوا چہرہ کسی دوسرے عالم کی مخلوق نظر آرہے تھے۔

یہ چند واقعات ہیں جو میرے مشاہدے میں آئے۔ حضرت قبلہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی حیات مبارکہ کے ایسے بے شمار واقعات ہیں، جو سرمایہ عبرت وبصیرت ہیں اور حق کی راہ میں چلنے والوں کے لیے جادہ استقامت وہدایت، ضرورت اس بات کی ہے کہ ابھی حالت تازہ ہے اور حضرت کی جدائی کا تاثر جدید۔ وہ سارے حضرات جن کی موجودگی میں یا جن کے علم میں آپ کی زندگی کا کوئی بھی ایسا واقعہ ہو اسے تحریر کر کے اہل سنت وجماعت کے کسی بھی پرچہ میں شائع کریں تاکہ ان کے حیات طیبہ کے واقعات مرتب کرنا آسان ہوں۔

ذیل میں چند عنوان ذکر کیے جاتے ہیں جن کے بارے میں تحقیق وتفتیش کے صحیح واقعات مرتب کرنا حضرت کے متعلقین کی ذمہ داری ہے۔

قیام الہ آباد

الہ آباد کے قیام میں حضرت کا ایک اہم کارنامہ مسجد اعظم کی دریافت اور جامعہ

حبیبہ کا قیام ہے، اس کام کی عہد بہ عہد تاریخ، رفقائے کار اور خود حضرت کے مجاہدانہ کارنامے اس لائق ہیں کہ منظر عام پر لائے جائیں۔ الٰہ آباد میں ہی حضرت نے رافضیوں اور عیسائیوں سے باقاعدہ تحریری وتقریری مناظرہ اور مقابلہ فرمایا۔ یہ داستان بھی مسافرانہ راہ حق کے لیے جادہ حق کا کام دے گی۔

قیام قید خانہ

آپ کی حیات مبارکہ کا معتد بہ حصہ مختلف جیلوں میں گذرا ہے، وہاں آپ نے کن کن حالات میں اور کس کس طرح حق وصداقت کا جھنڈا بلند فرمایا، یہ واقعات بھی سر فروشان راہ حق کے لیے دستور العمل کا کام دیں گے۔

سفر حج

متعدد دفعہ آپ نے حج وزیارت کی سعادت حاصل فرمائی اور کئی دفعہ اعلان حق وصداقت کے لیے آپ نے نجدی حکومت کے عمال کو چیلنج کیا، ان سے مکالمہ ومباحثہ کیا اور مذہب حق اہل سنت کی واضح سچائی واشگاف فرمائی اور مختلف منازل تعذیب وتہدید سے گزرے، انہیں بھی سلیقہ سے ترتیب دے کر پیش کیا جائے تو قوم کی بہت بڑی خدمت ہو گی۔

میری نگاہ میں دنیاوی حیثیت سے حضرت مرحوم ایک بہت بڑے زمین دار رئیس تھے، ریاست کی کچھ خوبی بھی حضرت میں پائی جاتی تھی، مثلاً کیسی ہی سخت سردی پڑ رہی ہو ایک کی بجائے دو کمبل اوڑھتے مگر رضائی ہرگز استعمال نہ فرماتے۔

حضرت کے دستر خوان پر میں ہفتوں حاضر رہا۔ نہایت وسیع اور پر تکلف دستر خوان ہوتا تھا۔ کیک کے قسم کا ایک پکوان نہایت عمدہ اور لطیف اور حضرت کو مرغوب، آپ کی اہلیہ محترمہ خاص طور سے اسے خود پکاتی تھیں، میں نے صرف وہیں کھایا، آخر عمر میں

کپڑوں میں بے حد سادگی آ گئی تھی۔ استری کیا ہوا کپڑا کبھی نہ دیکھا، بیشتر ہاتھ ہی کا دھلا ہوا لیکن نہایت عمدہ صاف اور بے حد اجلا، میلا ہونے ہی نہیں دیتے تھے۔

دن ہو چاہے رات سوتے وقت آپ کے خادم خاص عبد الغفار صاحب آپ کا جسم ضرور دباتے جس سے حضرت کو فوراً نیند آ جاتی، بسا اوقات دیکھا حضرت کے سر پر ٹوپی بھی خادم ہی نے درست کی۔ لیکن پیدائشی رئیس ہوتے ہوئے بھی ریاست کی قباحتوں سے یک سر پاک صاف تھے، داد و دہش اور عفو و در گزر کا یہ عالم کہ معلوم ہوتا تھا ہے کہ حضور رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ وسلم کی سنت کریم پر پورا پورا عمل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

پوری ریاست عفو و نوازش کی نذر ہو گئی۔

بے نفسی اور استغنا کا یہ عالم کہ کبھی کسی سے منفعت کی امید نہ رکھی۔ جلسوں میں سفر خرچ سے زائد جو نذرانہ ملتا اسے واپس کرتے، میں نے دیکھا لوگ آپ سے وابستہ ہو کر اٹے آپ سے ہی منفعت حاصل کرتے، آپ نے اپنی مستورات کے زیور بیچ کر دین کی خدمت کی ہے۔ گھر میں نے اعتکاف کے عالم میں تخت بچھا ہوا دیکھا لیکن سفر میں سونے کے لیے زمین کا فرش ہو یا تخت و چارپائی ہو نہ اس سے عار، نہ اس کی طلب، گویا کم خواب کا فرش اور صاف ٹاٹ کا ٹکڑا دونوں آپ کی نظر میں برابر تھا۔ بے شمار دعوتوں میں میرا ساتھ ہوا مگر کسی کھانے کی طرف کوئی خاص رغبت نہ دیکھی، نہ کسی کھانے کو ناپسند فرمایا، مچھلی اور آم سے رغبت ضرور تھی لیکن کھانے معمول کے مطابق ہی تھے کبھی کبھی فرماتے "اڑیا" آدمی یو پی والوں کے تکلفات کو کیا جانوں؟ گویا اپنے زہد و تواضع کو وطن کے لباس میں چھپا رہے ہیں، یہ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ ان کے گھر کا دستر خوان دیکھ چکا ہوں۔

اپنے مولا کی اطاعت میں اتنے چاق و چوبند کہ نہ سردی کی پروا، نہ گرمی کا الم، نہ رات کا خیال، نہ دن کا اندوہ گویا۔ ع

سر نہادم بدانچہ خاطر اوست

میری نگاہ میں آپ اپنے وقت کے ایک عبقری عالم تھے۔ اندازہ ہے کہ علوم

اسلامیہ میں جتنے علوم عام طور سے پڑھائے جاتے مولانا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو ان پر ماہرانہ دسترس حاصل تھی اور غیر معمولی استحضار تھا۔ دھوم اگر چہ علوم عقلیہ میں تھی لیکن حدیث وفقہ، تفسیر وکلام کونسا علم تھا جس پر آپ کو یکساں قدرت حاصل نہ ہو؟ آپ سے کسی فن کے مسئلہ پر گفتگو کر لیجئے ہر مسئلہ کا آپ حق ادا فرماتے تھے، کتاب کے آپ بے حد شوقین تھے جو کتاب کہیں نہ ملے حضرت کے پاس اس کے کئی نسخے ہو سکتے تھے۔

"کتاب المنسق" میں نے پہلی بار اور اسی کو آخری بار بھی کہیے حضرت کے پاس ہی دیکھی، اخیر وقت تک آپ کے علمی استحضار اور ذکاوت میں شمہ برابر فرق نہیں آیا، اور دماغ پر کنگھی کا کوئی اثر نہیں محسوس ہوتا تھا، مناظرے میں ماثور دلائل پر آپ روشنی نہیں فرماتے خود بے شمار دلائل آپ ایجاد بھی فرماتے تھے۔ کسی مناظرہ میں حضرت مولانا ارشد القادری نے فرمایا میں ارشد ہوں، مجھ سے خوف کھاتے رہو، اس پر مخالف نے کہا تو میں کیوں خوف کھاؤں میں تو ارشد کا بھی مصدر ارشاد ہوں۔ حضرت مجاہد ملت نے سنتے ہی بر جستہ فرمایا کیا کہتے نہیں؟ "المصدر کالمخنث لا یذکر ولا یونث" ظاہر ہے اس نوک جھونک کا پانسہ ہی پلٹ گیا اور مقابل لا جواب ہو کر چپ رہا۔ آپ کی جواں مردی اور حق گوئی کا یہ عالم کہ وقت کا کوئی استبداد آپ کی آواز دبا نہ سکا اور کوئی طاقت آپ کے بڑھتے ہوئے قدم کو روک نہ سکی۔ علمائے راسخین کی صف میں حضور مجاہد ملت مجھے شہید حریت وحق گو حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی علیہ الرحمۃ والرضوان کی صف کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

وہی شوکت وہی عظمت وہی شان دلآویزی

اور علم وفضل کے ساتھ ساتھ حضرت مجاہد ملت عارف باللہ اور صاحب باطن بھی تھے، چنانچہ علم باطن پر آپ کو فنی قدرت بھی تھی اور عمل بھی۔ ایک دفعہ حضرت مولانا عبد السلام صاحب دہلوی مرحوم ومغفور کا تذکرہ ہوا۔ اور ان کے وحدۃ الوجودی ہونے کے سلسلہ میں بحث چلی تو آپ نے اس مسئلہ پر ایک سیر حاصل گفتگو فرمائی کہ مولانا عبد السلام

صاحب یوں کہتے تھے اور یوں فرماتے تھے۔ گویا ساری بات آپ نے گفتہ آید در حدیث دیگر ارشاد فرمادی۔ اور عملی مجاہدے کا یہ عالم تھا کہ کلک جیل میں آپ تھے تو یہ مشہور ہوا کہ رات میں حضرت جیل کی بند کوٹھری سے باہر اور زنجیروں سے آزاد ہو کر صحن میں پھرتے ہیں اور ذکر و نماز میں مشغول رہتے ہیں۔ جب آپ چھوٹے تو مجھ سے ملاقات ہوئی، میں نے پوچھا حضرت وہ کیا قصہ تھا۔ تو کہنے لگے ارے کچھ نہیں ایک حجام تھا جو جیل میں میری حجامت بنانے آتا تھا، اس نے اس کو شہرت دی، پھر تھوڑی دیر بعد فرمایا: وہاں ایک کمیونسٹ لیڈر بھی میرے ساتھ جیل میں تھا، مختلف مسائل پر اس سے تبادلہ خیال ہوتا رہتا۔ ایک دفعہ وہ بھی کہنے لگا ہو سکتا ہے کہ آپ کو یہ غیر معمولی طاقت حاصل ہو، کیوں کہ آپ محنت بہت زیادہ کرتے ہیں۔ یہ اشارہ عبادت وریاضت کی طرف تھا۔

الغرض حضرت محترم اہل سنت کی آبرو، دین کا وقار اور روحانیت کا پرچم تھے، اللہ تعالیٰ قوم کے اس عظیم زخم پر جو ان کے فقدان سے لگا ہے مرہم رکھے اور ملت میں ان کے امثال پیدا فرمادے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حیات صدر العلما محدث میرٹھی علیہ الرحمہ

بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

سلسلہ نسب:

حضرت صدر العلما بدر الفضلا مولانا سید غلام جیلانی صاحب میرٹھی علیہ الرحمہ ابن جناب مولوی سید غلام فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ابن قدوۃ العلما، امام الفضلا، مولانا مولوی سید شاہ سخاوت حسین صاحب قدس سرہ۔

وطن مالوف:

ریاست دادوں ضلع علی گڑھ۔ یہ ریاست اپنے نوابوں کی دین داری، علم پسندی، اور دینی خدمت کے لیے شہرت رکھتی ہے۔ حضرت صدر الشریعہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ عرصہ تک دار العلوم حافظیہ سعیدیہ میں صدر المدرسین کے عہدہ پر فائز رہے، اور آپ کی رہنمائی میں یہاں ذی استعداد علما کی بڑی تعداد پیدا ہوئی۔

ولادت:

۱۱ر رمضان المبارک۔ اپنی ولادت کے سلسلہ میں آپ خود تحریر فرماتے ہیں:

میرے والد ہر پنج شنبہ کو گھر کی پالتو بھینس کے دودھ میں کھیر پکواتے، اور بزرگان دین اور جملہ مومنین اور مومنات کو ایصال ثواب کرتے، اور خاندانی دستور کے موافق

گیارہویں شریف کی فاتحہ بھی آپ کے معمولات میں تھی۔

مجھ سے پہلے میری چار بہنیں یکے بعد دیگرے پیدا ہوئیں، جن سے گھر بھر گیا۔ اس لیے والدین کو فرزند کی بڑی آرزو تھی۔ پانچویں مرتبہ امید ہونے پر آپ نے حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی منت مانی۔ یا اللہ اگر اس بار فرزند متولد ہوا تو معمول سے زیادہ وسیع پیمانہ پر گیارہویں شریف کی فاتحہ پیش کی جائے گی۔ کسی بزرگ نے خواب میں بشارت دی، دعا مقبول ہوئی اور بچہ کا نام غلام جیلانی رکھا جائے۔

(بشیر القاری ص ٦)

پیدائش کے سلسلہ میں حضرت صدر العلما اپنے استاد گرامی اور مخدوم و مطاع حضرت استاد العلما مولانا سید نعیم الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے یک گونہ مشابہت رکھتے ہیں۔ حضرت مولانا محمد عمر صاحب نعیمی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

”استاذ العلما سے قبل آپ کے چار بھائی کم عمری میں ہی حفظ مکمل کر کے اللہ کو پیارے ہو گئے تھے جس سے والد گرامی کو سخت قلق تھا۔

استاذ العلما کی ولادت کے وقت آپ کے والد نے بھی منت مانی یا اللہ اگر یہ بچہ عمر طبعی کو پہونچا، تو میں اس کو خدمت اسلام کے لئے وقف کردوں گا۔“

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولادت کے سلسلہ میں منت کی سنت، ابرار و صالحین کا قدیم طریقہ رہا ہے۔

﴿إِذْ قَالَتِ امْرَأَةُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾[العمران: ۳۵]

حضرت عمران کی بیوی نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی: مولا تعالیٰ میں نے اپنے پیٹ کے اس بچہ کو تیرے پاک گھر کی خدمت کے لئے آزاد کرنے کی منت مانی تو تو اسے قبول فرما تو سننے اور جاننے والا ہے۔

آبائے کرام:

آپ کے والد سید غلام فخر الدین صاحب نے شرح جامی تک تعلیم حاصل کر کے تعلیم ترک کر دی تو نواب احمد سعید شیروانی نے دادوں میں ہی تینتیس ۳۳ر بیگھہ زمین دی اور قلعہ کے اندر کی مسجد میں جمعہ و جماعت کی امامت و خطابت پر مقرر فرمایا۔
والد کو زیارت حرمین شریفین کا مدت سے اشتیاق تھا۔ ایک دفعہ ولولہ اٹھا، تو بعزم میرٹھ آ گئے، نہ ٹیکے لگوائے، نہ روپیہ داخل کیا، نہ کسی کمپنی سے مراسلت کر کے سیٹ ریزرو کروائی، متوکلاً علی اللہ چند احباب کے ساتھ بمبئی پہنچ گئے۔ پہلے سے درخواست نہ ہونے کی وجہ سے ٹکٹ نہیں ملا۔ آپ فرماتے ہیں: میں اپنی حرماں نصیبی پر کھڑا رو رہا تھا کہ ٹکٹ آفیسر کی نظر میرے اوپر پڑ گئی۔ چپراسی بھیج کر مجھے بلایا، دریافت حال کے بعد ٹکٹ بنوا دیا۔

خدا خود میر سامانست ارباب توکل را

اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے والوں کا وہ خود کارساز ہے۔ ۱۸ر رمضان شریف رات میں انتقال فرمایا اور دادوں میں ہی مدفون ہوئے۔

دادا علیہ الرحمہ:

حضرت مولانا سخاوت حسین علیہ الرحمۃ والرضوان علم شریعت اور طریقت دونوں راہوں میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ اور صرف ونحو و مناظرہ میں امامت کے درجہ پر فائز تھے۔ شاگرد تو آپ نے بڑے بڑے حضرات کو بنایا۔ البتہ تصوف میں اپنے پیر و مرشد حضرت سید محمد علی صاحب خیر آبادی کے سجادہ نشین حافظ سید محمد اسلم صاحب کی زندگی میں ادباً کسی کو مرید نہیں کیا۔ ۱۲۹۹ھ میں بمقام خیر آباد اپنے مرشد کے آستانہ پر داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور وہیں مدفون ہوئے۔ ۵۷ء میں شورش میں آپ کو بھی باغیوں کی صف میں لکھ دیا گیا تھا۔ فوج نے اعزہ و اقرباء سب کو شہید کر ڈالا۔ ساری جائداد لوٹ لی۔ اور آپ

کو پادری کہکر چھوڑ دیا۔رضی اللہ تعالیٰ عنہ و افاض علیہ من شآبیب رحمتہ

آپ کے چچا:

حضرت مولانا سید قطب الدین صاحب برہمچاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، استاذ الکل حضرت مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی کے شاگرد تھے۔ بنارس میں سنسکرت کی تعلیم حاصل کی اور ہندو دھرم پر پوری معرفت بہم پہونچائی۔ وہ آل انڈیا مقرر اور مشاق مناظر تھے، شروع میں آریوں سے مناظرہ اور ان کا رد کیا کرتے۔ اخیر میں غیر مقلدین کی شورش بڑھی تو ان کی طرف بھی توجہ فرمائی۔ شاعر بھی آپ پر گو اور قادر الکلام تھے۔

آگرہ میں ایک دفعہ غیر مقلدین نے ایک مشاعرہ کیا جس کا مصرع اس طرح تھا:

جائز نہیں ہے دوستو مولود و فاتحہ

آپ نے بھی اس مشاعرہ میں شرکت کی، اور جب تضمین کا شعر پڑھا تو پورے مجمع میں دھوم مچ گئی، اور مدت تک یہ شعر لوگوں کی زبان پر نقارہ خدا بن کر گونجتا رہا۔ شعر یہ ہے:

مردار سود خور وہابی کے مال پر ۔۔۔ جائز نہیں ہے دوستو مولود و فاتحہ

رمضان المبارک ۱۳۵۰ھ میں سہسوان ضلع بدایوں میں انتقال فرمایا۔﴿انا للہ و انا الیہ راجعون﴾

تعلیم و تربیت:

سن شعور کو پہونچے تو آپ کی رسم بسم اللہ ہوئی۔ اور ناظرہ قرآن شریف ختم کیا تو مکتب میں داخل کر دیئے گئے۔

(۱) جہاں آپ نے منشی فیض علی صاحب اترولوی سے تعلیم حاصل کی، پھر پرائمری اسکول میں داخلہ لیا۔

(۲) جہاں آپ نے ہیڈ ماسٹر منشی نتھو خاں صاحب سے درجہ چہارم تک کی تعلیم

حاصل کی۔

اس کے بعد آپ کے چچا حضرت مولانا قطب الدین برہمچاری نے آپ کو مراد آباد لاکر مدرسہ انجمن اہل سنت میں داخل کیا۔ جواب جامعہ نعیمیہ کے نام سے مشہور ہے۔

(۳) وہاں کے مدرس حضرت مولانا عبد العزیز صاحب فتح پوری تھے (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) ان سے فصول اکبری تا ختم اوزان اور کافیہ تا بحث مرکبات، صرف پڑھی ہی نہیں زبانی یاد کرلی۔ ان سے صدر العلما بے حد متاثر اوران کے علم وفضل کے بے حد مداح ہیں۔

(۴) دوران قیام مراد آباد استاذ العلما، صدر الافاضل حضرت مولانا سید نعیم الدین صاحب مراد آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے گلستاں، قدوری، قال اقول، کے ابتدائی حصے پڑھے۔ آپ کے ہی طریقہ تعلیم سے صدر العلما کی طبیعت میں جستجو کا مادہ پیدا ہوا۔ استاذ العلما طالب علم کے پڑھے ہوئے سبق کے کسی مسئلہ پر اعتراض کرتے اور طالب علم سے اس کا جواب نکلواتے۔ غور وخوض سے مطالعہ کے ذریعہ، خود اپنی رہنمائی میں طالب علم سے مسئلہ حل کراتے، انشاء عربی کا شعور بھی حضرت صدر العلما کو صدر الافاضل سے ہی ملا۔

(۵) اپنے اساتذہ میں صدر العلما نے حضرت مولانا وصی احمد صاحب سہسرامی کو بھی ذکر کیا ہے۔ جو اس وقت مراد آباد جامعہ نعیمیہ کے صدر المدرسین تھے۔ یہاں تک آپ کے اساتذہ کی تعداد پانچ ہوئی۔

۱۹۲۵ء مطابق ۱۳۴۳ھ میں اپنے سات ہمراہیوں کے ساتھ جامعہ معینیہ عثمانیہ دار الخیر اجمیر شریف میں مزید تعلیم کے لیے حاضر ہوئے۔ صوفی ضمیر حسن صاحب، شمس العلما قاضی شمس الدین صاحب جونپوری، آپ کے چچا زاد بھائی مولوی زین العابدین صاحب مرحوم، قاری اسد الحق صاحب، حافظ ملت مولانا عبد العزیز صاحب اور ان کے ایک ناظرہ خواں شاگرد محمد اسماعیل صاحب۔

استاذ العلما حضرت مولانا سید نعیم الدین صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ آپ پر غیر

معمولی شفقت فرماتے، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ گلستاں، قدوری، قال اقول جیسی ابتدائی کتابیں پڑھانا آپ کی کامل توجہ پر دلالت کرتا ہے۔ خارج اوقات میں بھی ان سے مسائل کی توضیح اور وعظ و تبلیغ کے جلسوں میں بھی ساتھ لے جانا یہ سب آپ کی شفقت و رحمت کے ثبوت ہیں۔ ایک حیرت انگیز واقعہ کو حضرت صدر العلما نے بھیگی پلکوں کے ساتھ مجھ سے خود بیان کیا، فرماتے ہیں:

میری شادی اس وقت ہو چکی تھی، پہلے فرزند کی ولادت کی خبر مرادآباد میں بذریعہ خط موصول ہوئی۔ حضرت صدر الافاضل صاحب کے مصاحبین میں ایک حاجی صاحب تھے جو آپ کی بزم میں ذریعہ تفریح تھے۔ انہوں نے مجھے چھیڑنا شروع کیا جیلانی! تمہارے فرزند ہوا ہے، مٹھائی کھلاؤ۔

ایک دن حضرت کی بزم میں بھی انہوں نے یہی کہنا شروع کیا، آواز ان کی دھیمی تھی۔ مگر مقصد ان کا یہ تھا کہ حضرت صدر الافاضل بھی سن لیں۔ حضرت نے پوچھا کیا ہے، حاجی صاحب؟ انہوں نے عرض کی حضور جیلانی میاں کے گھر میں صاجزادے تولد ہوئے ہیں۔ میں ان سے اس کی مٹھائی مانگ رہا ہوں۔ حضرت نے ہنس کر فرمایا: حاجی صاحب آپ بوڑھے ہو گئے مگر آپ کو بات کا سلیقہ نہیں آیا۔ دادا کی موجودگی میں آپ پوتے کی خوشی کی شیرینی اس کے والد سے مانگتے ہیں۔ آپ کو مجھ سے کہنا چاہیے تھا۔ حضرت آپ کے پوتا آیا ہے، ہم لوگوں کو خوشی کی سوغات ملنی چاہیے۔ جیب سے دس روپئے کا نوٹ نکالا اور فرمایا، جاؤ مٹھائی لاؤ۔ اتنا کہنے کے بعد حضرت صدر العلما نے گلو گیر آواز میں کہا: عبد المنان جب تک میں زندہ رہونگا حضور صدر الافاضل کی اس شفقت کی لذت بھول نہیں سکتا۔

سن ولادت:

حضرت صدر العلما نے اپنی تاریخ پیدائش اور مہینہ کا ذکر کیا، سال تحریر نہیں کیا۔ ہم ۱۹۲۵ء کو جو آپ کے مرادآباد چھوڑ کر اجمیر شریف جانے کا سال ہے۔ حد مان کر آپ کے

سن ولادت کے تعین کی کوشش کرتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں میری رسم بسم اللہ خوانی سن شعور میں پہونچنے پر ہوئی۔ رسم بسم اللہ خوانی کے بارے میں صاحب فرہنگ آصفیہ لکھتے ہیں:

"رسم مکتب نشینی، تقریب بسم اللہ، بچہ جب ساڑھے چار سال کا ہو جاتا ہے اس کو بسم اللہ پڑھا کر مکتب میں جانے کے قابل بناتے ہیں۔ یہ رسم بھی بیاہ کی طرح منائی جاتی ہے۔ (فرہنگ آصفیہ اول ۴۰۱)

لیکن امام اہل سنت، مجدد دین وملت حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے کسی نے پوچھا۔ حضور بسم اللہ کرانے کی کوئی عمر شرعاً مقرر ہے؟ ارشاد ہوا: شرعاً مقرر نہیں۔ ہاں مشائخ کے یہاں چار سال چار مہینے چار دن مقرر ہیں۔ حضرت خواجہ قطب الحق والدین کی بسم اللہ اسی عمر میں ہوئی۔ (ملفوظات چہارم ص ۴۷)

حضرت صدر العلما نے رسم بسم اللہ کے لیے سن شعور کا لفظ فرمایا، اب ہم سن شعور پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ دوم ص ۱۱۸۷ پر ہے:

سن شعور، سن بلوغ بلوغیت یا تمیز، سمجھ کی عمر، سیانا پن یا جوانی۔

کتب فقہ وحدیث میں اس لفظ کی مندرجہ ذیل تفصیلات ہیں:

(۱) سمجھ دار بچہ کی اذان صحیح ہے۔ (بہار شریعت حصہ سوم ص ۳۱)

(۲) سمجھ دار بچہ آٹھ نو سال کا اگر تنہا صف میں کھڑا ہو، صف میں کھڑا ہو سکتا ہے یا نہیں؟ ارشاد: مراقی الفلاح میں ہے:

﴿لم یکن جمع الصبیان، یقوم الصبی بین الرجال﴾. اگر لڑکا اکیلا ہو تو مردوں کی صف میں کھڑا ہو سکتا ہے۔ (فتاویٰ رضویہ سوم ص ۳۲۵)

(۳) ﴿یجوز اذان الصبی المراهق﴾ قریب البلوغ بچہ کی اذان جائز ہے۔

علامہ شامی فرماتے ہیں:

(۴) ﴿المراد به العاقل و لم یکن مراهقا﴾ قریب البلوغ کی شرط نہیں،

اس سے کم عمر کے سمجھدار بچے کی اذان بھی صحیح ہے۔ (شامی جلد اول ص ۳۶۲)

نمبر ۲ رکی عبارت سے ظاہر ہے کہ آٹھ نو سال کا بچہ بھی ذی شعور اور سمجھدار ہے۔ اور علامہ شامی کی وضاحت سے ظاہر ہے کہ آٹھ نو سال کا بچہ ذی شعور اور سمجھدار ہو سکتا ہے۔

(۵) ابوالشیخ ابن حبان نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی:

﴿عن انس یعق عنه یوم السابع و اذا بلغ ستة سنین ادب و اذا بلغ سبع سنین عزل عن فراشه و اذا بلغ ثلثة عشر سنین ضرب علی الصلاة﴾

(احیاء ۲: ۲۱)

بچہ سات دن کا ہو تو اس کا عقیقہ ہو۔ اور چھ سال کا ہو تو اس کو ادب سکھایا جائے، سات سال کا ہو تو اس کا بستر علیحدہ کر دیا جائے، اور تیرہ سال کا ہو تو اس کو نماز کے لیے مارا جائے۔

اس حدیث شریف میں ادب سکھانے کی عمر ۶ رسال بتائی گئی، تو ہم حضرت کے بسم اللہ خوانی کی عمر چھ سال کی مانتے ہیں۔

اس کے بعد آپ نے اپنی تعلیم کے تین مرحلے بتائے۔ ناظرہ قرآن شریف، مکتبی تعلیم، اور پرائمری درجہ چہارم تک، پرائمری درجات میں طالب علم ہر سال ایک درجہ ترقی کرتا ہے۔ تو اس مرحلہ کے لئے ہم سات سال مانتے ہیں۔ چار سال درجہ چہارم تک اور مکتب اور قرآن خوانی میں تین سال، اس طرح مراد آباد پہونچنے سے قبل آپ کی عمر کے تیرہ سال مکمل ہو چکے تھے۔

مدارس اسلامیہ میں طلبہ ابتدائی فارسی سے کافیہ کی تعلیم تک پانچ چھ سال صرف کرتے ہیں۔ لیکن آپ کے دوران قیام مراد آباد ۱۹۲۳ء میں مضافات آگرہ میں مسلمان راجپوتوں کے ارتداد کا فتنہ برپا ہوا۔ جس کے انسداد کے لئے جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی شریف، اور جامعہ نعیمیہ مراد آباد کی بھرپور جد و جہد جاری رہی جس میں طلبہ کا غیر معمولی تعلیمی

نقصان ہوا۔اسباق کے مسلسل ناغہ سے گھبرا کر صدرالعلماء اوران کے ہم سبق ۱۹۲۵ء میں دارالخیر اجمیر پہونچے۔اس لئے قیام مرادآباد کی مدت بھی ہم پانچ سال کے بجائے سات سال ہی قرار دیتے ہیں۔

اس طرح روانگی تک آپ کی عمر تقریبا بیس سال ہوئی،جس کو ۲۵ء سے وضع کردیا جائے تو آپ کی پیدائش ۱۹۰۵ء یا اس کے آس پاس ہوگی۔

قیام اجمیر:

(۶) اجمیر مقدس میں اپنے استاذ مفتی امتیاز احمد صاحب کے آپ بے حد مداح ہیں،ان کے فضل،ادب وتواضع،استحضار علم سے آپ بے حد متاثر ہیں۔فرماتے ہیں: ادبی قابلیت کا یہ عالم تھا کہ حماسہ،حریری اور متنبی وغیرہ کے الفاظ آپ کے نوک زبان پر رہتے تھے۔دریافت کرنے پر حوالہ بیان فرماتے کہ متنبی نے اس کو فلاں قافیہ میں اس معنی میں استعمال کیا۔اور حریری نے اس کو فلاں مقالے میں اس معنی میں تحریر کیا ہے۔

عبادت وریاضت کا یہ عالم تھا کہ خالی وقت میں ستون سے ٹیک لگا کر قرآن عظیم کی تلاوت کیا کرتے تھے۔تواضع وبے نفسی ان کا سراپا تھا،پڑھاتے وقت اگر کسی نے کوئی سوال کیا۔اور آپ کو اس مسئلہ میں کچھ مطالعہ کی ضرورت ہوتی تو صاف بتا دیتے کہ اسکو کل بتائیں گے۔اور دوسرے دن پوری تشفی فرمادیتے۔

شرح جامی،نفحۃ الیمن،سبع معلقات،متنبی وغیرہ ان سے پڑھی،اور علامہ ہشام کی قطرالندی تنہا ان کو پڑھائی۔

(۷) رأس المنطقیین حضرت مولانا سید عبدالمجید صاحب سے بعض کتابیں پڑھیں۔

(۸) ممتاز مناطقہ حضرت مولانا عبدالحیٔ صاحب افغانی شاگرد حضرت مولانا برکات احمد ٹونکی سے کچھ کتابیں پڑھیں۔

(۹) رأس الفلاسفہ حضرت مولانا عبیداللہ صاحب افغانی شاگرد حضرت مولانا

پردل صاحب سے شرح تہذیب کی منطقی ترکیب پڑھی۔

(۱۰) امیر النحاۃ سید امیر احمد صاحب پنجابی جو حاشیہ عبد الغفور اور تکملہ مولوی عبد الحق اور شرح ملا جامی پڑھانے میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ان سے حاشیہ اور تکملہ پڑھی، یہ فی سبیل اللہ پڑھاتے تھے۔ اور وقت کے بے حد پابند تھے۔ جس طالب علم میں ذرا بد شوقی پائی اس کو پڑھانا بند کر دیتے تھے۔

(۱۱) استاذ القراء قاری غلام نبی صاحب ٹونکی سے قرأت سیکھی جو قاری عبد الرحمٰن صاحب کے ہم درس تھے۔

(۱۲) حضرت صدر الشریعہ، بدر الطریقہ، مولانا محمد امجد علی صاحب قدس سرہ صدر المدرسین جامعہ معینیہ سے حواشی زاہدیہ، شرح مواقف مع حاشیہ مولانا عبد الحق، قاضی مبارک مع حاشیہ فضل حق اجمیر شریف میں پڑھی۔

اجمیر سے واپسی:

۱۳۵۱ھ میں درگاہ شریف کے متولی اور دار العلوم معینیہ عثمانیہ کے متولی کی ریشہ دوانی اور ایذا رسانی سے کبیدہ خاطر ہوکر حضرت صدر الشریعہ نے استعفا دیدیا اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا حامد رضا خاں صاحب کی درخواست پر چالیس طلبہ کے ساتھ جن میں حضرت صدر العلما مولانا غلام جیلانی بھی تھے دار العلوم منظر اسلام بریلی شریف بعہدۂ صدر المدرسین تشریف لائے۔

حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہاں آپ سے شرح چغمینی، محقق دوانی کے حواشی قدیمہ وجدیدہ، شرح تجرید اور اشارات امام رازی اور محقق طوسی کی شروح کے ساتھ سبقاً سبقاً پڑھی۔ اس وقت آپ کے شریک درس حضرت مولانا سردار احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حافظ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور حضرت مولانا رفاقت حسین صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تھے۔

حضور صدر الشریعہ کے بارے میں حضرت صدر العلما فرماتے ہیں کہ آپ کی

عادت کریمہ یہ تھی کہ شدید بخار کی حالت میں بھی سبق ناغہ نہ ہوتا تھا" اسی لیے آپ کی تعلیم میں بڑی برکت تھی۔ حافظ ملت حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں: ہم لوگوں نے ان کی خدمت میں جو کتابیں پڑھیں سب مکمل اور پوری پڑھیں۔ ملاحسن کو قیوم تک پڑھ کر ہم نے یہ سمجھا کہ کورس ختم ہوا تو درس بھی ختم ہوا۔ آپ نے فرمایا تم لوگوں کو پوری کتاب مکمل تصورات تک پڑھنی ہوگی۔

آپ عبارت خوانی اور ترجمہ اس طرح کراتے کہ عبارت پر واقع ہونے والے اعتراض اسی مرحلہ میں ختم ہو جاتے۔ حضرت مولانا محبوب رضا بریلوی فرماتے ہیں:

بخاری شریف میں حدیث قرطاس میں لفظ "اھجر" آیا ہے۔ اس کو اگر "اَھجَر" پڑھا جائے تو سوال و جواب کی گنجائش ہے، شروح میں اس پر بہت قیل وقال ہے۔ ہم نے پوری محنت سے وہ مقام یاد کر لیا تھا کہ یہ فرمائیں گے تو یہ پہلو اختیار کر کے یہ کہیں گے، مگر جب سبق پڑھتے وقت قاری نے اس لفظ کو "اُھجر" پڑھا تو آپ نے فرمایا کہ "ہ" کو ساکن نہ پڑھو، مفتوح پڑھو کہ مفتوح پڑھنا ہی صحیح ہے۔ بس ایک جملہ میں ان سب قیل وقال کا جواب ہو گیا کہ ان کی گنجائش "ہ" کو ساکن پڑھنے کی صورت میں نکلتی ہے۔"

حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب نے آپ کے طریقہ درس کے بارے میں فرمایا۔ آپ کے درس کی تقریر دادِ تحقیق حاصل کرنے کی سعی یا ایجاز مخل کی مصداق نہیں ہوتی تھی۔ آپ مختصر جملوں میں حقیقی صورت حال جامع اور سہل الفاظ میں بیان فرماتے جو طالب کے ذہن کے قریب ہوتی، گویا۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا

دستار بندی:

بریلی شریف میں آنے کے بعد وہیں سے دستار بندی اور حضور صدر الشریعہ سے سند تکمیل حاصل کی ہے۔ منقولات میں آپ کو حضرت صدر الشریعہ بدر الطریقہ مولانا شاہ

محمد امجد علی صاحب سے سماع واجازت تھی۔

اسناد علوم:

ان کو حضور مجدد مأۃ رابع عشر مولانا الشاہ احمد رضا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے ان کو حضرت پیر طریقت خاتم الاکابر حضرت شاہ آل رسول احمدی نور اللہ تعالیٰ مرقدہ سے اوران کو مولانا شاہ عبد العزیز دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے۔

''معقولات'' میں آپ کو حضرت صدر الشریعہ سے سماع واجازت ہے۔ اوران کو حضرت مولانا شاہ ہدایت اللہ خان صاحب جونپوری سے۔ اور ان کو حضرت مولانا شاہ مجاہد جنگ آزادی فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے۔

طریقت میں حضرت اشرف المشائخ سیدنا ومولانا شاہ علی حسین کچھوچھوی علیہ الرحمہ سے ارادت وخلافت حاصل ہے جو حضرت علاؤ الحق پنڈوی، محبوب الٰہی حضور نظام الدین اولیا سے حضور خواجہ خواجگاں چشت اہل بہشت تک پہنچتا ہے۔

اجمیر شریف میں ہی حضرت اشرفی میاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت حافظ ملت علیہ الرحمہ کو بھی خلافت بخشی، آپ نے معذرت کی حضور میں اس کا اہل نہیں ہوں۔ حضور اشرفی میاں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے برجستہ فرمایا ''حق را استطاعت شرط نیست'' جس کو عہدہ دیتے ہیں اسے اس کا اہل بھی بنا دیتے ہیں۔

حضرت صدر صاحب نے لال کرتی میرٹھ کے رئیس بھیا بشیر الدین صاحب اور ''سراوہ'' کے بزرگ حضرت حافظ محمد ابرہیم سے بھی اکتساب فیض کا اظہار کیا ہے۔

آپ کی سندوں پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ معقولات قدیم ومنقولات کے وہ عظیم مراکز جو ہندستان میں درجہ اول پر شمار ہوتے تھے۔ ان سب سے آپ کا سلسلۂ تلمذ قائم رہا ہے۔ جیسے خیر آباد کا علمی گھرانا، کہ معقولات میں ان کے علم وفضل کا پرچم پورے ہندوستان پر لہرا رہا تھا۔ منقولات میں دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحب کا خاندان پورے ہندستان میں سرآمد روزگار تھا، بریلی شریف میں امام احمد رضا کا دائرہ علمیہ تھا جن کی

فقہی مہارت کا ستارۂ اقبال بغض وعناد کے تمام پردوں کو پارہ پارہ کر کے آج بھی اوج ثریا پر جگمگا رہا ہے۔ معرفت وتصوف میں حضرت شیخ مشائخ اشرفی میاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے وقت میں عرب وعجم کے ممتاز بزرگوں میں سے تھے۔

اس پر حضرت صدر صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خلقی اور کسبی صلاحیتیں مستزاد ہیں، تو اس موقع پر چاہیے یہ مشہور مثل دہرائیے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، یا اس حقیقت کا اعتراف کیجئے کہ بازار میں باغ اور درخت کے نام سے پھل بیچے اور خریدے جاتے ہیں۔

شرکائے درس:

آپ نے اپنے شرکائے درس میں سے دس افراد کا نام لیا ہے، جن میں سے اکثر اپنے عہد اور علاقہ میں اہلسنت وجماعت کے عمائد اور اساطین ملت میں شمار ہوتے تھے۔ پس حضرت صدر العلما کو ذاتی حیثیت سے دیکھا جائے۔ مشائخ واساتذہ کی نسبت سے دیکھا جائے یا شرکائے درس اور ہم جلیسوں کے لحاظ سے، بے اختیار یہ کہنا پڑتا ہے:

ایں خانہ ہمہ آفتاب است — ایں سلسلہ طلائے ناب است

لگ بھگ ۲۶ ر ۲۷ ر سال تک کی عمر تک حضرت صدر العلما نے اپنی تعلیم میں صرف کیا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگوں نے حصول علم کی راہ میں کبھی بھی وقت کی پرواہ نہیں کی۔ اور اب ہمارا یہ حال ہے کہ وقت بچانے کے لئے تعلیم سے بالکل بے نیاز ہوگئے ہیں۔ تعلیم گاہوں میں داخلہ اور کتابوں کی رونمائی کے بعد ہی سے مارکشیٹ اور سند کا چکر شروع ہو جاتا ہے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

حلیہ وسراپا:

چھ فٹ سے ابھرتا ہوا قد، اسی کی مناسبت سے بھاری بھرکم جسم، رنگت سرخ و سفید، ہاتھ پیر اور جسم کے اعضا مضبوط، سر بڑا نہ بالکل گول نہ لانبا، چاند کے بال غائب اور

کنارے کنارے کے بال موجود تھے۔ٹوپی پہن لیتے یا پگڑی باندھ لیتے تو معلوم ہوتا سارے بال موجود ہیں۔لباس صاف اور ستھرا پہنتے تھے، یوں بھی جامہ زیب تھے اور جب کہیں جانا ہو اور پورا لباس پہن کر نکلتے تو آپ کی شخصیت بارعب قابل توجہ اور متاثر کن ہوتی۔

آنکھیں بڑی اور فراخ، ڈھیلے کا سفید حصہ بالکل سفید اور سیاہ حلقہ بالکل سیاہ، سفید حصہ میں باریک سرخ ڈورے خوب بہار دیتے۔ان میں سرمہ لگانے کی سنت پر بھی عمل تھا۔

رخسار بھرے ہوئے، ناک ستواں، دہانہ فراخ اور چہرہ پر بھرپور داڑھی، الغرض اپنے خلقی محاسن میں بھی آپ خوب محبوب تھے۔صدر العلما کا لقب آپ پر خوب پھبتا تھا۔

ایک دفعہ مبارکپور تشریف لائے، آپ کے ساتھ حضرت ساجد میاں صاحب مہتمم دار العلوم مظہر اسلام بریلی شریف بھی تھے۔جو قد و قامت، جسم و جثہ میں حضرت صدر صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ڈھانچہ کے تھے۔اتفاق سے وہ فوج میں بھی رہ چکے تھے۔اعظم گڑھ تک ان کی پذیرائی کے لیے میں گیا تھا۔

وہ حضرات سواری سے اترے تو میں ان حضرات کو چائے کے لیے ایک قریبی ہوٹل میں لے گیا۔راستہ مختصر تھا پھر بھی یہ لوگ جدھر سے گئے، دائیں بائیں کے لوگ کھڑے ہو کر دونوں حضرات کو تکنے لگے۔گویا یہ سوچ رہے ہوں کہ یہ سرحدی لوگ ادھر کیسے بھٹک آئے۔

لیکن مذکورہ بالا شاہانہ مزاج جس کو ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔عام طور پر کسی کی تعلیم اور کسب سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ یہ تو قدرت کا انعام اور فطرت کی عنایت ہوتی ہے۔اور آدمی کی جبلت کی اسی پر تخلیق ہوتی ہے۔البتہ اس میں کسی کی صحبت کی تاثیر جلاً ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔

تو اس سلسلہ میں حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر اپنے محترم استاذ حضرت

صدر الافاضل استاذ العلما مولانا سید نعیم الدین صاحب مرادابادی رحمۃ اللہ علیہ کا بھرپور اثر پڑا۔

چنانچہ حضرت مولانا سلیمان صاحب بھاگلپوری جو خود بھی ایک جاگیردار اور عالی خاندان بزرگ تھے، وہ جب تک دار العلوم اشرفیہ میں رہے عربی مدرسین کی عام روش کے خلاف کھانا اپنی طبیعت کے موافق خرچ سے تیار کراتے اور کھاتے۔ دوسرے مدرسین کی طرح جاگیر کا کھانا کبھی نہیں کھایا۔ وہ فرماتے ہیں:

آج کل کے طالب علم تو استاذ کو ملازم سمجھتے ہیں کہ طبیعت موزوں ہو نہ ہو گھنٹی بج گئی تو استاذ کو سبق ضرور پڑھانا ہے۔ ہم لوگوں نے صدر الافاضل علیہ الرحمہ سے پڑھا ہے۔ وہ بادشاہ تھے' بادشاہ.......ان کے مکان پر مختلف ضرورت مندوں کی بھیڑ ہوتی تھی، غربا اور حاجت مند۔ مریض اور دعا کے خواہاں، اسی میں جامعہ نعیمیہ کے انتظام کار' درس نظامیہ پڑھنے والے طلبہ اور طب سیکھنے والے لوگ سبھی ہوتے۔ اور آپ سبھی کی ضرورتوں کے موافق سلوک کرتے۔ مریضوں کو دیکھ کر طب کے طلبہ کو نسخہ املا کراتے، دعا تعویذ والوں کے لیے حاضر باش لوگوں میں سے کسی صاحب سے فرماتے ان کو فلاں تعویذ لکھ دو! کبھی خود لکھ دیتے۔ استفتا کے جواب کا املا فرماتے، یا کسی عالم کے حوالہ کرتے کہ ان کا جواب لکھ دو! جب سب سے فرصت پاتے تو طب یا درس نظامی کی کسی جماعت کو بلا لیتے' اور اسی مشغلہ میں ظہر کا وقت آجاتا اور بقیہ کا درس دوسرے دن موقوف،۔ اسی طرح کبھی کبھی ہم لوگ ہفتہ بھر تک آپ کی خدمت میں آتے جاتے رہتے تو کسی دن ہمارا سبق بھی ہو جاتا۔ اور جس دن سبق پڑھ لیتے تو ہفتوں کے انتظار کی کلفت دور ہو جاتی اور ایسا پڑھا دیتے کہ اس اتفاقی درس کو دولت بے بہا سمجھتے۔ اور کئی دن تک اسکی لذت میں سرشار رہتے۔

حضرت صدر صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی اسی روش پر کاربند تھے جس کی تائید بھی انہیں حضرت صدر الافاضل کے طرز عمل سے مل گئی تھی۔ لیکن بالالتزام و بلاناغہ درس کے وہ خود بھی بیحد مداح تھے۔

ایک دفعہ مجھ سے انہوں نے فرمایا: جب میں نے بشیر القاری لکھی تو مقدمہ میں حمد میں نے ان الفاظ میں لکھی۔ کہ اصلا تو وہ حمد ہی ہو لیکن نام میرے استاذ صدر الشریعہ کا آجائے میں نے لکھا ''الحمد لله الذی هو امجد علی " اس خدا کی حمد جو بزرگ اور اعلیٰ ہے۔اس پر میرے احباب میں سے بعض نے کہا کہ آپ تو حضرت استاذ العلما کے مخصوص طالب علموں میں سے ہیں۔آپنے یہ کیا کیا کہ خطبے کے شروع ہی میں حضرت صدر الشریعہ کا نام لے بیٹھے۔اتنا کہہ کران کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور فرمایا: عبدالمنان! میں ایسا کیوں نہ کرتا، آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایسے شفیق تھے کہ شدید بخار کی حالت میں بھی روزانہ سبق پڑھاتے۔اور فرمایا: ہمارے استاذ حضرت مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب جونپوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرمایا کرتے تھے۔سبق ناغہ کرنے سے تعلیم کی برکت ختم ہوجایا کرتی ہے۔

آپ کا دستر خوان:

آپ کے دستر خوان کے بارے میں تو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس پر کس کا پرتو تھا۔ لیکن میں حضرت صدر الشریعہ بدر الطریقہ مولانا شاہ امجد علی صاحب علیہ الرحمہ مصنف بہار شریعت کی بارگاہ میں آٹھ دس روز مہمان رہا اور اس کے بہت دنوں کے بعد حضرت صدر العلما علیہ الرحمہ کے وہاں پر حاضری کا اتفاق پڑا۔اوران کے دستر خوان نعمت کو بھی میں نے دیکھا بلکہ برتا۔مجھ کو تو دونوں جگہ یکساں اہتمام وانتظام نظر آیا۔بقول کسی شاعر

وہی عظمت وہی شوکت وہی شان دلاویزی

حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمۃ والرضوان کے دستر خوان پر مختلف قسم کے کھانے ہوتے، گوشت، مچھلی، سبزی وغیرہ۔روٹی چاول، دال، سلاد، وچٹنی وغیرہ سبھی کچھ عمدہ اور لذیذ بنا ہوا ہوتا۔اور آپ اپنے مہمان کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاتے، اگر کوئی دوسرا بلا اجازت آپ کے مہمان کو اپنے یہاں لیجاتا اور کھانا کھلا دیتا تو کھانے اور کھلانے والے میں سے کسی کی بھی خیر نہیں ہوتی۔دونوں سے سختی سے باز پرس فرماتے کہ تم گئے کیوں اور آپ نے

میری بغیر اجازت کے انکو کھلایا کیوں۔

ایک روز افطار کے وقت مسجد میں ہی آپ کی افطاری آئی۔ میں بھی اس وقت خدمت میں حاضر تھا۔ ساتھ میں بٹھالیا، متعدد پیالوں میں کچھ نہ کچھ تھا، ہریرہ صرف ایک پیالی میں تھا۔ اس میں سے تھوڑا پی کر مجھے دیا اور باصرار پلایا۔ کتابوں میں بزرگوں کے جوٹھے کے متعلق بہت کچھ پڑھا تھا۔ اب بھی آپ کا یہ الطاف کریمانہ جب یاد آتا ہے تو بے حد ذوق محسوس کرتا ہوں۔

حضرت صدر العلما کے بھی دستر خوان کا یہی حال تھا، دونوں وقت نہایت عمدہ بکرے کا گوشت غالبًا اصلی گھی میں بنا ہوا کبھی اس کے ساتھ پچھمی علاقہ کی دال پھریری۔ اور اس علاقہ کے لوگ خوشکہ چاول نہیں کھاتے، اسی لیے دستر خوان پر جب بھی چاول آتا تو نمکین پلاؤ یا میٹھا زردہ۔

سالن سامنے آتے ہی انگاروں پر خوب سینکی ہوئی روٹیاں اتنے ہی مقدار میں جتنے لوگ دستر خوان پر ہوں، ایک ایک سب کے سامنے رکھ دی جاتی، اور ان روٹیوں کے ختم ہوتے ہی ویسی ہی تازہ دم روٹیاں پھر آتیں۔ جب تک کھاتے رہتے بچوں کی دوڑ لگی رہتی۔ اس پر حضرت مولانا علیہ الرحمہ کا یہ حال کہ جب لقمہ اٹھا کر منھ کے قریب لیجاتے تو زبان پر الحمد للہ، سبحان اللہ کا نعرہ ہوتا تب لقمہ منھ میں رکھتے، اور ہم حیران کے خود کھا کر اتنا خوش ہو رہے ہیں۔ یا ہم کو کھلا کر اور حق یہ کہ دونوں ہی باتیں تھیں۔

دل کو تھاما ان کا دامن تھام کے　　　میرے دونوں ہاتھ نکلے کام کے

حساب جو جو بخشش سو سو:

یہ محاورہ مزاح نگاہ فرحت اللہ بیگ نے اپنے استاذ نصیر احمد کے سلسلہ میں لکھا ہے۔ کہ انہوں نے مختلف دو کانداروں کو منافع کے جز حصہ پر اپنی رقم دے رکھی تھی اور روزانہ شام کو باری باری ضرور پہنچتے اور بکری پر قبضہ کر کے حساب کرتے اور کہتے جاتے کہ

بھائی ''حساب جو جو بخشش سو سو'' پھر اپنا ایک جملہ ان پر چست کیا کہ ہم ڈپٹی صاحب کے حساب جو جو کا مشاہدہ تو روز ہی کرتے رہے۔ لیکن سو سو تو کیا کبھی سو پیسے بھی بخشش کرتے نہیں دیکھا۔

حضرت مولانا صدر العلما رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ میں بحمدہ تعالیٰ دونوں ہی باتیں بدرجہ کمال پائی جاتی تھیں۔ جن کا اجتماع اعلیٰ درجہ کی خصلتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

حساب کتاب کا یہ عالم تھا کہ جب مبارکپور سنی دارالاشاعت سے پہلی بار فتاویٰ رضویہ جلد سوئم شائع ہوئی تو نہ اس کی جلد بندی کرائی گئی تھی اور نہ سلائی۔ حضرت چوں کہ کتابوں کا کاروبار کرتے تھے۔ جس کا نام سمنانی کتب خانہ تھا۔ الحمدللہ یہ کتب خانہ خود کفیل بلکہ منافع بخش تھا۔ حضرت نے اپنی بہت سی مطبوعات اور اعلیٰ حضرت وغیرہ علما کی مطبوعات اسی سے شائع کی تھیں۔ اس لیے آپ نے فتاویٰ رضویہ جلد سوم کا آرڈر کیا۔ کتابیں مقررہ ھدیہ پر ان کی خدمت میں روانہ کردی گئیں، قیمت کی ادائیگی پر آپ نے فرمایا: آج کل یہی اصول رائج ہے کہ غیر مجلد کتابیں بھی سلا کر بھیجی جاتی ہیں۔ اور تم لوگوں نے بغیر سلی ہوئی بھیج دی۔ اس کام میں ہمارے پچاس پیسے فی جلد خرچ ہوئے۔ اس لیے معینہ دام سے مجموعی جلدوں کے پیسے اسی حساب سے کم کرکے دیئے جائیں گے۔ ادارہ سنی دارالاشاعت نے حضرت کے اصرار پر آپ کی حسب منشا حساب کردیا۔

یہ ہے آپ کا حساب جو۔ جو۔ مولوی رحمت اللہ صاحب کا ذکر آیا تو انہوں نے بھی آپ سے اس کی تصدیق کی کہ حضرت معاملات کے حساب کتاب میں نہایت سخت تھے، طالب علم بھی آپ سے کتاب خریدنے جاتا تو ایک ہی دام بتاتے، کچھ کم کرنے کے لیے کہتا تو فرماتے کہ ایک پیسہ کم نہیں ہوگا جتنا بتادیا لینا ہو تو لو اور کم کرانا ہو تو کتاب رکھدو اور جاؤ اس معاملے میں خود کچھ لینا ہو تو اپنی رعایت بھی نہیں کرتے تھے۔

ایک دفع میں خدمت میں حاضر ہوا تو اپنے کسی فرزند کے بارے میں فرمایا، میرا لڑکا یہاں تو پڑھ نہیں سکا، تم اسے اشرفیہ لیجاؤ؛ چناں چہ وہ اشرفیہ آگئے، آپ نے مجھے کچھ

پیسے دیے کہ ان کی ضرورت پر پوچھ تاچھ کرنا، سب ایک دفع مت دے دینا، اتفاقاً چند مہینوں کے بعد اپنی عادت کے موافق وہ کہیں چلے گئے اور جو تھوڑا پیسہ میرے پاس بچا تھا وہ بھی چھوڑ گئے، اس کے بعد جب میری ملاقات حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے ہوئی تو میں نے واقعہ عرض کیا اور ان کے چھوڑے ہوئے پیسے واپس کرنا چاہا، تو میری ہزار کوشش کے بعد بھی قبول نہیں کیا، اور فرمایا میں نے یہ پیسے اسے دے دئے تھے، تم سے ملاقات ہو تو معاملہ کر لینا میں اسے واپس نہیں لے سکتا۔ میں اس کو بھی آپ کی اسی درجہ اصول پرستی میں شمار کرتا ہوں کہ جو رقم اپنے حساب سے الگ کر دی اسے واپس لینے کے روادار نہیں۔

اور اب بخشش سوسوا اور آپ کی فیاضی کے بھی چند واقعات سماعت فرمائیں۔ مولوی رحمت اللہ صاحب نے فرمایا کہ حضرت صدر صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ طلبا پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور جن کو ضرورت مند سمجھتے تھے وقتاً فوقتاً علی الاعلان اور لوگوں کو بتائے بغیر بھی برابر مدد کرتے رہتے تھے۔ یہ آپ کی عادت کریمہ کا کس درجہ دل چسپ منظر ہے کہ ابھی جس طالب علم کے لیے کتاب کی قیمت میں چند پیسوں کی رعایت کرنے سے؟ لاتو کی عیلک؟ اللہ کی راہ میں مدد کرتے وقت حساب اور بندش مت کرو ورنہ تمہارے اوپر بندش کر دی جائے گی۔

مہمان نوازی اور عنایت کریمانہ کا ذکر تو آپ پڑھ آئے ہیں، حضرت مولانا عاشق الرحمٰن صاحب قبلہ نے آپ کی اس خصلت مبارکہ کا مفصل ذکر کیا ہے کہ آپ کی یہ عادت شریفہ بھی تھی کہ مہمان کو رخصت کرتے وقت میرٹھ کی مشہور مصنوعات کا تحفہ بھی عنایت فرماتے تھے۔

آپ برف بہت پسند کرتے تھے، گرمیوں میں برف کی ڈلی منھ میں رکھ کر چوستے رہتے، آپ کے استاذ گرامی حضرت صدر الشریعہ کو بھی ہر موسم میں ٹھنڈا پانی بڑا مرغوب تھا۔ جس وقت کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت مبارکپور میں برف کم یاب تھی، حضرت

تشریف لائیں تو ٹھنڈے پانی کی فرمائش ضرور کریں۔ ایک مسجد کے کوئیں کا پانی نسبتاً ٹھنڈا تھا، اسی کا پانی منگوائیں اور کورے گھڑے میں رکھوائیں اور اسی کو استعمال کریں اور جاڑے کے موسم میں بھی آپ ٹھنڈا پانی بڑے شوق سے پیتے۔ آپ کے صاحبزادے حضرت مولانا قاری رضاء المصطفیٰ صاحب قبلہ کی روایت ہے کہ ابا جی اکثر فرماتے، لوگ اللہ تعالیٰ کے احسان کی ناقدری کرتے ہیں، اللہ ٹھنڈا پانی عطا فرماتا ہے اور لوگ اس سے بھاگتے ہیں۔

کیا خوب؟ قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

(وصال حضور حافظ ملت)

یکم جمادی الآخرہ ۱۳۹۶ھ روز دوشنبہ دن گزار کر شب میں لگ بھگ ۱۲ر بجے حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ بانی الجامعۃ الاشرفیہ لاکھوں عقیدت مندوں کو سوگوار چھوڑ کر واصل بحق ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مبارک پور میں آپ کی تشریف آوری آج سے بیالیس سال قبل ۲۹ر شوال ۱۳۵۲ھ کو ہوئی، یہ پوری مدت آپ نے کلیۃً مبارک پور میں گزار دی۔ وطن مالوف بھی آپ صرف چند یوم مہمانوں کی طرح رہتے۔ ایک سال کی مدت (جب آپ ناگ پور تشریف لے گئے) وضع کر دی جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مبارک پور میں آپ نے ایک طویل چلہ فرمایا، دنوں کا نہیں، ہفتوں اور مہینوں کا بھی نہیں بلکہ سالوں کا، کامل چالیس سال جو ایک انسان کے شعور کی تکمیل کے لیے فطری مدت ہے!

اس زہرہ گداز اور صبر آزما مجاہدہ کا ثمر یہ برآمد ہوا کہ:

☆ اشرفیہ جو اس وقت ایک معمولی مدرسہ تھا بڑھ کر دار العلوم بلکہ کلیہ اور جامعہ ہو گیا۔

☆ مدرسہ میں اس وقت ابتدائی عربی کے صرف دو طالب علم تھے اور اب تین سو، اور پورے طلبا کی تعداد لگ بھگ آٹھ سو ہے۔

☆ مدرسہ کا بجٹ اس وقت صرف دو ہزار روپے تھا اور اب دو لاکھ روپے سے بھی زائد ہو چکا ہے۔

☆ تعلیم اس وقت میزان و منشعب تک تھی اور اب بیسیوں علوم وفنون کی

ڈگریاں ہر سال تقسیم ہوتی ہیں۔

☆ تب دستار بندی کا جلسہ شاید ہی ہوتا رہا ہوا، اب یہ عالم ہے کہ اس سال کا آخر شمارۂ فراغت ۱۲۸۷ ہے۔

☆ مدرسہ اشرفیہ کو اس وقت ضلع میں بھی کم لوگ جانتے رہے ہوں گے۔ لیکن آج نہ صرف "مدرسہ" بلکہ مبارک پور کو بھی حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ نے اتنا اونچا اتنا روشن کر دیا ہے کہ پورے ہندوستان میں جہاں سے چاہیں ہلال عید کی طرح اس کا نظارہ کر سکتے ہیں اور گوش حقیقت نیوش سے اس کا آوازہ حق سن سکتے ہیں۔

ہزارہا علما، خطبا، شعرا، مناظر۔ محقق۔ مدرس۔ اصحاب قلم، اہل ارشاد وہدایت آپ کی خاک قدم سے اٹھے۔

ہندوستان کے افق پر بادل بن کر چھا گئے۔ کتنے ادارے، کتنے دار العلوم، کتنی خانقاہیں آپ کی نفس قدس سے حیات کی گرمی پاتے رہے۔

یکم جمادی الآخرہ کی شب میں ۱۲ ربجے یک بیک ساری محفلیں اجڑ گئیں، ادارے ویران ہو گئے، علمی ودینی مراکز اندوہ والم سے سیہ پوش نظر آنے لگے، کتنے دینی ودنیوی تمدنی واخلاقی روحانی وعلمی فضائل وکمالات کے دروازے سونے پڑ گئے۔

پورے ہند وپاک میں آپ کے وصال کی بازگشت سنائی دی اور اخبارات وریڈیو نے بھی اس حادثہ جانکاہ کی خبر شائع کی۔

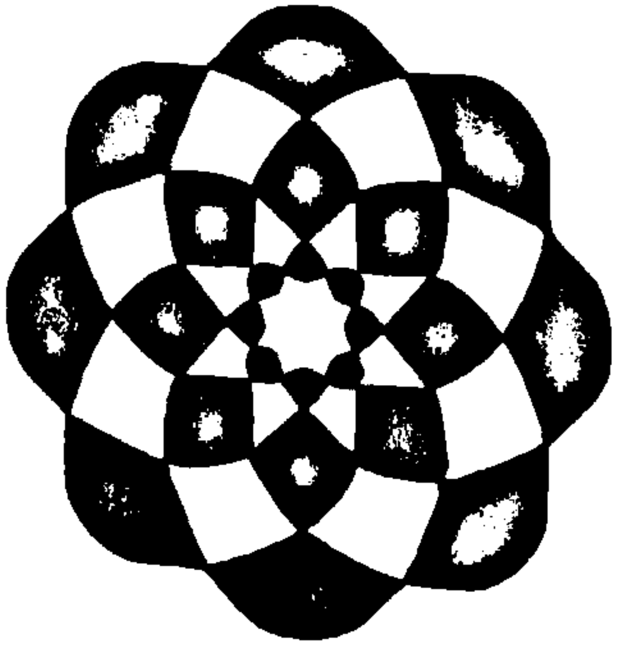
آج ہزاروں مرید اپنے پیر کے لیے رو رہے ہیں۔ شاگرد اپنے استاذ کے غم میں اشکبار ہیں۔ بیمار اپنے طبیب روحانی کی جدائی میں دلفگار ہیں، سائل استفتا لیے بھٹک رہے ہیں۔ اور کتنے مفتی رہنمائی اور عقدہ کشائی کے انتظار میں حضرت کی خالی نشست گاہ کو حسرت سے تک رہے ہیں۔ آہ! صد آہ! کہ ادارے بانی کو رو رہے ہیں۔ مدارس سرپرست کی مفارقت میں المناک ہیں۔ خانقاہیں ایک مرشد باصفا کا ماتم منا رہی ہیں۔ دردمند چارہ گر کی جدائی پر اشک آلود ہیں۔ زمانے کے ستائے ایک تسکین وہ کے لیے تڑپ رہے ہیں'

مجبور و لاچار حامی و معین کے فقدان پر نالہ کناں ہیں، وہ تھے تو کیا کیا تھا۔ اور اب نہیں ہیں تو کیا ہے۔

نظر جب ان سے ملی بس رہا تھا ایک جہاں
پھری نگاہ تو چاروں طرف تھے ویرانے

لیکن اس بھری دنیا میں الجامعۃ الاشرفیہ کیا کرے اور کس کس کو روئے۔ اس کا تو دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ لٹ گیا۔ حضور حافظ ملت تو اس کے بانی بھی تھے اور منتظم کار بھی، سربراہ تھے اور چارہ گر بھی۔ رات کو تنہائیوں میں اس کے لیے گڑگڑا، گڑگڑا کر دعا کرتے تھے اور دن کے اجالے میں اپنی دوا علاج سے بے فکر، اس کی چارہ گری میں خون جگر جلاتے اور سچ مچ آپ نے اپنے کو گھلا کر اشرفیہ کا یہ روپ نکھارا ہے۔ اس لیے اشرفیہ کے حق میں آپ کی جدائی قیامت سے کم نہیں۔

جاتے ہوئے کہتے ہیں قیامت کو ملیں گے
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور



انمول موتی

(حضور حافظ ملت کے اقوال حکیمانہ)

مرشد برحق آقائے نعمت حضور حافظ ملت قدس سرہ العزیز کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار علمی، عملی، اخلاقی، روحانی اعلیٰ درجہ کی خوبیوں سے آراستہ فرمایا تھا، اور محاسن وہبی وکسبی ذاتی اور عرضی سے مزین کیا تھا، انہیں خوبیوں میں ایک خوبی یہ تھی کہ قدیم صوفیا اور حکما اور اخلاقیین کی طرح آپ کی زبان فیض ترجمان سے بھی موقع بموقع ایسے کلمات صادر ہوئے ہیں جو ضرب المثل بنائے جانے کے لائق ہیں، اور ان میں اختصار اور ایجاز کے ساتھ معانی وحکم کے سمندر موجزن ہیں، جن میں کسی نہ کسی قسم کی علمی یا لسانی طرفہ گی ہے، اور لطافت حکمت ضرور پائی جاتی ہے، زندگی کے کسی اہم مسئلہ پر پر لطف انداز میں رہنمائی اور ہدایت موجود ہے۔

اس مختصر مضمون میں ہم آپ کے چند ایسے ہی کلمات مواقع استعمال کے ساتھ تحریر کرتے ہیں اور جن لوگوں کو بھی آپ کے فیض صحبت سے حصہ ملا ہے، اگر کوشش کر کے آپ کے ایسے فیض آثار جملے جمع کر دیں تو حکم وامثال کا ایک بہتر مجموعہ قوم کی نگاہ میں آجائے۔

ضلع دیوریا کے مشہور قصبہ لار سے قریب ایک موضع جمسڑا نام کا ہے، اسی موضع کے مخیر اور دین دار رئیس جناب مقبول احمد انصاری، جن کا بہت بڑا کاروبار بر جونالہ کلکتہ میں ہے، اور جو اپنی دولت کا معتد بہ حصہ مذہب حق اہل سنت وجماعت کی نشر واشاعت واعانت ونصرت میں صرف کرتے ہیں، کلکتہ کے اسی علاقہ میں شمع نیازی نام کے ایک جاہل نے اناپ شناپ بکواس لکھ کر شائع کی، اور کچھ جاہل مسلمان اس کے فیور میں آگئے، یہ فتنہ اس قرب وجوار میں بڑا شدید ہو گیا تھا، اس کے خلاف تحریر، تدبیر، ہر طرح کی موثر جد

وجہد اور اس کے فروکرنے کا سہرا بڑی حد تک مقبول صاحب کے سر ہے، سنیت کے عاشق اور رضویت کے شیدائی ہیں۔

حضور حافظ ملت کے نام، کام اور ان کی ذات سے مقبول صاحب بے حد متاثر ہیں، اور مبارک پور میں سنیت کے لیے جو کام ہو رہا ہے، اس کے بے حد مداح اور معاون بھی ہیں، انہی مقبول صاحب نے ایک اجنبی جگہ کارخانہ لگایا، جس میں کافی سرمایہ خرچ کیا، مگر کلکتہ میں مصروفیت ہونے کی وجہ سے خود وہ وقت نہ دے سکے، اور منیجران کو قاعدہ کا کوئی مل نہ سکا، کارخانہ گھاٹے سے ہی چلتا رہا، آخر تلاش بسیار کے بعد ایک ایسے شخص کو انہوں نے منتخب کیا جو سنی صحیح العقیدہ اور ایک عالم دین کا لڑکا اور خود بھی کافی دینی معلومات رکھتا تھا، مقبول صاحب بے حد مسرور تھے کہ اب کارخانہ کما حقہ فائدہ دینے لگے گا، مگر سال دو سال کے بعد جب حساب ہوا، حسب سابق پھر کئی ہزار کا نقصان ہوا۔

حساب کے فوراً ہی بعد انصاری صاحب حضور حافظ ملت کی بارگاہ میں حاضر ہوئے، انہیں سخت تعجب تھا کہ ایک دین دار گھرانے کا فرد، اور سنی عالم بھی ایسا فراڈ کر سکتا ہے، حضور حافظ ملت کی بارگاہ میں وہ اسی مسئلہ پر بار بار اظہار تعجب کر رہے تھے اور بار بار ان کی زبان سے اسی قسم کے جملے ادا ہو رہے تھے، حضور میں نہیں سمجھ رہا تھا کہ ہمارے ''ہم مذہب'' ہو کر ایسا کریں گے، حضرت میں کہتا ہوں: یہ میرے ساتھ ایسا کرتے ذرا خدا سے نہیں ڈرے۔

حضرت حافظ ملت علیہ الرحمہ خاموش سنتے رہے جب بار بار انہوں نے ''ہم مذہب'' کا لفظ دہرایا، تو آپ نے فرمایا ''انصاری صاب'' آج کل آدمی ہم مطلب پہلے ہوتا ہے، اور ہم مذہب بعد میں'' آپ کو اس قدر حیرت کیوں ہے۔

سیٹھ صاحب پر اس جملہ کا جو اثر ہوا ہو، لیکن میرا یہ حال ہے کہ جب جب اس کی یاد آتی ہے، لطف ولذت سے ہوش وگوش کے ساتھ ساتھ دل ودماغ بھی سرشار ہو جاتے ہیں۔

کلمہ ”ہم مطلب“ کو مطلبی اور خود غرض کے معنی میں میرے کانوں نے زندگی میں پہلی مرتبہ سنا، اور عجب نہیں اردو زبان میں پہلی دفعہ یہ لفظ اس معنی میں استعمال بھی کیا گیا ہو، لیکن موزونیت اور برجستگی کا یہ عالم ہے کہ زبان کے پورے ذخیرہ میں اس موقع پر اس معنی کو ادا کرنے کے لیے شاید اس سے زیادہ موزوں کوئی لفظ ملے، مخاطب کے کلام کو اس کے مراد کے خلاف طریق استعمال میں ادنیٰ تغیر کر کے پلٹ دینا معانی و بلاغت کی انوکھی دستکاری ہے۔

حجاج ابن یوسف ثقفی کے دربار میں عرب کا مشہور فصیح اور شاعر ورئیس قبعثری پکڑ کر لایا گیا، حجاج نے اس کو دھمکاتے ہوئے کہا:

”لأحملنك على الا دهم“

میں تم کو ”ادہم (بیڑی) پر سوار کروں گا۔

یعنی بیڑی پہناؤں گا، قبعثری نے جواب میں کہا: نعم مثل الا میر يحمل على الا دهم والاشهب“

ہاں امیر سیاہ اور سفید گھوڑوں پر سوار کر سکتا ہے۔

یہاں شاعر نے ”ادہم“ کے ساتھ ”اشہب“ کا لفظ زیادہ کر کے ”ادہم“ کے لفظ ”بیڑی“ کے بجائے سواری اور گھوڑے کے معنی میں متعین کر دیا۔

حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے مذکورہ بالا جملہ میں اسی نوع کی لگ بھگ ایک لطیف سی صنعت کارفرما ہے کہ مقبول صاحب کے کلام میں صرف دو لفظ کے ردوبدل سے اس جملہ کو ایک بالکل نیا معنی دے دیا، اور بولنے والے کے حیرت و استعجاب کا ازالہ فرما دیا، بلکہ قبعثری نے تو ایک زائد لفظ کا پیوند لگا کر لفظ ادہم کو دوسرے معنی (سواری) میں لیا، اور یہاں ایک ادنیٰ تغیر سے ہی وہ کام لے لیا ہے، کہ: جملہ کا ساز و آہنگ تک تبدیل نہیں ہوا ہے، پھر یہ جملہ ایجاز و ابلاغ کی ایک اعلیٰ مثال ہے اور اپنے چھوٹے سے دامن میں ایک دریائے معانی سمیٹے ہوئے ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ مذہب کو تمام علائق و اسباب پر تفوق

حاصل ہونا چاہیے، اور خود غرضی تو فی نفسہ ایک عیب ہے، عام انسانوں کے ساتھ بھی یہ عقلاً و اخلاقاً بے حد بری اور معائب قبیحہ میں شمار ہوتی ہے، چہ جائے کہ اپنے عزیز قریب کے ساتھ خود غرضی برتی جائے اور اس سے بری بات یہ ہے کہ اپنے مذہبی بھائی کے اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھا کر فریب دیا جائے اور اس کے حسن ظن کو تہ و بالا کیا جائے، کچھ اپنے فائدہ کے لیے اس کو نقصان پہونچایا جائے، یہ مذہب پرستی نہیں بلکہ مذہب سے بغاوت ہے۔

لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ یہی قبیح و ناسزا فعل آج ہر آدمی کا شعار بنا ہوا ہے، مستثنیات کو چھوڑ کر کون ہے؟ جو خود غرضی سے دامن بچا سکا، حضور حافظ ملت کا یہ مختصر جملہ آج کل آدمی ہم مطلب پہلے ہوتا ہے، اور ہم مذہب بعد میں" ان پورے مطالب کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، اور حسن ادا اور طرز کلام کی ندرت اس پر مستزاد ہے پھر آپ چاہیں تو اس بلیغ جملے کو آج کی رستی ہوئی سوسائٹی کے زخم پر ایک بھر پور نشتر اور موجودہ معاشرہ پر ایک چبھتا ہوا طنز بھی قرار دے سکتے ہیں۔ (راوی قاری محمد یحییٰ ناظم الجامعۃ الاشرفیہ)

(۲) اتفاق زندگی ہے اور اختلاف موت ہے۔

یہ جملہ آپ نے اپنے وعظ و تذکیر اور ہدایت و ارشاد کی مجالس میں بے شمار مرتبہ ارشاد فرمایا جس کے سننے والے بے شمار ہیں، بلکہ اسی جملہ کے علوم و معارف نے مولوی قمر الزماں خاں صاحب خطیب شہیر، کو ایک نہایت عظیم تقریر کی تیاری کے لیے روشنی عطا کی، جس کا عنوان ہے "موت" اس جملہ کی مزید تشریح بھی آپ خود حافظ ملت کی زبان سے سنیے، وہ فرماتے ہیں، موت اور زندگی میں کیا فرق ہے؟ مطلب یہ کہ ایک اچھا بھلا آدمی دیکھتے ہی دیکھتے لقمۂ اجل بن گیا، وہ تمہارا کتنا ہی عزیز دل آرام اور قریب ہی کیوں نہ ہو اب اس لائق نہیں کہ دو دن بھی اس کو اپنے پاس رکھ سکو، اس پر جان چھڑکنے والے بھی جلد از جلد اس کو اپنے سے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن کبھی تم نے غور کیا کہ آدمی میں مرتی کیا چیز ہے؟ کیا جسم مرتا ہے؟ نہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں، جسم کا ہر عضو اپنی جگہ ویسا ہی

ہے، جیسا زندگی میں تھا، نہ کان میں خرابی ہوئی نہ آنکھ میں نقصان آیا، نہ ہاتھ پاؤں ٹوٹے نہ دیگر اعضا میں شکست وریخت ہوا، تو جسم کہاں مرا، موت سے جسم میں کون سا تغیر آیا کہ کہا جائے کہ جسم پر موت طاری ہوئی، رہ گئی روح تو روح کے بارے میں مسلم ہی نہیں غیر مسلموں کا بھی یہی خیال ہے کہ روح امر ہے اور روح زندہ رہتی ہے، پس جب آدمی کے ان دونوں حصوں میں سے کوئی مرا نہیں تو موت کس پر طاری ہوئی؟ بات دراصل یہ ہے کہ جب تک جسم کے ساتھ روح کا تعلق قائم رہتا ہے، یا یوں کہیے کہ روح و بدن میں اتفاق رہتا ہے، آدمی زندہ رہتا ہے، اور جب یہ تعلق ختم ہو جاتا ہے، ساتھ چھوٹ جاتا ہے، جسم و روح الگ الگ ہو جاتے ہیں، اور دونوں میں اختلاف ہو جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ آدمی مر گیا، پس کیا یہ حقیقت نہ ہوئی کہ جسم و روح کا اتفاق زندگی ہے اور اختلاف موت ہے۔

پس اس طرح دنیا کی ہر چیز میں اتفاق زندگی ہے اور اختلاف موت ہے، جس گھر کے سب افراد باہم متحد ہوں اور جس گھر کے افراد میں اختلاف و شقاق ہے وہ گھر وہ ہے کہ ایک محلہ کے لوگ باہم اتفاق و اتحاد سے رہ رہے ہوں تو وہ محلہ زندہ ہے اور اگر اختلاف ہو کہ یہ اس کی پگڑی اچھال رہا ہے اور وہ اس کی ٹانگ گھسیٹ رہا ہے، پس یہ اختلاف ہی اس محلہ کی موت ہے، یہی حال شہر کا ہے، ملک کا ہے، اور قوم وملت کا ہے، وہ ملک زندہ ہے جس کے باشندوں میں اتفاق ہے، اور وہ ملک جلد ہی ختم ہو جاتے ہیں جس کے باسیوں میں خانہ جنگی ہو، وہ قوم زندہ قوم ہے جس کے افراد میں باہم ہمدردی غم گساری اور اتحاد آرا وخیال ہے اور وہ قوم زندہ رہ کر مردوں سے بدتر ہے جس کے افراد میں خود غرضی نفس پرستی اور دوسرے بھائی کی ترقی دیکھ کر بغض وحسد کی آگ میں جلنا پایا جائے، نفاق وافتراق کی شناعت اور اتفاق واتحاد کی فضیلت پر آج تک نہ جانے کتنا کہا گیا اور نہ جانے کیا کچھ لکھا جا چکا ہے، میں یہ تو نہیں کہہ سکتا ہے کہ اس سے زیادہ عمدہ کسی نے نہیں کہا ہوگا، لیکن ایجاز وابلاغ، جامعیت ووسعت، حسن ادا، حسن مبالغہ میں یہ جملہ بلاغت کی انتہائی سرحدوں کو چھو رہا ہے، اور اپنی مثال آپ ہے، اتفاق ویک جہتی کی تعبیر قوت وتوانائی کے سرچشمہ سے

بھی کی جاتی ہے، اتحاد و وداد کو شان و شکوہ اور شوکت و حشمت کا نام بھی دیا جاتا ہے، اور سچ پوچھئے تو خواب جوانی کی طرح اس کی تعبیریں ہیں بھی بہت۔

لیکن غور سے دیکھئے تو مذکورہ بالا اسالیب بیان حقیقت کے چہرے کا کوئی ایک روپ ہی بے نقاب کرتے ہیں، اور اتحاد و اتفاق کے بے شمار فوائد میں سے کسی ایک فائدے کی ہی نشاندہی کرتے ہیں، اس کے برخلاف مذکورۃ الصدر جملہ میں اتفاق زندگی اور اختلاف کو موت کہہ کر مجاز و مبالغہ کا ایک دلکش امتزاج پیش کیا جارہا ہے، پھر تشبیہ کی گہرائیوں میں اترے تو زندگی کی گوناگوں وسعتوں میں تیرتے چلے جائیے، سب آپ کو اتفاق کے جلوے اور محبت کی رعنائیوں کے مظہر ملیں گے۔

پھر لطف یہ ہے کہ استعارہ کا یہ نادر کار نمونہ اپنی وسعتوں میں اس درجہ پہنا ور ہے کہ خود حقیقت بھی اس کا ایک فرد بن گئی ہے، کیوں کہ اتفاق جس کو مجازاً زندگی کہا گیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اتفاق ہی کی ایک فرد ہے، اور موت اختلاف کی، الغرض آپ جتنا غور کریں حسن معنی اور اسلوب بیان کے جلوے نکھرتے چلے جائیں گے۔

ہزار کام لیا ہم نے خوش بیانی سے
جمال یار کی رعنائیاں ادا نہ ہوئیں

۲۔ امامت کوئی کام ہے؟ نماز تو پڑھنا ہی ہے۔
"پھر کیا سب سے آگے کھڑا ہونا کیا پیچھے کھڑا ہونا"۔

یہ جملہ حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ نے ہمارے ایک نہایت دل چسپ رفیق اور سعدی علیہ الرحمہ کی زبان میں یار شاطر نہ بار خاطر، حضرت مولانا الحاج حافظ قاری رحمت اللہ صاحب زید مجدہم سے فرمایا تھا۔

حافظ صاحب موصوف گورے چٹے بھاری بھرکم وجیہ و پر وقار مردانہ حسن کا ایک کامل نمونہ ہیں۔ ایک دفعہ ہماری کمشنری کے حاکم اعلیٰ اشرفیہ کے معائنہ کے لیے تشریف لائے، اشرفیہ میں طلبا کی لائبریری اس زمانہ میں بھی ہر چند کہ مختصر تھی مگر دیکھنے کی چیز تھی،

کمشنر صاحب کی وجہ سے ذرا اہتمام خصوصی ہو گیا تھا، پوری لائبریری عمدہ قسم کے قالینوں سے مزین تھی، اور چھوٹے سے کمرے میں تیز پاور کے کئی گلوب جس سے غیر معمولی چکا چوند پیدا ہو گئی تھی، اور پورا کمرہ جگمگ جگمگ کر رہا تھا، طے یہ تھا کہ قاری رحمت اللہ صاحب کو لائبریری کی کرسی پر بٹھا دیا جائے گا، اور کتابوں کی نمائش اور لوگوں سے تعارف کا فریضہ میں ادا کروں گا، میں اس موقع پر چند سکنڈ کی تاخیر سے پہونچا، کمشنر صاحب آچکے تھے۔

میں کیا عرض کروں بالکل سامنے کرسی پر قاری صاحب موصوف الصدر تشریف فر ما تھے، لیکن میں پہچان نہ سکا، خیال ہوا کہ یہی کمشنر صاحب ہیں کیا، پھر فوراہی ازالہ ہوا، ارے یہ تو قاری صاحب ہیں، کالی شیروانی سیاہ ٹوپی، مجسمہ کے مثل ساکت وصامت، ایک حسین وجمیل فانوس کی طرح وہ بھی دمک رہے تھے اور کمرہ کے رنگ ونور کا ایک جز معلوم ہو رہے تھے۔

حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ نے ان کی شخصیت سے متعلق بھی ایک لا ثانی جملہ ارشاد فرمایا ہے۔ ما شاء اللہ ہمارے قاری رحمت اللہ صاحب کسی بڑی سے بڑی کانفرنس میں بھی پگڑی باندھ کر عبا پہن کر، کرسی پر بیٹھ جائیں، اور بالکل خاموش رہیں کچھ نہ بولیں، تب بھی عوام محسوس کریں گے بڑی شاندار تقریر ہو رہی ہے۔

ایک دفعہ ان کو ٹاٹا نگر برما مائنش کی عظیم ووسیع مسجد کی محراب میں نماز پڑھاتے دیکھا تو فرمایا کہ، الحمد للہ امام ایسا ہی ہونا چاہیے، قاری صاحب مصلے پر کھڑے ہوتے ہیں محراب بھر جاتی ہے، اور مصلیٰ پر رونق ہو جاتا ہے۔

خود ہمارے قاری صاحب بھی برجستگی اور بدیہہ گوئی میں لاجواب ہیں، کسی موقع پر جب بھی آدمی کو شان وگمان بھی نہ ہو، یک بیک ان کی زبان سے ایک ایسا جملہ سرزد ہو جاتا ہے کہ لوگ سر دھننے لگتے ہیں، اور یہ اپنی اس خوبی سے بے خبر بچوں کی طرح خوش ہو کر ایک ایک کا منہ تکتے ہیں کہ کیا میں نے کوئی بڑی اچھی بات کہدی کیا؟ ایک دفعہ تلشی پور ضلع

گونڈہ کے دوران قیام میں ہم لوگ ساتھ ہی کہیں جارہے تھے، ایک نہایت تندرست اور کم عمر گائے کو دیکھ کر آپ فرماتے ہیں: مولانا اس گائے کو دیکھئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پٹک دو تو پھوٹ جائے گی۔ الغرض مولانا صاحب موصوف عجیب باغ و بہار اور رونق محفل قسم کے آدمی ہیں، اب تو مدتوں سے وہ علاحدہ ہو گئے ہیں، لیکن جب تک ساتھ رہے، ہر دم مسرتوں کے چراغ جلاتے رہے، اللہ تعالیٰ ان کو خوش وخرم رکھے۔

تو یہی حافظ صاحب ہیں جس زمانہ میں اشرفیہ کے درجہ حفظ قرأت کے سربراہ تھے، ٹانا ٹانگر سے ان کے لیے امامت وخطابت کے لیے بڑا زور ہوا۔

مسجد کی خطابت وامامت اور ملازمت ایک ایسا مشغلہ ہے کہ نئے تعلیم یافتہ حضرات تو اسی نام کو لے کر لوگوں کو دینی تعلیم سے عار دلاتے ہیں، مثلاً دینی تعلیم حاصل کر کے کیا ہوگا لڑکے کی عمر برباد ہوگی۔ دینی تعلیم میں بڑی ترقی ہوئی تو کسی مسجد کا ملا ہو جائے گا، زندگی بھر لوٹے چٹائی کا حساب اور لوگوں کی خیرات کی روٹیوں پر یلغار اور کیا حاصل ہے دینی تعلیم کا۔

نامناسب نہ ہوگا اگر اس سلسلہ میں الہ آباد کے مولوی عبد الکافی صاحب کے دو عدد مکالمے ذکر کر دیئے جائیں جو آپ نے نئی تعلیم کے ترجمان سے کیے۔

حضرت مجاہد ملت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ شہر الہ آباد میں کسی رئیس کے یہاں کوئی تقریب ہوئی جس میں صاحب خانہ نے جدید وقدیم دونوں ہی گروپ کے لوگوں کو بلا بھیجا۔

اس موقع پر پروفیسر امجد علی بھی آئے تھے جو اس عہد نیچریت کے اقانیم ثلاثہ میں سے ایک گردانے جاتے تھے۔

پروفیسر صاحب موصوف مولانا عبد الکافی صاحب کو ممکن ہے غائبانہ جانتے رہے ہوں لیکن ملاقات یا گفتگو کی نوبت اس سے قبل کبھی نہیں آئی تھی، ملاقات ہوئی تو تعارف میں مولانا نے یہ ذکر فرمایا کہ مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں بچوں کو دینی تعلیم دیتا ہوں، بس پھر کیا

تھا، پروفیسر صاحب چالو ہو گئے، اس تعلیم میں کیا فائدہ؟ قوم کا کیا بھلا ہوگا، آپ حضرات مسلمان قوم کو خراب وخستہ کررہے ہیں، مولانا خاموش سنتے رہے، جب پروفیسر صاحب اپنی تقریر ختم کر چکے تو آپ نے فرمایا: بات تو ٹھیک ہی ہے کہ آپ لوگوں کو نہ دین سے مطلب، نہ خدا اور سول سے غرض، تو آپ کو دینی تعلیم سے کیا فائدہ؟ اور کیا نسبت مگر صرف دو باتیں آپ لوگوں میں بھی ایسی ہیں ان کی خاطر ہم کو دینی تعلیم جاری رکھنا پڑ رہا ہے، ایک اسلامی نام رکھنا، دوسرے مرنے کے بعد اسلامی طریقہ پر کفن دفن کرنا، جس دن آپ لوگ یہ دونوں کام چھوڑ دیں گے، ہم بھی دینی مدارس بند کر دیں گے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قبلہ مدظلہ کا بیان ہے کہ یہ سن کر پروفیسر صاحب بالکل ہی خاموش ہو گئے اور کچھ بھی نہ بولے۔

ایک دفعہ اسی قسم کے ایک اور بزرگ سے مولانا کا سامنا ہوا، انہوں نے تعارف چاہا تو مولانا نے نام اور مقام کے بعد یہی جملہ ارشاد فرمایا کہ سبحانیہ میں بچوں کو دینی تعلیم بھی دیتا ہوں۔ اس پر انہوں نے اپنی دانست میں بھرپور طنز کیا، واقعی صاحب آپ حضرات کا ایثار، قربانی اور قناعت حیرت ناک اور قابل رشک ہے کہ دنیا پر لات مار کر آخرت کو اختیار کیا، مولانا نے نہایت سادگی اور بھولے پن سے ان کی طرف رخ کر کے فرمایا، نہیں صاحب ہم کو تو آپ حضرات کے ایثار اور قناعت پر حیرت ہے۔ غیر معمولی ایثار ہے آپ لو گوں کا، اس پر اپ ٹو ڈیٹ صاحب کے ساتھ تمام موجودہ حضرات کو سخت حیرت ہوئی اور بے ساختہ انہوں نے کہا وہ کیسے؟ آپ نے اس سادگی اور سنجیدگی سے فرمایا کہ یہی کہ آپ نے آخرت کو جو باقی ہے چھوڑ رکھا ہے۔ اور دنیا جو ختم ہونے والی ہے اس کو اختیار کر لیا ہے، آپ لوگ ہم سے بڑے قناعت پیشہ ہوئے یا نہیں، یہ سن کر ان کا حال بھی وہی ہوا کہ جیسے غبارے سے ہوا نکال دی گئی، الغرض دینی تعلیم اور نماز کی امامت جدیدئین کے نزدیک ایک بڑا گھناؤنا مسئلہ ہے۔ لیکن حیرت ناک بات یہ ہے کہ خود دینی تعلیم پانے والے بھی لوگ بھی امامت سے کچھ کم گریزاں نہیں ہیں، اور انہیں بھی اس ملازمت سے اس طرح

انقباض ہوتا ہے، جیسے جدت پرستوں کو، یہ اور بات ہے کہ ان کے تنفر کی وجہ کچھ اور ہے، ان کے خیال میں امامت کی ملازمت بے حد ذمہ داری، انتہائی مصروفیت اور غیر معمولی پابندی کا کام ہے، آدمی ایک طرح سے گرفتار ہو کر رہ جاتا ہے۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کو بھی برما مائنس کی امامت وخطابت سے اسی وجہ سے انقباض وانکار تھا، اور حضور حافظ ملت سے اسی سلسلہ میں کچھ عرض کیا کہ حضور اس میں بڑی پابندی اور نہایت مصروفیت ہے۔

اسی موقع پر حضرت نے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا: امامت بھی کوئی کام ہے، نماز تو پڑھنا ہی ہے پچھلی صف میں نہ کھڑے ہوئے اگلی میں کھڑے ہو گئے، آپ غور کریں تو اس مختصر سے جملہ میں پورا وعظ پوشیدہ ہے، یعنی امامت کے نام پر آدمی جس پابندی سے بھاگ رہا ہے کیا مقتدی بن کر اس سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ نہیں، اگر مسلمان ہے تو اسے نماز پڑھنا ہی ہے اور ہر وقت کی اس کے وقت پر پڑھنا ہے، ارشاد الٰہی ہے۔ "ان الصلوٰۃ کانت علی المؤمنین کتابا موقوتا" نماز اہل ایمان پر وقت در وقت فرض کی گئی ہے، پھر نماز پڑھنی ہے تو مسجد ہی میں پڑھنی ہے، ارشاد نبوی ہے: لا صلاۃ لجار المسجد الا في المسجد، مسجد کے پڑوسی کی نماز تو مسجد میں ہی ہوتی ہے، اور نماز وقت پر مسجد میں پڑھنے والا، اکیلا پڑھے تو نماز تو ہو ہی جائے گی، لیکن جیسی نماز کا مطالبہ ہے ویسی نہیں، بلکہ بسا اوقات تو ترک جماعت آدمی کو فاسق بنا دے گا، کہ بلا ضرورت جماعت چھوڑنا گناہ اور مکروہ ہے، جماعت شعار اسلام ہے، اگر کسی جگہ کے سبھی لوگ جماعت چھوڑ دیں تو ان سے جہاد کیا جائے گا، پس مسلمان ہے تو نماز، وقت اور جماعت اور جماعت و نماز مسجد میں، اب آپ غور فرمایئے کہ مقتدی بننے اور امام بننے میں کیا فرق رہا، سوائے اس کے کہ امام آگے مصلے پر کھڑا ہوتا ہے، اور مقتدی پیچھے، تو جس پابندی اور ذمہ داری کے احساس سے آپ گھبرا رہے ہیں وہ شرعا اور عقلاً آپ پر پہلے سے ہی عائد ہے اور اس صورت میں تو امامت کا مزید فائدہ ہوا کہ اس کے ذریعہ ایک اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ

ہوئے، اور تنخواہ منافع میں رہی، جو وقت کی پابندی کے عوض آپ کے لیے مباح ہوئی۔

مخاطب کے دماغ سے کسی چیز کی شدت کم کرنے کے لیے ایسا پیرایہ بیان اختیار کرنا، جس سے شے مذکور اپنی اصلی مقدار سے کم محسوس ہو، ایک محبوب اور مقبول اسلوب بیان ہے۔

ایک مہینہ تک مسلسل دن بھر کھانے پینے، خواہشات نفس سے رکنا ایک مشکل کام ہے، اللہ پاک جل جلالہ وعم نوالہ نے اہل اسلام کو اس کڑی محنت کا حکم دیا تو پیرایہ بیان حکم الٰہی کو دلوں سے کس درجہ قریب کرنے والا اختیار کیا گیا، ارشاد الٰہی "کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون ایاماً معدودات" تم پر روزہ اس طرح فرض کیا گیا جیسے اور امتوں پر فرض کیا گیا تھا۔

یہیں سے مخاطب کے ذہن پر ایک خوش گوار اثر مرتب ہوا، یہ کوئی ایسی محنت نہیں، جس میں ہم تنہا مبتلا کیے گئے ہوں، یہ تو ساری قوموں پر فرض تھا، بالفرض بلا بھی ہوتی تب بھی آسان ہوتی کہ "مرگ انبوہ جشنے دارد" آگے حکم الٰہی ہوتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ تم متقی ہو جاؤ گے، یعنی یہ اگر کچھ محنت کا کام ہے تو فائدہ بھی کتنا عظیم ہے کہ،

بقدر الکد تکتسب المعالی

ومن طلب العلی سہر اللیالیل

مشقت کے برابر ہی بلندی ملتی ہے، بلندی طلب کرنے والوں کو رات رات بھر جاگنا پڑتا ہے۔

یہ عظیم فائدہ دیکھ کر محنت خوب سستی معلوم ہونے لگتی ہے اور مشقت آسان ہو جاتی ہے، یہ اشارے اور کنائے ہی اتنے کافی تھے کہ مخاطب ہزار جان سے روزے کی بجا آوری کے لیے آمادہ ہو جائے، آگے پھر وہی بات صراحت سے دوہرائی گئی، ایاماً معدودات، وقت بھی کتنا مختصر مہینے بھر کے گنے چنے دن۔

قرآن کا اعجاز اپنی جگہ پر ہے، بندے کا کلام وہاں تک کہاں پہونچ سکے، لیکن

اس آخری اسلوب کی اتباع میں "حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے اس کلام میں بھی ایک حقیقت واقعیہ کی صحیح تصویر کھینچی گئی ہے، جس کو غلطی سے لوگوں نے نہایت مشکل اور وقت طلب کام سمجھ لیا تھا۔ گویا ایک مصنوعی شدت کو سہل الحصول بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح مذکورہ بالا خوبی کے ساتھ ساتھ یہ ایک حقیقت نما مجاز بھی ہے، اور آگے پیچھے کھڑے ہونے میں الفاظ سے صنعت تضاد کے استعمال نے کلام میں مزید دلکشی پیدا کر دی ہے۔

(راوی قاری رحمت اللہ)

ملنا مشکل ٹلنا مشکل:

حضرت حافظ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مکارم اخلاق کی اس بلندی پر فائز تھے، جس کو بلا شبہ انبیا اور اولیا کی اتباع کبریٰ کا مقام دیا جا سکتا ہے، چناں چہ اگر مستثنیات سے قطع نظر کر لی جائے تو آپ سے تعلق رکھنے والے ہزار ہا شاگردوں، کئی ہزار مریدوں اور بے شمار معتقدوں اور متعلقین میں یہ ایک عام خیال ہے کہ حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ جس سے بھی ملتے وہ یہ سمجھتا کہ حضرت مجھ سے خصوصی تعلق رکھتے ہیں اور جناب والا مجھ پر خاص نظر کرم فرماتے ہیں، لیکن میرے خیال میں اس خیال کی خاص وجہ یہ تھی کہ آپ ہر شخص سے اس کے منصب کے موافق برتاؤ کرتے تھے۔ خواہ وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو۔

مولانا عبداللہ صاحب سلمہ ربہ کا بیان ہے، کہ ایک دفعہ میں آپ (راقم الحروف) کے ساتھ حضور حافظ ملت کی خدمت میں گیا تو آپ کو کرسی پر بٹھایا اور مجھے فرش پر بیٹھنے کا اشارہ فرمایا، اور جب میں مولانا غلام حسین سلمہ کے ساتھ گیا تو مجھے کرسی پر اور ان کو فرش پر بیٹھنے کا حکم فرمایا، راقم الحروف کا خیال یہ ہے کہ ایسا موقع بھی ضرور آیا ہوگا، جب مولانا غلام حسین صاحب زید مجدہ کو کرسی پر بٹھایا اور ان سے کم درجہ کوئی آدمی ان کے ساتھ رہا ہو تو اس کو فرش پر بیٹھنے کا حکم دیا ہو، یعنی ہر شخص کی قرار واقعی تکریم حضرت کا وطیرہ تھا۔

چناں چہ ایک صاحب جو حضرت کے بہت قریبی شاگرد انتہائی زیرک اور ذی علم

آدمی تھے، میں بھی ان کی ذہانت وطباعی اور علم سے بے حد متاثر تھا، انہوں نے بدقسمتی سے حضرت سے اختلاف کیا اور اس کو آخری سرحدوں تک پہونچا دیا جس سے پوری قوم میں انتشار اور برہمی ہوئی اور حضرت کو اس سے کافی دکھ پہونچا۔

ایک روز حضرت وضو فرمارہے تھے، موقع کچھ ایسا ہی مناسب تھا، میں نے عرض کیا: حضرت! اللہ تعالیٰ مقلب القلوب ہے اور بزرگوں کی دعاؤں کی تاثیر برحق، خاص اوقات میں آپ فلاں صاحب کے لیے دعا کیوں نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ ان کا دل پھیر دے، قوم کو ان کے علم وفضل کی بڑی ضرورت ہے، آپ نے میری طرف رخ کر کے فرمایا: مفتی صاحب! نہ جانے کیوں اب وہ ہمارے دل سے نکل گئے، یہ سن کر مجھے ان صاحب کی محرومی پر بڑا دکھ ہوا، تو یہ تھا حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے تکدر کا عالم ان صاحب کے ساتھ، لیکن عام برتاؤ حضرت کا ان کے ساتھ اس کے بعد بھی یہی رہا کہ دیکھنے والے محسوس کرتے تھے کہ شاگردوں کی اس بھیڑ میں جو حضرت کے اردگرد ہمیشہ رہتی تھی سب سے زیادہ مقرب ومحترم یہی ہیں۔

یہ جملہ معترضہ ذرا طویل ہو گیا۔ کلام زیرعنوان ”ملنا مشکل نکلنا مشکل“ کے سلسلہ میں تھا، المختصر عرض کرنا مجھ کو یہ تھا کہ حضرت کی عنایت سارے ہی متعلقین پر ایسی ہوتی تھی کہ وہ اس کو خصوصی نوازش تصور کرتا پھر بھی کچھ لوگ ایسے ضرور تھے جو الطاف خسروانہ اور مراحم خاص کے مورد تھے، جیسے علامہ ارشد القادری دام بالفضل۔ اب میں جن کا ذکر کرنے جارہا ہوں وہ کچھ اسی قسم کے بزرگ ہیں جن کو حضرت کی بارگاہ میں قرب خاص کا مقام حاصل تھا۔ اور حضرت ان کے ساتھ نہایت محبت سے پیش آتے تھے، اور وہ خود بھی ذی علم، ملنسار، ذہین اور صاحب کمالات بزرگ ہیں، لیکن ان کی یہ اخلاقی کمزوری ضرور ہے، ملازمت کے سلسلہ میں کہیں ایک جگہ جم کر کام کرنا ان کے بس کا روگ نہیں ہے، اور یہی ایک ایسی بیماری ہے کہ اس کی وجہ سے نہ تو آدمی کی شخصیت بنتی ہے نہ کام میں جماؤ پیدا ہوتا ہے، پھر ہر جگہ سے علیحدگی کے کچھ نہ کچھ اسباب تو ضرور رہوں گے جو ظاہر ہے خوشگوار

تعلقات کے نتیجہ میں تو پیدا ہو نہیں سکتے جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ہر علیحدگی کے بعد طرفین کے شکوے اور شکایت، قطع تعلق بلکہ بغض وعداوت تک نوبت پہونچتی ہے، مزید براں جتنی جگہ چھوڑی کم از کم وہاں کے لوگ ان کو نااہل ونا کارہ قرار دیں گے، حضور حافظ ملت بھی اس سیماب وشی کو سخت ناپسند فرماتے تھے، اور اکثر فرماتے "میاں! بدمذہبوں کا حال ہے کہ جنگل میں پہونچ جائیں تو جگہ بنالیتے ہیں اور ہمارے لوگوں کا حال یہ ہے کہ ہم انہیں جگہ دیتے ہیں اور یہ اس کو خراب کر دیتے ہیں" کبھی فرماتے: لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے سازگار ماحول میں کام کر رہے ہیں، لیکن قریب سے دیکھنے والے ہی جانتے ہیں کہ یہاں کن حالات میں نباہ کیا جا رہا ہے، بات پھر طویل ہوتی جارہی ہے، کہنا یہ تھا کہ حضور حافظ ملت کے ایک نہایت ہی مخلص معتقد جن کا دینی اخلاص شک وشبہہ سے بالاتر ہے، جو ایک دینی ادارے کے سرگرم رکن ہیں، ایک عرصہ سے اپنے اس ادارہ کے لیے اچھے صدر مدرس کی تلاش میں تھے، حضور حافظ ملت سے بھی اس کے لیے بار بار گزارش کی تھی، اور حضرت بھی کسی مناسب آدمی کی جستجو میں تھے، ہم لوگوں سے بھی اس کے لیے بار بار تاکید کر چکے تھے، مگر اس وقت تک کوئی مناسب آدمی ان کو مل نہ سکا تھا، اتفاقا ان کی ملاقات حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے مذکورہ بالا شاگرد عالم صاحب سے ہوگئی اور باہمی بات چیت سے معاملات طے پاگئے، مولانا نے رہنا قبول کرلیا، بات اس مرحلہ تک پہونچ جانے کے بعد انہوں نے حافظ ملت علیہ الرحمہ سے بھی مشورہ واجازت ضروری سمجھا اور عرض کیا: حضور اگر ہمارے مدرسہ کے لیے حضرت مولانا صاحب مل جائیں تو کیسے رہیں گے، انہیں توقع تھی کہ حضرت سنتے ہی مسرور ہوں گے، اور دعائیں دیں گے اور اس انتخاب پر ہم لوگوں کو سراہیں گے، مگر ان کی ساری امنگوں پر پانی پڑ گیا، جب انہوں نے حضرت کی زبان مبارک سے یہ جملہ سنا: اول یہ کہ ملنا مشکل، مل جائیں تو ٹکنا مشکل۔

راوی کا بیان ہے کہ میں نے تو حضرت کی خدمت میں یہ معاملہ اس حوصلہ اور اس خیال سے پیش کیا تھا کہ خود حضرت کو اس مسئلہ سے ذاتی دلچسپی ہے، اور مولانا کو بھی

حضرت بے حد محبت وعنایت سے نوازتے ہیں، اس لیے یہ بات سنتے ہی حضرت فرمائیں گے، صاحب ان کی کیا بات ہے، اگر وہ آپ کو مل جاتے ہیں تو آپ کے مدرسہ کو چار چاند لگ جائیں گے، اور وہ ثریا کی بلندی تک پہونچ جائے گا، پھر میں کہوں گا کہ حضرت مولانا صاحب سے ہمارے معاملات طے ہو چکے ہیں، پھر حضرت اپنی عادت کریمہ کے موافق بے ساختہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیں گے، اور مجھے مبارک باد دیں گے، لیکن ہوا یہ کہ "ملنا مشکل ٹلنا مشکل" حضرت کا جواب سن کر میں اس تردد میں پڑ گیا، کہ میں ان کو کس طرح یہ خبر دوں کہ حضرت ہم نے آپ کی بیان کردہ دو مشکلوں میں سے پہلی حل کر لی ہے کیوں کہ اب یقین ہو گیا تھا کہ دوسری والی مشکل سے ہم ضرور دو چار ہوں گے، اور بعد کے تجربات نے تو یہ ثابت کر دیا کہ اگر مولانا ہم کو نہ ملے ہوتے تو اچھا تھا بل کرنہ نکلنے میں جن جن زحمتوں سے پالا پڑا وہ بے حد تکلیف دہ ہیں، وہ تو اپنے زور بیان میں اس پوری داستان کو حضرت کی ایک کرامت بنا کر پیش کر رہے ہیں، اور میرے دماغ میں خیالات کی ایک دنیا آباد ہونے لگی تھی۔

سب سے پہلی بات تو یہ کہ آج کل دنیا کی بڑی بڑی شخصیتوں کی بارگاہ میں بھی بہت سارے معاملات کا فیصلہ تعلقات کی بنیاد پر ہوتا ہے، اور یہاں تو علمی وجاہت، اخلاقی برتری، ملنساری کا لحاظ اگر کیا جائے تو بلا تامل حضور حافظ ملت کو مشورہ دے دینا چاہیے تھا کہ یہ انتخاب نہایت موزوں ہے، لیکن حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی "المستشار موتمن" 'جس سے مشورہ لیا جائے وہ امانت دار کی طرح ہے، جس کو امانت صحیح صحیح ادا کرنا چاہیے، مشورہ کا اس درجہ پاس کرنا کہ حق مشورہ کو تعلقات کی آمیزش سے بالکل پاک کرنا، دلی انس اور قلبی لگاؤ کا مطلق خیال نہ کرنا اور ٹھیک ٹھیک رائے ظاہر کر دینا اس زمانہ میں حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کا ہی کام تھا (اذا قلتم فاعدلوا ولو کان ذا قربیٰ) (بات انصاف کی بولو چاہے قرابت دار کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔)

دوسری بات یہ کہ مولانا موصوف کی عام کمزوری عدم استقامت پر ہی اکتفا نہیں

کیا بلکہ ملنا مشکل کہہ کر دوسری کوتاہیوں یا اسباب کی طرف بھی اشارہ کر دیا، جب کہ اس خوش اسلوبی سے اس کو ظاہر کیا کہ عیب جوئی بھی نہ ہونے پائی مثلاً یہ کہا جا سکتا تھا کہ ان کا ملنا مشکل ہے، کیوں کہ انہیں پیسے کی بھی کچھ لالچ ہے، ان کا ملنا مشکل ہے، کیوں کہ ان میں فلاں خرابی، وغیرہ وغیرہ لیکن ظاہراً اس تشریح سے سوائے عیب جوئی کے اور کیا حاصل ہوتا، اس لیے سارے اسباب کا حاصل بتا دیا کہ "ملنا مشکل ہے" اسباب و وجوہ کیا ہیں اس کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔

تیسری بات یہ کہ حضرت نے اس جملہ میں ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف بھی کیا کہ "نہ ہر مردے بہ ہر کارے" کہ ہر آدمی ہر کام کے لیے نہیں ہوتا، آدمی لاکھ قابل ہو، فاضل ہو، علامہ ہو، اس کے انتخاب میں یہ لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ جو کام اس کو دیا جائے اسے وہ کس قابلیت سے ادا کر سکتا ہے، اگر کچھ کم استعداد آدمی ہی ہو لیکن مقصد کے ساتھ لگن کام کا شوق، ذمہ داری نبھانے کا جذبہ ہو تو اس کا انتخاب کرنا چاہیے، اور کامل و فاضل کو رد کر دینا چاہیے۔

چوتھی عجیب وغریب بات یہ ہے کہ حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ شاعر نہیں تھے، کبھی آپ نے کچھ اشعار کہے ان کی فنی حیثیت کیا تھی، زبان وبیان اور اسلوب نگارش کیا تھا، معلوم نہیں تو اگر کہا ہو تب بھی نہ کہنے کے برابر ہے، لیکن طبع رسا اتنی موزوں، فطرت وقا اتنی سلیم واقع ہوئی تھی کہ برجستہ بھی جو کلام آپ کی زبان سے ادا ہوئے، نظم کا لطف اور شعر کا مزا دے جاتے تھے، آپ ان دونوں جملوں کی تقطیع کر کے دیکھ لیجیے دونوں آپ حرف حرف برابر اور حرکت وسکون تک میں بالکل یکساں، اسی لیے دونوں جملوں کا آہنگ بالکل کلام موزوں کا مزہ دیتا ہے، اور قافیہ ردیف کے اضافہ نے اس نثر کو شعر کا ہم پلہ بنا دیا ملاحظہ ہو۔

اُ دْ وَ ل یہ کہ مل نا مش کل   مل جائیں تو ٹک نا مش کل

(۵) "زمین کے اوپر کام اور قبر میں آرام"

حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ سراپا عملی انسان تھے، آپ نے دن رات کے چوبیس

گھنٹے میں ایک ساتھ اتنے کام کیے ہیں کہ آج سوچ کر آدمی کی عقل حیران ہو جائے۔

اپنے عنفوان شباب میں جب آپ کا قیام وطن میں تھا، گو آپ ایک مدرسہ میں ملازمت کرتے تھے، ایک مسجد میں باقاعدہ امامت فرماتے تھے اور گھر کا کام روزانہ اتنا کر لیتے تھے کہ جو لوگ صرف اسی دھندے میں لگے ہوئے تھے ان سے زیادہ ہوتا، اوران سب پر مستزاد روزانہ ایک ختم قرآن عظیم کی تلاوت تھی۔

مبارک پور تشریف لائے تو روزانہ تیرہ سبق پڑھاتے تھے، جس میں سب سے نیچے درجہ کی کتاب شرح ملا جامی تھی، رات میں ایک دن ناغہ سے ایک ایک بجے تک مناظرہ تقریر کرتے تھے۔ مخالف کیمپ کی تقریروں کے نوٹ کو پڑھ کر اس کے جواب کی تیاری، اور مختلف طلبہ و مدرسین کو اس کی تلقین و تدریس کرتے، باہر سے آئے ہوئے فتووں کے جواب بھی خود ہی دیتے۔

۱۳۸۱ھ میں فارغ ہونے والے طلبہ کی کثرت کی وجہ سے مدرسہ کی کمیٹی نے یہ طے کیا کہ امسال طلبہ کو جلسہ فراغ میں صرف دستار دی جائے جبہ نہ دیا جائے تا کہ غیر معمولی مصارف سے بچا جائے مگر یہاں کے مقامی طلبہ میں کچھ ایسے بھی تھے، جن کے مربی حضرات مدرسہ میں بڑا رسوخ رکھتے تھے، انہوں نے اتنا ہنگامہ مچایا کہ مدرسہ کی کمیٹی ہوئی اور یہ طے ہوا کہ جبہ دیا جائے، لیکن اس کے اخراجات کے لیے قصبہ میں چندہ کیا جائے اور مدرسہ کے فنڈ پر بار نہ ڈالا جائے، تمام ممبران نے چندہ وصول کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں لیکن وقت پر ایک آدمی بھی نہیں آیا اور تنہا حضور حافظ ملت نے مدرسین کو لے کر یہ وصولی کی، ایک دن میں ساتھ تھا، صبح آٹھ بجے سے وصولی جاری تھی، خیال ایسا ہے کہ دو پہر میں کھانے کے لیے بھی مہلت نہیں ملی، جہاں جہاں گئے ناشتے چائے کا بھی انتظام رہا، اس لیے دوپہر میں کھانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، دن بھر وقت پر نماز پڑھنا اور لوگوں کے یہاں جانا چندہ کے لیے کہنا اور پیسے وصول کرنا مسلسل جاری رہا۔ رات نو بجے تک سلسلہ جاری رہا اور اب ہم وصول کرتے کرتے حضرت کے محلہ کی مسجد تک پہونچ گئے تھے،

نماز عشا پڑھ کر مسجد سے باہر نکلے تو یہ عالم تھا کہ جسم کی بوٹی بوٹی درد کر رہی تھی، ظاہر ہے کہ وہ نو ستر سال کے لگ بھگ کے تھے، عزم وارادہ کا جو عالم ہو لیکن جسم تو ان کا بھی درد تھکن کے مارے فریاد کر رہا ہوگا، کھڑے کھڑے اپنی چھڑی پر زور دے کر ایک بھرپور انگڑائی لی اور فرمایا، مفتی صاحب مدرسہ چلانا آسان کام نہیں ہے، روح اور جسم گھلانا پڑتا ہے۔

الغرض کام، مسلسل کام، رات دن کام امتیاز کیے بغیر کام، کرنا ان کا شیوہ تھا، الجامعۃ الاشرفیہ کے لیے سرمایہ کی فراہمی کا سوال پیدا ہوا تو آپ ہی نے کمر ہمت باندھی اور ناٹا نگر، بھیونڈی، بمبئی کا سفر ضعف ونقاہت کے باوجود کیا، محنت اتنی کرتے تھے کہ آپ کے جواں سال ساتھی ہمت ہار جاتے تھے، دن بھر روزہ، مسلسل گشت اور شام کو تراویح، پھر رات کو اٹھ کر تہجد میں کئی پارے کی تلاوت اور آرام کا یہ عالم کہ سونے میں بھی پیر سمٹا ہوا، کسی دن اس صورت حال سے گھبرا کر ہمارے ہم سفر حضرت مولانا قمر الزماں خاں صاحب زید مجدہم نے عرض کیا کہ حضور اتنی محنت فرماتے ہیں، کچھ تو آرام فرمالیں، اس قسم کے جملے اور بزرگوں سے بھی مروی ہیں۔ سید ایوب علی رضوی کا بیان ہے کہ فاضل بریلوی اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ دن بھر فتاویٰ لکھتے رہے، رات میں بھی بارہ بجے تک یہی شغل جاری رہا، جب بستر پر سونے کے لیے تشریف لے گئے، تو داہنی کروٹ پاؤں سمیٹ کر اور اپنے ہاتھ اس طرح سر کے نیچے رکھا کہ ''محمد'' کی تحریر بن گئی، میں نے دونوں پاؤں پکڑ کر پھیلا دیا کہ حضور دن بھر تو بیٹھے رہے، اب آدھی رات کو بھی اپنے پاؤں سمیٹ کر لیٹے ہیں، فرمایا: سید صاحب، مسلمان دنیا میں پاؤں پھیلا کر سونے کے لیے نہیں آیا، اور پاؤں سمیٹ لیا، یہ جملہ بھی ایک ایسی ہی شان رکھتا ہے، اور اپنے موضوع پر نہایت بلیغ اور جامع انداز میں روشنی ڈال رہا ہے، اور عجب نہیں کہ حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ نے اسی سے متاثر ہو کر مذکورہ بالا جملہ ارشاد فرمایا اور اپنی طبیعت کے مطابق اس مفہوم کو ایک نئے اسلوب میں بیان فرمایا ہو، ایک شاعر نے بھی اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے:

جاگنا ہو جاگ لے افلاک کے سایہ تلے
حشر تک سونا پڑے گا خاک کے سایہ تلے

مگر اس شعر میں صوتی وغنائی اور خاک کے سایہ اور افلاک کے سایہ تلے کی صدائے موزوں کے علاوہ مقصد تعقید کے پردے میں نہاں ہے، کیوں کہ جاگنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ آدمی کام ہی کرے، اور کام کرے بھی تو یہ ضروری نہیں کہ مفید اور کار آمد ہی کام کرے اس لیے یہاں یہ ٹکڑا پوشیدہ ماننا پڑے گا کہ جاگ کر وقت مفید کام میں صرف کرو اور شاید اوزان کی پابندی نے ہی شاعر کو ابہام اور اشاروں میں بات کرنے پر مجبور کیا ہے۔

اس کے برخلاف حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کا جملہ اپنے مضمون پر صاف اور صریح دلالت کرتا ہے، اور الفاظ بھی مذکورہ بالا شعر سے مختصر استعمال ہوئے ہیں، پھر اس شعر میں کام کے لیے جاگنے کا کام صرف اس میں مجبوری کے تحت ہے کہ قبر میں آدمی سونے پر مجبور ہے، جب کہ حضرت کے اس جملے میں کام اور آرام کا تقابل کسی چیز کا پتہ نہیں چلتا بلکہ جہد مسلسل کے لیے ایک تازہ جواز فراہم ہوتا ہے، اس پر مزید صنائع لفظی کا اہتمام بھی ہے، فاصلہ اور قافیہ ان دونوں جملوں کے حسن کو دوبالا کر رہا ہے۔ ایک شعر:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر — لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

حضرت شیخ العلما ایک منکسر المزاج شخصیت

شیخ العلما حضرت مولانا غلام جیلانی صاحب اعظمی مرحوم مغفور۔ اعظم گڑھ کے ایک مردم خیر قصبہ گھوسی کے باشندے تھے، اور وہیں کے ایک علمی گھرانہ کے چشم و چراغ اور اسی ذی وقار خاندان کے گل سر سبز اور حضور صدر الشریعہ بدر الطریقہ حضرت مولانا حکیم ابوالعلا محمد امجد علی قبلہ علیہ الرحمہ کے ارشد تلامذہ میں سے، جن کی درس گاہ سے پورے ہندوستان میں اہل سنت و جماعت کے آفتاب و ماہتاب چمکے۔

شیخ العلما مرحوم کے انتقال سے اعلام علمائے امت کی اولین صف میں ایک عظیم خلا پید ہوگیا، اور پوری قوم ایک بہت بڑے خسارے سے دوچار ہوگئی۔ للہ ما اعطیٰ و لہ مااخذ و لانقول الامایرضی بہ ربنا. انا للہ و انا الیہ راجعون.

مرحوم سے میری پہلی ملاقات ایک دل خراش واقعہ کی یاد دلاتی ہے، لیکن وہی ملاقات اس کا مرہم بھی ثابت ہوئی۔ حضرت مولانا یوں تو جملہ علوم وفنون متداولہ درس نظامی میں دست گاہ رکھتے تھے، لیکن ادب عربی میں آپ کی شہرت غیر معمولی تھی، اشرفیہ میں الہ آباد بورڈ کے امتحانات شروع ہوئے اور طلبہ جو الہ آباد بورڈ کے امتحانات کا فارم بھر چکے تھے، ان کی بھر پور کوشش تھی کہ اس کی تیاری کے لیے حضرت مولانا کو مدرس رکھا جائے۔ ادھر حافظ ملت علیہ الرحمہ نے از راہ شفقت میرے تقرر کی شفارش کردی اور بلا بھی لیا۔ مجھے فارغ ہوئے کل ایک سال ہوا تھا، ان طلبہ میں کچھ کو میری معاصرت وغیرہ کی وجہ سے سخت اعتراض تھا، چناں چہ ان لوگوں نے متفقہ زور لگا کر اس طرح مجھ کو پریشان کیا کہ ایک ماہ کے بعد ہی مجھے استعفیٰ دے دینا پڑا اور پھر حضرت مولانا کو اس جگہ بلا لائے۔ اس لیے قدرۃً مجھ کو تکلیف یک گونہ مولانا سے بھی تھی حالاں کہ وہ خود بے قصور تھے۔ اور قصور

منہ تو میں ان طلبا کو بھی نہیں گردانتا جنھوں نے میرے خلاف یہ جدوجہد کی تھی۔

استعفیٰ کے بعد سال بھر میں مکان پر ہی رہ گیا، مدرسہ کے کچھ طلبہ جو مجھ سے مانوس تھے میرے گھر پر پڑھنے آتے۔ مولانا کے دارالعلوم میں تشریف لانے کے کچھ روز بعد مدرسہ میں گیا تو مولانا مرحوم خود میرے پاس تشریف لائے اور دیر تک میری دل دہی کرتے رہے، اور مرقاۃ میں قضیہ کے بیان میں حکم کا جو تذکرہ آیا ہے، اس سلسلہ میں مجھ سے استصواب رائے کیا کہ حکم کی صحیح تعریف کیا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ منطق میں آپ کو زیادہ درک ہے، آج کل میں یہ کتاب پڑھا رہا ہوں۔ یہ مقام میں نے چاہا کہ اس میں آپ سے تبادلہ خیال کروں، میں نے سوچا کہ یہ سب تو بہانہ ہے مولانا اسی بہانہ میری دل دہی فرمانا چاہتے ہیں۔ اس واقعہ کے بعد مولانا کی وقعت میرے دل میں اور بڑھ گئی، میری مولانا سے یہ پہلی ملاقات تھی۔

دوسرے سال میں تلسی پور ضلع گونڈہ مدرسہ انوارالعلوم میں ملازم ہو کر چلا گیا۔ پھر میری ملاقات مولانا سے کم ہی رہی، مگر یہ سنتا رہا کہ حضرت مولانا اپنی باغ و بہار طبیعت سے پورے مدرسہ میں محبوب و مرغوب رہے اور ہر موقع پر دارالعلوم کی طرف سے عربی کی ترجمانی کا فریضہ آپ کے ہی ذمہ رہا۔

ایک مرتبہ حضرت محدث اعظم ہند کی آمد کے موقع پر ان کے استقبال میں ایک قصیدہ مدحیہ آپ نے تحریر فرمایا جس کا مطلع اس وقت کی طلبہ کے زبان زد تھا:

شمس العلوم قد طلعت فی دیارنا ارزق بہ الھدایہ والرشد والحکم

ایک دفعہ کراچی کے رسالہ ''العرب'' میں ایک مراسلہ مدرسہ کی جانب سے شائع کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی، اس کو مولانا ہی نے تحریر فرمایا تھا اور حق یہ ہے کہ خوب لکھا تھا۔

حضرت شاہ یار علی علیہ الرحمہ کے عرس کے موقع پر جامعہ فیض الرسول براؤں شریف حاضری کا موقع ملا، معلوم ہوا کہ مولانا بے حد کمزور و نحیف و نزار ہو گئے ہیں، تو میں

اور قاری محمد یحییٰ صاحب ناظم الجامعۃ الاشرفیہ دونوں ساتھ ساتھ حضرت مولانا سے ملاقات کی غرض سے حاضر ہوئے تو دیکھا کہ مولانا واقعتاً گھل گئے ہیں۔

مولانا انتہائی شفقت سے پیش آئے۔ دیر تک معذرت کرتے رہے کہ میں اپنی کمزوری اور ناتوانی کی وجہ سے مسجد تک بھی مشکل سے چل پاتا ہوں، اس لیے آپ حضرات کی ملاقات کو حاضر نہ ہو سکا۔ حالاں کہ مجھے حاضر ہونا چاہیے تھا، آپ ہمارے مہمان ہیں۔ اور مولانا نے اسی پر بس نہیں کیا۔ ہمارے مبارک پور پہونچنے کے بعد آپ نے ایک خط کے ذریعہ پھر اپنے تاسف کا اظہار فرمایا جس سے ان کی تواضع اور خوش اخلاقی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کی سوانح حیات کی تیاری کے سلسلہ میں میں نے آپ کے تلامذہ اعلام سے بارہا گزارش کی کہ اس سلسلہ میں میری مدد فرمائیں، لیکن عام رد عمل سرد مہری کا سا ہی رہا مگر حضرت مولانا مرحوم ان حضرات میں سے ہیں جو اس سے مستثنیٰ ہیں، آپ نے اپنے قلم سے لکھ کر ایک مختصر مضمون روانہ فرمایا اور اپنی کمزوری و علالت کی وجہ سے طویل تحریر نہ کر سکنے کی معذرت بھی فرمائی۔

الغرض اپنے علم و فضل اور طویل درسی تجربہ و مہارت درس نظامیہ کے ساتھ ساتھ مولانا مرحوم ایک متواضع اور منکسر المزاج بزرگ تھے۔ رب تبارک و تعالیٰ ہماری قوم میں ان کے امثال پیدا فرمائے اور ان کی قبر کو رحمت و غفران کی بارش سے سیراب کرے۔ آمین بجاہ حبیبہ سید المرسلین۔

بلبل ہند کا تذکرہ

علامہ مفتی رجب علی صاحب نانپاروی صاحب علیہ الرحمہ

نحمده ونصلى على رسوله الكريم

یہ جب کا ذکر ہے کہ حضرت مولانا علیہ الرحمہ سے میرا کوئی سابقہ تعارف نہ تھا، میرا بالکل ابتدائی دور تھا، کہیں کہیں جلسوں میں چلا جاتا تھا، اور مولانا علیہ الرحمہ ہندوستان کے سینوں میں شہرت کی بلندیوں پر پہونچ چکے تھے۔ اور ہر طرف ان کی خوش نوائیوں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ جلسہ کے پوسٹروں میں انھیں طوطی ہند کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، مشہور یہ تھا کہ مولانا اپنی تقریروں میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ العزیز کی نعتیں اس خوش الحانی سے پڑھتے ہیں کہ پورا مجمع وجد میں جھومنے لگتا ہے۔ بالخصوص اعلیٰ حضرت کی نعت "لم يات نظيرك فى نظر" پڑھنے میں تو اپنا جواب نہیں رکھتے۔

جگہ تو مجھے یاد نہیں مگر پہلی بار کسی جلسہ میں ہی ان کو دیکھا۔ ایک دبلے پتلے منحنی جسم وجثہ کے انسان مگر سنجیدہ اور متین، وقت کے عام رجحان کے خلاف لباس اور وضع قطع میں بھی کوئی تراش خراش نہیں، تقریر کے وقت عمامہ باندھے تھے، اور شیروانی بھی زیب تن تھی، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تمام لباس فاخرہ بے دلی سے پہن رکھا ہے۔

خطبہ مسنونہ کے بعد کوئی نعت شرف پڑھنی چاہی، مگر کئی لوگ ایک ساتھ بول اٹھے "لم يات نظيرك فى نظر" اور آپ نے اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وہی شہرہ آفاق، مرصع، اور دل گداز نظم شروع فرمائی۔ کلام کا حسن و جمال مولانا کی بے مثال آواز کے سوز و ساز میں ڈھل کر لوگوں کو تڑپا رہا تھا، دلوں میں طلاطم برپا تھا اور سر وجد میں جھوم رہے تھے۔ مولانا نے نظم ختم کردی مگر اس کا اثر لوگوں پر دیر تک طاری رہا۔ اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ مبارک نظم اس سے پہلے بھی بڑے بڑے خوش الحانوں سے سن چکا تھا، اور

بعد میں بھی بار بار سننے کا اتفاق ہوا۔ مگر مولانا مرحوم کی بات ہی کچھ اور تھی۔

اس کے بعد آپ نے تقریر شروع فرمائی، تمہید کچھ اس طرح تھی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کہیں بھی کسی نبی کو بھیجا تو اگر قوم میں کوئی ایسی بات تھی جس پر وہ فخر کرتی، تو اس کے مقابلہ میں پیغمبر کو بھی ایسا کمال دیا گیا، کہ قوم کا غرور ٹوٹے اور وہ عجز وفروتنی کے ساتھ پیغمبر کے آگے گھٹنے ٹیک دے، کہ انسانی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ بات اسی کی مانتا ہے جس سے دبتا ہے، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جادوگروں میں بھیجا گیا، تو آپ کو عصا اور ید بیضا عطا کیا گیا۔ جس کے سامنے جادوگروں کی پوری اجتماعی طاقت سرنگوں ہوگئی، حضرت مسیح علیہ السلام کو جس قوم کی طرف بھیجا گیا۔ اس کو طب اور امراض کے علاج میں ید طولیٰ حاصل تھا، تو آپ نے اپنے علاج کی ابتدا ان بیماریوں سے کی، کوڑھی، مادرزاد اندھا پن، اور موت، اللہ تعالیٰ نے قرآن عظیم میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿انی أبری أکمه والأبرص وأحی الموتیٰ باذن الله﴾ میں اللہ کے حکم سے مادرزاد اندھے، کوڑھی کو تندرست اور مردہ کو زندہ کر دیتا ہوں۔ یہ مظاہرہ ایسا تھا کہ اس زمانہ کے تمام اطبا اور حکما انگشت بدنداں رہ گئے۔

حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جس قوم میں بھیجا گیا، انہیں اپنی زبان دانی پر گھمنڈ تھا، لیکن جب آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بولنے پر آئے، تو تمام بولنے والوں کے منہ پر مہر خموشی لگ گئی۔

تیرے آگے یوں ہیں دبے لچے فصحا عرب کے بڑے بڑے
کوئی جانے منہ میں زبان نہیں، نہیں بلکہ جسم میں جان نہیں

مولانا ابھی تو اتنا ہی بول پائے تھے کہ کسی نے ان کے کان میں کچھ سرگوشی کی، تقریر بند کرنے کو کہا ہوگا، اگر کوئی دوسرا مقرر ہوتا اور اس کو درمیان میں اس طرح ڈسٹرب کیا گیا ہوتا تو وہ ڈانٹ دیتا، جھگڑ پڑتا، کچھ نہیں تو منہ بنا تا مگر مولانا کو شاباس ہے نہ لڑے نہ جھگڑے نہ ڈانٹا نہ چیخے نہایت خندہ پیشانی سے کرسی سے اتر پڑے، مجھے مولانا کا یہ تحمل ان

کی بردباری اور یہ حسن اخلاق بہت پسند آیا اور ہر چند کہ جو باتیں انہوں نے بیان کیں میرے لیے کچھ نئی نہیں تھیں پھر بھی ان کی زبان سے مجھے بے حد بھلی معلوم ہوئیں اور میرے اندر تحریک پیدا ہوئی تو میں نے انہی باتوں کو تفصیل سے لکھ کر ایک طویل تحریر تیار کر لی جس کو میں نے جہاں بیان کیا بے حد پسند کی گئی اور کتنی جگہ تو خاص طور پر اس کی فرمائش کی گئی۔

یہ میری اور ان کی پہلی دید وشنید تھی مگر ایک طرفہ کی، صرف میں نے ہی ان کو سنا اور میں نے ہی ان کو دیکھا، وہ اسٹیج سے اٹھ کر چلے گئے اور میری ان کی بات چیت نہ ہو سکی۔

دوبارہ خاص نانپارہ میں ہی ان سے ملاقات کا اتفاق ہوا جہاں ان کی تواضع وانکساری کا مشاہدہ ہوا جو حضرت سعدی علیہ الرحمہ کے اس مصرعہ کا نمونہ تھی۔ ع

تواضع زگردن فرازاں نکوست

سربلند لوگ تواضع کریں تو بھلی معلوم ہوتی ہے

اور ان کی مہمان نوازی سے سابقہ پڑا جو

ع چہ دشمن بریں خوان یغما چہ دوست

کا مظہر تھی نانپارہ میں حضرت شاہ یار علی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ایک معتقد اور مرید خاص تھے جناب حاجی ضیاء اللہ قریشی حاجی صاحب۔ سال میں ۲۶؍۲۷؍رجب شریف کو معراج النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا جلسہ بڑے ذوق وشوق اور اہتمام سے کرتے تھے۔ جس سال اس جشن میں میں شریک ہوا حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ، حضرت شیر بیشہ اہل سنت مولانا الشاہ ابو الفتح محمد حشمت علی صاحب پیلی بھیتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، اور حضرت مولانا حامد حسن صاحب سنبھلی بھی تشریف لائے تھے۔

حضرت مولانا رجب علی صاحب نے حاجی صاحب سے مل کر ان سب علما کی دعوت کی درخواست کی جو پہلے روز ہی آ چکے تھے، اور کھانے پر مہمانوں کو اپنے گھر پر لوا جا

نے کے لیے بھی خود ہی تشریف لائے، ہمیں ساتھ لے کر گھر پہونچے تو وہاں بہت سے لوگ پہلے ہی سے موجود تھے، یہ معلوم ہوتا تھا کے جلسے کہ مہمانوں کا اہتمام مولانا کے یہاں ہی ہے۔ میں مولانا سے متعارف نہیں تھا مگر اس درجہ بے تکلفی اور تپاک سے ملے، جیسے بہت پرانی شناسائی ہو۔ ایک بڑے کمرے میں تمام لوگوں کو دورویہ بٹھایا گیا، ان کے درمیان یہاں سے وہاں تک کھجور کے پتوں کی گول چٹائیاں جو بڑے تشت کی طرح تھیں لگادی گئیں، میں نے پوچھا یہ کیا، تو مولانا خود ہی بول اٹھے یہ عرب شریف کا سفرہ ہے، مجھے پسند آیا تو میں نے کئی ایک خرید لیے کہ اس میں کوئی تکلف نہیں، استعمال کے بعد کھونٹیوں میں دھو کر لٹکا دیجیے اور ضرورت پر اتار کر استعمال کر لیجیے، انہیں دسترخوانوں پر انواع واقسام کے کھانے کا انبار لگا دیا گیا، کھانا شروع ہوا اور مولانا کا یہ حال ابھی دسترخوان پر مہمانوں کے ساتھ بیٹھے، یہ کھا لیجئے یہ چکھیے ذرا اس کو تو دیکھئے فرمارہے ہیں، ابھی کوئی آ گیا تو اسے لا کر دسترخوان پر بٹھایا اور کھانا سامنے لگا دیا، ابھی خیال آیا کہ فلاں چیز بھی ہونی چاہیے تو دوڑ کر اندر گئے تو اسے لا کر حاضر کر دیا، دوسرے دن صبح پھر تشریف لائے، ناشتہ کے بعد ہم لوگوں کو لے کر نانپارہ شہر دیکھانے چلے گئے۔ کیا کیا دکھایا تفصیل تو یاد نہیں رہ گئی، البتہ راجا نانپارہ کا گیارہویں یا بارہویں شریف کا محل اب تک یاد ہے۔ وہ ایک نہایت شاندار اور مرصع عمارت تھی، مولانا نے بتایا کہ راجا صاحب نانپارہ، نہایت محبت اور عقیدت سے ہر سال مناتے تھے اور ہندوستان کے کونے کونے سے مشہور و معروف علمائے کرام کو بلاتے تھے جن کا وعظ ہوتا تھا اور دور دور تک آپ کی اس سالانہ دینی تقریب کا چرچا رہتا تھا۔ غالبا اسی موقع کسی نے مجھے وہیں بتایا کہ مولانا رجب علی صاحب نانپارہ کوئی خاص مالدار تو کیا عام سرمایہ دار بھی نہیں ہیں یہ ان کا حوصلہ ہے کہ بے سروسامانی ہی میں اپنے گھر میں یہ دینی مدرسہ بھی قائم کر دیا ہے اور جب تک مکان پر رہتے ہیں اسی فیاضی اور دریادلی سے احباب اور آنے جانے والوں کی خاطر تواضع کرتے رہتے ہیں، اسی دوران کہیں سے بلاوہ آیا تو باہر دورے پر چلے گئے اور لوٹے تو پھر وہی مدارات و مواسات احباب ہے۔

اس ملاقات میں بھی مولانا کی بے تکلفی، تواضع اور مہمان نوازی اور متوکلانہ زندگی کے انمٹ نقوش اپنے ساتھ لے کر لوٹا اور مولانا کے اس طرز عمل نے مجھے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی چند حدیثیں یاد دلا دیں سرکار فرماتے ہیں:

مامن یوم یصبح العباد فیہ الا ملکان ینزلان فیقول احدھما اللھم اعط منفقاً خلفاً ویقول الآخر اللھم اعط ممسکا تلفاً.

ہر صبح جب لوگ بیدار ہوتے ہیں تو آسمان سے دو فرشتے اترتے ہیں، ایک کہتا ہے یا اللہ خرچ کرنے والے کو اس کا اچھا بدلا دے دے۔ اور دوسرا دعا مانگتا ہے یا اللہ بخیل کا مال ضائع کردے۔ یہ حدیث بخاری و مسلم دونوں نے روایت کی ہے۔

ایک بار حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ام المؤمنین صدیقہ کی بڑی بہن یعنی اپنی سالی سے فرمایا: "**انفقي ولا تحصي فيحصي الله عليك، ولا توعي فيوعي الله عليك، ارضحي ماسطعت. متفق عليه**"

اے اسما خرچ کرو اور شمار کر کے نہ رکھو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تم پر شمار کرنے لگے گا۔ اور برتن میں بند کر کے رکھ نہ دو ورنہ اللہ تعالیٰ اپنی عطا کے دروازے بند کر دے گا۔ یہ حدیث بھی دونوں اماموں نے روایت کی ہے۔

سعدی علیہ الرحمہ نے اس حدیث کو کتنا اچھا سمجھایا ہے فرماتے ہیں:

زکاۃ مال بدر کن کہ فضلہ رزرا — چوں باغباں ببرد بیشتر دید انگور

مال کی زکاۃ دیتے رہو کہ مالی جب انگور کی بیلوں کو تراشتا ہے تو انگور زیادہ آتے ہیں، تیسری بار حضرت مولانا مرحوم نے بڑے اصرار کے ساتھ اپنے دار العلوم عزیز العلوم نانپارہ کے سالانہ جلسے میں دعوت دی۔ میں تقریبا وقت پر پہونچا تو معلوم ہوا کہ مولانا ابھی سفر سے واپس نہیں آئے ہیں، کسی نہ کسی وقت تو آئیں گے ہی، ایسا خیال آتا ہے کہ اس بار مجھے ان کے طلبہ کا امتحان لینا پڑا۔ فارغ ہونے والوں کی دستار بندی میں بھی شریک ہوا، مجمع کثیر تھا جلسہ بھی بے حد کامیاب رہا، میں نے دیکھا کہ درسگاہ کی عمارت بھی پختہ بن گئی

ہے اور طلبہ کی بھی کثرت ہے، اور مدرسین بھی دل جمعی کے ساتھ اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ طبیعت بہت خوش ہوئی کہ مولانا نے ایک بڑا کام کر ڈالا، مولانا مرحوم تو جلسہ کے اختتام تک تشریف نہ لاسکے نگران کے جانشین اور دار العلوم کے عملہ نے اخیر تک تمام کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیے۔ اس بار مولانا کا یہ قلندرانہ ادا بھی خوب مزہ دے گئی۔ بقول کسے:

ہم نے ہر کام کی تکمیل خدا پر چھوڑی اس کے دیوانوں کو انجام کی پرواہ نہیں

اس کے بعد بھی مولانا سے مسلسل ملاقاتیں ہوتی رہیں، ہر بار اسی بے تکلفی دلچسپی اور محنت سے ملتے اور گروپ بندی سے الگ تھلگ اپنے طور پر دین کی خدمات کرتے تھے۔

(۱) حضرت مولانا ایک محتاط اور متدین عالم تھے، بمبئی میں کپڑے مشین کے ذریعے دھوتے ہیں، اور بغیر نچوڑے ہوئے مشین سے ہی کپڑا خشک کرلیا جاتا ہے، اس لیے مولانا جب تک بمبئی میں رہتے واشنگ کمپنیوں میں دھلے ہوئے کپڑے کھنگال کر اور نچوڑ کر پہنتے۔

(۲) کسی بھی بدمذہب سے مداہنت کے روادار نہ تھے، چاہے اس کے لیے کتنی ہی بڑی قربانی دینا پڑے۔ بمبئی میں مصطفیٰ بازار کی مسجد میں حضرت مولانا خطیب مقرر کیے گئے، اس کے ٹرسٹیوں میں کچھ لوگ ایسے تھے جو وہابیوں کی تردید کو منع کرتے تھے اور حضرت مولانا نے وہاں کی امامت سے انکار کردیا اور ملازمت ترک کردی۔

(۳) ان کے مواعظ کا موضوع عام طور سے سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فضائل کا بیان اور بدمذہبوں کا رد ہوا کرتا تھا۔

(۴) حضرت مولانا ایک ذی استعداد عالم تھے، ساتھ ہی علم تصوف میں بھی درک حاصل تھا۔

(۵) کانپور، جھانسی، بمبئی وغیرہ اطراف ہند میں آپ کے ارادت مندوں اور

مریدین کا وسیع حلقہ ہے اور آپ کے مریدین شیفتگی کی حد تک آپ سے حسن اعتقاد رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی قبر انور پر رحمتوں کی بارش فرمائے اور ان کے اخلاف و متوسلین کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔ فقط

عبدالمنان اعظمی، شمس العلوم گھوسی ضلع مئو

٢/اگست ١٩٩٩ء

١

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ رئیس القلم علامہ ارشد القادری

صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ولادت ٥/ مارچ ١٩٢٥ء وفات ٢٩/ اپریل ٢٠٠٢ء

مجھ سے پانچ ماہ ٢١/ یوم پہلے دنیا میں تشریف لائے اور مجھ سے چھ سال بعد دار العلوم اشرفیہ میں داخل ہوئے، میں ٣٠ء سے ہی مدرسہ میں پڑھتا تھا اور مولانا ٣٦ء میں دار العلوم میں داخل ہوئے اور ٹھیک ١٩٤٤ء میں آٹھ سال بعد اور مجھ سے دو سال پہلے ہی دار العلوم اشرفیہ کا دس سالہ کورس مکمل کرنے کے بعد جلسہ دستار بندی کا بھی انتظار نہیں کیا، جامع مسجد میں سند فراغت حاصل کی، آپ کے ساتھ فارغ ہونے والوں میں امام صاحب محمد حسین سمند پوری تھے جنھوں نے پوری زندگی ایک مسجد میں نہایت پاکباز دیانت دار بااصول امامت کا ریکارڈ قائم کیا۔ دوسرے بزرگ مولانا مولوی محمد شفیع صاحب قریشی تھے، جنھوں نے ابتدا درس گاہ سے کی اور ترقی کرتے ہوئے الجامعۃ الاشرفیہ کی نظامت عظمیٰ کے درجہ تک پہونچے۔ اور تیسرے آپ تھے جنھوں پوری دنیا میں اتنے ادارے، اسکول، مساجد انجمنیں اور تنظیمیں قائم کیں جس کا اب سمیٹنا قلم کے لیے مشکل ہو رہا ہے، ایک اندازے کے مطابق آپ نے ہندو بیرون ہند کل ملا کر ٢٦/ ادارے قائم کیے، اور ٨٨/ مسجدیں قائم کیں، ملکی وغیر ملکی مؤتمرات اور کانفرنسیں اس کے علاوہ ہیں، تب کھلا کہ ابتدا میں تعلیمی سرعت رفتار کے پیچھے یہ راز عیاں تھا۔

کام تھے عشق میں بہت سر پر
ہم بھی فارغ ہوئے شتابی سے

حضرت مولانا علیہ الرحمہ جب دار العلوم اشرفیہ پہونچے تو اس کی نو تعمیر دو منزلہ شاندار عمارت کا ڈھانچا تیار ہوا تھا اور اس کی فٹنگ کا کام جاری تھا، ساتھ ہی ساتھ تعلیم بھی

اسی میں ہو رہی تھی۔ اور مدرسہ کی قدیم پوش عمارت کے ایک حصہ میں حضور حافظ ملت کا قیام تھا بقیہ حصہ طلبہ کی قیام گاہ کے کام آتا تھا، اور اب اس کو پرانہ مدرسہ کہا جاتا ہے، نئی بلڈنگ میں بھی طلبہ ومدرسین دونوں ہی رہتے تھے، عمارت اور رہائش کی آسائش کے اعتبار سے عمارت ہی شاندار اور آرام دہ تھی، مگر جن کا انتظام پرانے مدرسہ میں رہتا وہ اوپر کلاس کے طلبہ میں شمار ہوتے اور نئی عمارت ایک کلاس نیچے سمجھی جاتی تھی۔

اور وہ طلبہ جو مقامی تھے وہ تو سعادتوں سے محروم ہوتے جاتے تھے۔ حضرت صدر الشریعہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے رشتہ کی وجہ سے علامہ علیہ الرحمہ اوپر کلاس میں قیام پذیر تھے، اس کی خصوصیت یہ تھی کہ طلبہ ایک طرح حضرت حافظ ملت رحمۃ اللہ علیہ کے زیر تربیت اور مسلسل نگرانی میں رہتے تھے اور ہم مقامی طالب علم اس تعلیمی ماحول سے الگ تھلک بس اوقات درس میں درس گاہ میں ملاقات ہوتی۔

ایک روز میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ سبق کی تکرار میں مصروف تھا۔ ایک طالب جوتہ، شیروانی، ٹوپی میں ملبوس باوضع ہمارے پاس آیا ہم نے بیٹھنے کی دعوت دی لیکن وہ کھڑا ہی رہا، کچھ بات چیت اور تعارف ہوا، مگر جس طرح چھوٹی عمر کے بچے ایک دوسرے سے فوراً بے تکلف ہو جاتے اس کی منزل میں نہیں، جتنی دیر رہے سنجیدہ، کم گو اور اپنے کو لیے ہوئے ہی رہے اور چلے گئے۔ اس وقت تو اس کم آمیزی کی وجہ سمجھ میں نہ آئی لیکن اب خیال ہوتا ہے کہ یہ وہی چیز تھی جس کو حضرت سعدی علیہ الرحمہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

بالائے سرش ز ہوشمندی　　می تافت ستارۂ بلندی

یہ تھے ہمارے ماموں جانی ارشد القادری صاحب علیہ الرحمہ جو اپنی خوردی میں بھی بزرگی کا انداز لیے ہوے تھے۔ ان کا ریکارڈ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر درجہ میں اعلیٰ نمبروں سے پاس ہوتے رہے۔ کبھی نچلے بیٹھے نہیں دیکھا، زیادہ تر لکھنے میں مصروف رہتے جس کی وجہ سے ان کا خط بے حد خوشنما ہو گیا تھا۔ پرانے مدرسہ میں قیام اور حضور حافظ ملت کی توجہ خاص کے باعث دوران تعلیم ان سے کچھ زیادہ تعلق نہیں رہا۔

حضرت مولانا نے حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے سلسلہ میں اپنے سوانحی خاکہ میں جو یہ تحریر فرمایا ہے بالکل سچ لکھا ہے کہ دار العلوم اشرفیہ میں مجھے جلالۃ العلم استاذ العلما حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کی آغوش تربیت مل گئی، میرے پاس فکر وشعور اور علم وفن کی جو بھی پونجی ہے، وہ انھیں کے علمی فیضان اور روحانی توجہ اور ان کی مستجاب دعا کی برکت ہے۔

یہ جب تک مبارک پور میں رہے ان کی ہر شوخی ان کی نظر میں بچپنا اور ہر خوبی ایک کارنامہ رہی۔

حضرت حافظ ملت کی تشریف آوری کی برکت سے مبارک پور کے سنی مسلمانوں میں ایک غیر معمولی جوش پیدا ہو گیا تھا۔ اور شروع شروع میں تعلیمی اور تعمیری دونوں مصارف کا بوجھ قصبہ کے سنی مسلمانوں کی ہی قوت بازو پر تھا۔ تعمیر کے لیے ہنگامی چندہ ہوتا، طریقہ یہ تھا کہ ہزار ہا آدمی چندہ دینے والوں کے دروازوں پر تھیلا لے کر پہونچتے اور نظم خوانوں کی ٹولیاں ہوتیں جو باری باری سے نظم خوانی کرتیں اور نظمیں وہیں کے مقامی شاعروں کے زور فکر کا نتیجہ ہوتیں۔ جس میں زماں صاحب ساکن محلہ پورہ رانی کا کردار بنیادی تھا۔ روزانہ تقریبا کوئی نہ کوئی تازہ نظم ضرور تیار کیے رہتے، یہ ایک کہنہ مشق صاحب دیوان شاعر اور غزل نعت وغیرہ اصناف شاعری پر پوری قدرت رکھتے تھے۔

ان کی بنائی ہوئی نظم کے چند اشعار یہ ہیں:

ہم اتنا مال وزر نظر تمنا کر کے چھوڑیں گے ۔۔۔ تمام اغنیا کو محو تماشا کر کے چھوڑیں گے
جہاں میں حسن عالم گیر پیدا کر کے چھوڑیں گے ۔۔۔ تمھیں ہم قیس کے مانند شیدا کر کے چھوڑیں گے
ہم اپنے مدرسہ کو اشک پلا کر کے چھوڑیں گے ۔۔۔ ہیں دشمن لاکھ ہمارے زور آور کچھ نہیں پروا
نہیں ہے پاس ہمارے سیم وزر کچھ نہیں پروا ۔۔۔ ہمیشہ سے ہیں ہم غربت کے خوگر کچھ نہیں پروا
اندھیرا ہے ہمارے دین کا گھر کچھ نہیں پروا ۔۔۔ لے داغ جگر سے ہم اجالا کر کے چھوڑیں گے

میرے استاذ گرامی حضرت مولانا عبد المصطفیٰ اعظمی ایک بڑے عالم ہندوستان کے مقرر اور بلند پایہ شاعر کی نظموں میں عجب شوکت اور درد ہوتا تھا، جب مبارک پور کے

مشہور نعت خواں نور العین اسے پڑھتے تو دھوم مچ جاتی تھی۔

دولت ملی جو دیں کی لٹائی نہ جائے گی یاد رسول دل سے بھلائی نہ جائے گی

بڑھتا رہے گا تیری بڑائی نہ جائے گی مصباح تیری شان گھٹائی نہ جائے گی

جو جل چکی ہے شمع بجھائی نہ جائے گی

مصباح یعنی دین کا ملت کا پاسباں اے فخر ہند فخر جہاں فخر سنیاں

اے مصطفیٰ کے عہد و محبت کے گلستاں بن جائے گا اگر تو محرم کی داستاں

واللہ ہم سے عید منائی نہ جائے گی

حضرت علامہ علیہ الرحمہ مبارک پور پہونچے تو سنیوں کی مرکزی جامع مسجد کی تعمیر جدید کا چندہ ہو رہا تھا، مجھے یہ نہیں معلوم کی پہلے سے بھی ان کو شعر کی کچھ مشق تھی یا اسی وقت کا یہ شوق تھا لیکن استاذوں کے اس معرکہ شعر و شاعری میں حضرت علامہ نے بھی اس معرکہ کی نظمیں کہیں کہ پورے مبارک پور میں ان کی دھوم مچ گئی۔ اور جب تک وہاں رہے اس کمال سے وہ معروف و مشہور ہے اور محبوب و منظور رہے۔ ان کی ایک نظم کی ردیف ایوان سجایا جائے گا۔ فرمان بتایا جائے گا، وغیرہ تھی۔

ان کی نظم تو مجھے یاد رہی نہیں ایک نعت کے چند شعر دل پر نقش ہو کر رہ گئے ہیں آپ بھی سن لیں:

یا نبی یاد تری دل سے میرے کیوں جائے

بخت بیدار مرا جاگ کے کیوں سو جائے

ٹوٹ جائے غم و کلفت کی چٹانوں کا غرور سبز گنبد سے اگر دل کی صدا ٹکرائے

بال کھولیں تو بھری دھوپ میں ساون برسے مسکرا دیں تو میری خاک بھی زندہ ہو جائے

آ گیا والی بطحا کی اماں میں ارشد کہدو آتا ہے اگر پیک اجل آجائے

حضرت علامہ ایک ذی استعداد عالم دین تھے، ایک غیر معمولی صاحب قلم تھے، ایک زیرک حاضر جواب، اور مخالف پر چھا جانے والے مناظر تھے۔ اک عظیم معظم تاریخ

ساز کے علاوہ ہندوستان گیر ہی نہیں، عالم گیر عالم اہل سنت تھے، ان کے قلم سے نکلی ہوئی ۴۴ عدد دینی کتابیں ہیں جن میں ۳ کتابوں کے بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ ان کی شاہ کار تحریریں ہیں، ان میں ایک کا نام جماعت اسلامی۔ دوسری کا نام تبلیغی جماعت۔ اور تیسری کا نام زلزلہ ہے۔ یوں تو ان کی تمام تحریریں بے حد دل کش معلومات آمیز ہوتی ہیں۔ لیکن ان کا انداز بیان، حسن ترتیب، تحریر کی متانت اور دل میں تیر کی طرح اتر جانے والی تاثیری قوت اور بلاغت کی انتہائی بلندیوں کو چھو رہی آخری کتاب ہے، منظور احمد صاحب نعمانی نے اپنی زبان میں اس کی انقلابی حیثیت کا اعتراف کیا، مولوی عامر عثمانی نے اس کی حقیقت پسندی کو سراہا اور حقیقی معنوں میں لاجواب کتاب قرار دیا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے مختصر وجود میں بے تحاشا تاثیری قوت ودیعت فرمائی تھی۔ وہ جنگل میں بھی گئے تو وہاں منگل ہی منگل ہو گیا اور ویرانہ میں قدم رکھ دیا تو ہر چہار سمت علم وحکمت کے گلشن لہلہا اٹھے۔

آج سے پچاس سال قبل جب وہ جمشید پور تشریف لے گئے تھے۔ یہاں مخالف خیمہ میں ایسی اتھل پتھل پیدا ہو گئی تھی کی یہاں کہ پل پل کی خبر ہم لوگوں کو مبارک پور میں ملتی رہتی تھی، غالباً اسی زمانہ کی یہ دل چسپ خبر ہے کہ خاص شہر جمشید پور یا اس کے آس پاس میں کہیں مناظرہ ہوا، اس میں اصحاب دیوبند کے فتح کی خبر تاریخ مناظرہ سے دو یوم قبل ہی مبارک پور کے گلی کوچوں میں چسپاں ہو گئے تھے۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ کہتا تھا کہ اس وقت تلشی پور میں تھا۔ حضرت مرحوم نے مجھے ایک وسیع الشالی اجلاس کے لیے بلایا، میں یہاں آیا کہ دھت کی ڈیہہ کی وہ گلی جس میں مولانا کا قیام تھا دو طرفہ کچا مکان، اور چھت سفالہ پوش تھی۔ کسی گھر کے ایک کمرے میں ان کا قیام تھا وہیں مجھے بھی ٹھہرایا دار العلوم اشرفیہ ابھی نیا نیا تھا جس کی عمارت بہت شاندار تھی اور تلشی پور میں جہاں میں رہتا تھا وہاں بھی عمارت پختہ تھی، میں نے مولانا سے عرض کیا: مدرسہ کہاں ہے؟ تو فرمایا گھبراؤ مت ابھی دیکھ لو گے، تھوڑی دیر کے بعد چھوٹے

چھوٹے بچے بغل میں سپارہ اور کتاب لیے ہوئے آئے گلی میں پوری دیوار سے لگ کر بیٹھ گئے۔اور پڑھانے مدرس بھی آگئے۔تو مولانا نے فرمایا: دیکھیے یہی میرا مدرسہ ہے، میں نے کہا: ابھی دھوپ آجائے فرمایا: دس گیارہ بجے تک اس طرف بیٹھ کر پڑھتے ہیں، ۱۲ر بجے کے بعد پچھم طرف اولتی کے سایہ میں بیٹھ کر پڑھیں گے۔اب آج آپ اسی مرد حق کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آتے ہیں۔ذرا ان کھپریل اور جھونپڑیوں کی اولتی کا تصور تو کیجیے اور یہ چاروں طرف پھیلی ہوئی عمارتیں دیکھیے۔اور اس مرد مجاہد کی دور اندیشی پیش بینی اور صبر واستقلال کو سلام کیجیے، شاید اقبال نے ایسے موقع کے لیے کہا تھا:

جو ہو ذوق یقیں کامل تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

پچیسوں سال پہلے کی بات ہے: ایک دفعہ میلاد کے جلسہ میں میگھالے جانا ہوا اور بھی کئی علماے کرام ساتھ ساتھ تھے۔گوہاٹی سے میگھالے کا دروازہ ہے۔وہاں سے کوئی سو میل اوپر میگھالے کی آبادی ہے، ہم لوگ تو اجلاس سے فارغ ہو کر واپس ہوئے تو واپسی پر اپنی ڈیوٹی پر لگ گئے۔مگر خدا جانے اس قادر وتوانا نے اپنے اس بندۂ خاص کی نگاہ میں کیا بات تھی کہ وہ سو پچاس سال پہلے یہاں کیا ہوگا دیکھ لیا کرتا تھا۔

واپسی میں آپ وہیں مہینوں رہ گئے، لاکھوں روپے کا چندہ کر دیا، کافی سے زیادہ زمین اور کچھ عمارتیں بھی کھڑی کر دیں اور وہیں ادارے کے خدوخال نمایاں کر دیے۔آپ سوچیں کوئی مبالغہ ملاتا ہے نہیں زبان کا بھی بہت کچھ فرق، مگر: دیوانہ بکار خویش ہوشیار۔ آپ نے ایسا زوردار صور پھونکا کہ ہر طرح کی موجوں نے آج تک اس کو امانت بنا کر اپنے سینے میں رکھ چھوڑا ہے۔

کلکتہ شہر جہاں روزی کی تلاش میں اِدھر اُدھر سے لوگ وہاں آتے ہیں، مولوی ابو الکلام آزاد کے والد حضرت مولانا منور الدین صاحب جیسے شیر دل سنی عالم کی بنائی ہوئی مسجد ہے، لیکن زمانہ نے ایسی کروٹ بدلی کہ وہاں کسی مسجد میں سنی مسلمانوں کو نماز ملنا

مشکل، اور کوئی سنی عالم جائے تو نماز کہاں پڑھے، ہمارے مست قلندر مولانا ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ وہاں پہونچے، چوٹانگی کے کسی کونہ میں کسی رشتہ دار کے واسطے سے بیٹھنے کو جگہ ملی، بالکل بے سروسامانی میں آپ نے وہاں سے پہلے جام کوثر پھر جام نور نکالا، سب سے پہلی میلاد کانفرنس کی، وہ جمیع مذاہب کے سامعین کا مشترکہ پلیٹ فارم تھا، میں بھی اس میں موجود تھا، اس کے ذریعہ جیسے پورے کلکتہ کو بھولا ہوا سبق یاد آگیا، بس چند دن گزرے کہ کہیں نہ کہیں کانفرنس، جلسہ، جلوس اس کثرت سے ہونے لگے کہ ایک سلسلہ چل پڑا۔ واہ مولانا قادری! آپ کے بارے میں کیا کہا جائے:

موج نسیم بار کے قربان جایئے
حسن چمن میں آکے عجب گل کتر گئی

ترے آنے سے پہلے کب تھا یہ دستور دنیا کا
بہار آئی نہیں لائی گئی مسلمانوں کے لیے

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

تذکرہ مولانا ثناء المصطفیٰ امجدی

حضرت مولانا المکرم مولوی ثناء المصطفیٰ صاحب قادری امجدی علیہ الرحمہ ابن حضور صدر الشریعہ حضرت مولانا شاہ محمد امجد علی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ۔ مدینۃ العلما گھوسی ضلع اعظم گڑھ کی خاک سے اٹھے۔ دار العلوم اشرفیہ مبارکپور سے درس نظامیہ کی تکمیل کی۔ اور اڑیسہ اور مغربی بنگال کو اپنی جدوجہد کی آماجگاہ بنایا۔

دار العلوم ضیاء الاسلام ٹکیہ پاڑہ میں تدریس کی خدمت پر مامور رہے۔ تقرر ان کا درس نظامی کے ابتدائی درجات میں ہوا لیکن ترقی کرتے کرتے وہاں کے شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے۔

اس دوران کتنے انقلاب آئے اور آندھیاں اٹھیں، اور کیسے کیسے حضرات کا آنا جانا لگا رہا مگر مولانا ہمیشہ کوہ استقلال وجبل استقامت بن کر تلخ وترش حالات میں صبر وشکر کے ساتھ دار العلوم کی خدمت انجام دیتے رہے۔

آخر میں سفر آخرت اختیار کیا تو وہیں کی زمین کے پیوند ہوگئے۔ یہ مولانا کی زندگی کا ایک غیر معمولی کارنامہ ہے جس کی مثال علما و مدرسین کی زندگی میں کم ہی ملے گی۔ تدریس کے ساتھ ساتھ وعظ وتقریر کے میدان میں بھی اس علاقہ میں وہ کافی مقبول تھے۔ مجھ پر بہت مہربان تھے۔ اور میں ان کی طرف اس وجہ سے مائل ہوا کہ مجھ سے کبھی کبھی ان کے اطوار واخلاق میں حضور صدر الشریعہ کا جلوہ نظر آیا۔ جب میرا ادھر جانا ہوتا یا وہ ادھر وطن آتے تو مجھ سے بڑی محبت سے ملتے۔ اور زمانہ کی بوقلمونیوں کی داستان مزے لے لے کر سناتے۔ ان کے گرامی قدر بھائیوں میں کئی حضرات عالی مرتبت اور بلند پایہ بھی تھے۔ مگر

ان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ کبھی کسی کے بار خاطر نہ بنے اور سب سے الگ اپنی دنیا بنائی، گویا وہ ان اشعار کی سچی تصویر تھے:

بنا لیتا ہے اکثر خون دل سے اک چمن اپنا ہو پابند قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے
سزا کوتاہی ذوق عمل کی ہے گرفتاری جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

انھوں نے اپنے پیچھے ایک بھرا پورا خاندان چھوڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے پسماندگان کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور دارین کی صلاح و فلاح سے نوازے۔

مجھے یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی کہ مغربی بنگال کے اہل اسلام نے ان کی قدر پہچانی اور سنی علما کونسل کی طرف سے ان کی حیات اور کارناموں پر ایک صحیفہ شائع کیا۔ وہ لوگ قابل مبارک باد ہیں جو اپنے بزرگوں کو یاد رکھتے ہیں۔ حضرت شیخ سعدی شیرازی علیہ الرحمہ نے فرمایا:

نام نیکِ رفتگان ضائع مکن تا بماند نام نیکت یادگار

نحمد ونصلی علی رسولہ الکریم

تذکرہ مفتی اعظم راجستھان

محب محترم مفتی آفاق، حضرت مولانا مولوی محمد اشفاق دام بالفضل والاکرام

موجودہ دور انحطاط میں صف علما کے اندر ایک مغتنم روزگار ہستی ہیں۔

جسم نحیف ونزار، لاغر و منحنی طویل العمری کے بوجھ سے گراں بار، مگر قوت ارادی کی سختی اور عزم جوان کی بلندی کا وہ عالم کہ کوہ ہمالہ کی سختی اور بلندی بھی اس کے آگے شرمسار، طوفان کی زد پر چراغ جلانے کا محاورہ ہم نے سنا تھا، مگر شمع حقیقت کی لو کو آپ کی ذات میں ہم نے مجسم دیکھا:

تری شمع حق نما میں ہے وہ روز رہنمائی　　　کہ ہزار آندھیوں میں نہ بجھی نہ جھلملائی

علوم دین میں بلند دست گاہ کے حامل اور عملی تصوف کے اسوۂ کامل۔ علم وآگہی سے آراستہ، اور حسن اخلاق کی خوبی سے پیراستہ۔ ارشاد ورہنمائی تاثیر کی قوت سے مالا مال، اور عشق خدا ورسول سے سرشار نہال، حق گوئی اور حق پسندی شاہ کار، اور دین ودیانت میں سرآمد روزگار، کس کس خوبی کا ذکر کیا جائے۔ اور کس کس کمال کا چرچا۔

داماں نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار　　　گلچیں تو از تنگی داماں گلہ دارد

لوگ بزرگوں کی کرامت کے بڑے شائق ہوتے ہیں۔ مگر میں ان کی اس خوبی کو ان کی سب سے بڑی کرامت سمجھتا ہوں کہ انھوں نے راجستھان جیسی سنگلاخ اور بے آب وگیاہ زمین کو گلشن مدینہ کے پھولوں سے لالہ زار، مشکبار، اور پر بہار بنادیا، گاؤں گاؤں، قریہ قریہ، شہر شہر، اور دیار و امصار ہر طرف اور ہر چہار جانب مدرسوں دارالافتاؤں، اور اسلامی اداروں کی قطار کھڑی کردی۔ بقول مجروح سلطان پوری:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر　　　لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ایسے مخلص بزرگ کی روداد حیات، بلاشبہ عام مسلمانوں کے لیے راہ نجات، اور خواص کے لیے شمع حیات ثابت ہوگی۔ قابل مبارک باد ہیں وہ حضرات جو حضرت مولانا کے کارناموں کا مجموعہ شائع کررہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے اور سب کو دارین کی صلاح وفلاح سے مالا مال کرے۔ مولانا محترم کی عمر میں برکت اور ان کے فوائد کو عام وتام فرمائے۔ آمین فقط

کاروان شوق

(اشرفیہ کے لیے بحر العلوم کا دورۂ ہند)

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

ہمارے مقامی احباب کا عرصہ سے یہ تقاضا تھا کہ الجامعۃ الاشرفیہ کے تعاون کے لیے ملک بلکہ بیرون ملک بھی جدوجہد جاری کی جائے لیکن اپنی حیثیت کو دیکھتے ہوئے اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ ادھر تقاضا کی شدت ادھر ہمارے محترم مولانا انور علی صاحب سلمہ ربہ کا اصرار قسمت آزمائی کا ایک موقع فراہم ہوگیا۔ اور راقم الحروف اور ادارے کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا الحاج قاری محمد یحییٰ صاحب پر مشتمل ایک وفد جنوبی ہند کے علاقہ کرنا ٹک کے بعض حصوں کا دورہ کرنے کے لیے ترتیب پا گیا۔ بھلی سے مولانا محمد بن حسن مالا باری زید مجدہم اور جناب مولانا انور علی صاحب موصوف بھی ساتھ ہوگئے۔

کرناٹک کا صوبہ قدرتی حسن اور خداداد دولت سے مالا مال ہے۔ سر سبز و شاداب پہاڑیاں، خوبصورت کافی کے باغ اور دور دور تک لہلہاتے ہوئے چھالیا اور ناریل کے درخت عجیب خوش نما منظر پیش کرتے ہیں۔ زمین کا سینہ انواع واقسام کے معدنیات سے لبریز ہے، اور کھیت ہر قسم کی پیداوار کے صالح، حد یہ ہے کہ وہاں کے جنگل صندل کی برآمد کے لیے کافی شہرت رکھتے ہیں۔

آب وہوا کے موافق وہاں کے انسانوں میں بھی صالحیت کا عنصر غالب ہے، مسلمانوں کی عام آبادی خوش عقیدہ مسلمانوں پر مشتمل ہے، مگر چوں کہ علم دین کا وہاں فروغ نہیں اس لیے سادہ لوح سینوں میں کہیں کہیں دیو بندیت وہابیت اور مودودیت

وغیرہ کے جھاڑ جھنکاڑ اگ آئے ہیں، اور اب کہیں کہیں صورت حال حرب وضرب عقائد کی بھی پیدا ہو گئی ہے، اس لیے ہمارے مبلغین معلمین، اور اماموں کو نہایت ژرف نگاہی، اور دقت نظر سے کام لینے کی ضرورت ہے، تا کہ کافہ اہل اسلام حقانیت کے نور سے بھر پور بہرہ ور ہوں، ذرا بھی بے توجہی سے کام لیا گیا، تو ڈر اس بات کا ہے کہ عامۃ الناس جو مذہب سے یوں ہی بیگانہ ہیں، دین سے سخت متنفر ہو جائیں گے، یہ گذارش اس لیے کر دی گئی ہے، کہ اس دورہ میں جگہ جگہ ہم کو ایسے سوالات سے دو چار ہونا پڑا، ویسے جنوبی ہند کو بد مذہبی کے سیلاب سے بچانے کے لیے (جو اس علاقہ کے دروازے پر دستک دے رہا ہے) ادھر تو جہ کی بڑی ضروت ہے۔

آمدم بر سر مطلب۔ ہمارے دورے کی ابتدا عروس البلاد بمبئی سے ہوئی جہاں ہماری میزبانی ہمدردا اور غم خواری کے لیے الجامعۃ الاشرفیہ کے قدیم خیر خواہ عالی جناب سیٹھ شمس الحق صاحب علیمی، مجاہد سنیت جناب سیٹھ محمد مصطفیٰ صاحب، نیک خصلت و نیک نہاد اعلیٰ جناب الحاج مہدی خاں صاحب جیسے حضرات موجود ہیں۔ اس طرح مولانا عبد القیوم خطیب جامع مسجد وکرولی، مولانا محمد خلیل صاحب خطیب جامع مسجد ماہم شریف، اور حضرت مولانا الشاہ سید محمد حامد اشرف صاحب بانی دار العلوم محمدیہ کا نام بھولنا ناسپاسی ہو گی۔

کلیان میں خطیب میمن مسجد عالی جناب مولانا ظفر الدین اور ان کے احباب سے ہم بہت زیادہ پر امید ہیں، جن میں ایک صاحب نے (جو ایک بہترین بلڈنگ کنٹراکٹر ہیں) الجامعۃ الاشرفیہ کے سنٹرل بلڈنگ کے گنبد کی تعمیر کے وقت فنی تعاون کا بھی وعدہ فرمایا۔

''بھیونڈی'' جو الجامعۃ الاشرفیہ کے معاون شہروں میں پہلی صف میں ہے، اور جہاں کے صوفی با صفا، حضرت الحاج مرشد عبد الغفور صاحب دام بالفضل، اشرفیہ کے دست بازو ہیں، آپ کے صاحب زادہ بلند اقبال عالی جناب الحاج مشتاق احمد صاحب حج وزیارت کی سعادت سے بہرہ ور ہو کر تشریف لائے ہیں، ان کی خدمت میں بھی حاضری

ہوئی، ادارہ موصوف کو اس سعادت پر مبارک باد پیش کرتا ہے۔

صوبہ کرناٹک میں ہماری پہلی قیام گاہ مشہور شہر ہبلی ہوا جس کے مرکزی ادارہ دار العلوم غوثیہ کی شہرت حلقہ اہل سنت میں دور دور تک ہے، لیکن ہمیں یہ دیکھ کر بے حد افسوس ہوا کہ نہایت شاندار عمارت ہوتے ہوئے بھی یہ دار العلوم آج کل تقریباً اجاڑ پڑا ہوا ہے۔ اور لوگ ہر مولوی صورت نئے آدمی کو دیکھ کر سوال کرتے ہیں کہ آپ ہمارے مدرسہ میں پڑھانے آئے ہیں، عرصہ سے وہاں درس نظامی کے اعلیٰ درجات کے لیے کوئی مدرس نہیں ہے، اس لیے طلبہ ایک ایک کر کے بھاگ رہے ہیں، ہم نے وہاں ذمہ داروں سے بھی عرض کیا اور دعا بھی کرتے ہیں کہ مولیٰ عز وجل جلد اس کے لیے کوئی سبیل پیدا فرمائے

اس شہر خوش سواد میں ہمارے خاص شکریہ کے مستحق مندرجہ ذیل احباب اہل سنت ہیں۔

مولانا حافظ مقبول احمد صاحب خطیب نورانی مسجد، عالی جناب امام الدین اے لطیف ملاں، عالی جناب محی الدین شاہ صاحب ہلور، عالی جناب بابا جان بادامی، عالی جناب عبد الرشید صاحب بینار وغیرہم احباب اہل سنت، انکولا ضلع کاروار کے احباب اہل سنت بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے بے کسی سابقہ معرفت کے صرف حضرت مولانا محمد بن حسن زید مجدہم کی اپیل پر دار العلوم کی اعانت میں حصہ لیا۔

ہمارے اس سفر کا خاص مقصد ''مُڈگیرہ'' ضلع چک منگلور تھا، جہاں مولانا العلام مولوی انور علی صاحب دام فضلہ خطیب اور دینی سربراہ ہیں۔ یوں تو اس علاقہ میں ہمارے ہمدردوں، بہی خواہوں اور الجامعۃ الاشرفیہ کے کاز سے دل چسپی رکھنے والوں کی ایک نہ ختم ہونے والی فہرست ہے لیکن مندرجہ ذیل حضرات ہمارے خاص شکریہ کے مستحق ہیں۔

(۱) ''ہاسن'' میں۔ ''الحاج ایم غلام محمود'' الحاج عبد القادر صاحب بی اے۔

(۲) چک منگلور میں سید منیر احمد کافی کارنر۔ آپ سے ملنے کے لیے جب ہم ان کے در دولت پر پہونچے تو ہم کو ایک نہایت شاندار اور آراستہ ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔

ہم انتظار کی گھڑیوں سے اکتا رہے تھے کہ اندر سے سوٹ بوٹ میں ملبوس ایک اپٹوڈیٹ انسان برآمد ہوئے، آتے ہی معذرت کی کہ مصروفیت کی وجہ سے میں ذرا دیر سے حاضر ہوا۔ مگر جب باتیں ہونے لگیں تو اس ماڈرن پوز کی کچلی سے ایک مرد مومن درد مند کا ہیولی برآمد ہوا۔ آپ کی پر جوش اور مومنانہ باتیں دانش مندانہ اور عمل سے بھرپور جدوجہد کا حال سن کر یہ حسرت دل میں بیدار ہوئی کہ کاش بھارت میں مسلم لیڈروں میں سے چند آدمیوں کے سوچنے اور عمل کرنے کا انداز انھیں خطوط پر استوار ہو جاتا تو یہ قوم مایوسیوں کے اندھیرے سے امید اور حوصلہ کے اجالے میں آجاتی۔

(۳)'' آلودر'' میں ایچ ایم اصغر خاں۔ اور الحاج عبد الحمید اور ان کے برادران۔ موصوف اس علاقہ کے متمول ترین عمائد اہل اسلام میں سے ہیں۔ آپ نے ہمارا تعاون بھی کیا اور مزید اعانت کا وعدہ بھی فرمایا۔ یہ اس درجہ دیندار اور مذہبی انسان ہیں کہ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود اس علاقہ کے متعدد مقامات پر ہونے والے دینی اجتماعات میں ۲،۲ بجے رات تک شریک رہتے، اور پھر اسی وقت رات ہی میں اپنی گاڑی سے واپس ہو جاتے۔ اس علاقہ میں حاجی صاحب موصوف اور ان جیسے دوسرے دین دار مالداروں کو دیکھ کر اکثر اپنے علاقہ کے مالدار یاد آجاتے۔ اور اکثر سوچتا اے کاش دوسری جگہوں کے اصحاب دولت بھی دین سے اتنے ہی قریب ہوتے کہ یہی حقیقی دانشمندی ہے، دین سے بے پرواہو کر دنیا حاصل کرنا کیا بڑا کمال ہے؟

(۴)''مڈ گیرہ'' اور ''بڈ منے'' کے احباب اہل سنت میں تین حضرات کی مہربانیوں کے انمٹ نقوش ہمارے دل پر ثبت ہیں۔

عالی جناب رئیس قوم الحاج ثناء اللہ صاحب، جن کی خوش عقیدگی تصلب فی الدین اور علمائے اہل سنت اور اہل مشائخ طریقت سے محبت کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ موصوف قصبہ کی جامع مسجد کے منتظم اور قومی اور ملی انجمن کے مہتمم کار، آپ نے انتھک محنت سے زیر انتظام مسجد کی ترقی کے لیے ایک عمارت تعمیر کرائی ہے تا کہ مسجد کے

مصارف کا مستقبل مستحکم ہو جائے، میری ملاقات آپ سے اس سے قبل بھی تھی۔ لیکن اس دفعہ کی ملاقات مغتنمات سفر میں سے ہے۔

(۵) گرامی قدر محسن قوم جناب رحمت اللہ صاحب عرف ''رحمت بھائی'' رئیس ابن رئیس، شریف ابن شریف، انھیں پوری جماعت میں سب سے زیادہ ذی علم، سنجیدہ، اور متین آپ سے تعلق رکھنے والی ہر چیز سے پاکیزگی، خوش شفتگی اور اعلیٰ ذوقی ظاہر، گویا ہر طرح ایک بھاری بھرکم انسان لیکن اسلامی تواضع، عربی مہمان نوازی، اور خدمت خلق کا اعلیٰ نمونہ۔ ان حضرات کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ اس علاقہ میں اسلامی اقدار زندہ ہیں اور اندازہ ہوتا تھا کہ جب پورا معاشرہ انہیں مبارک روایات کا حامل رہا ہوگا تو کیا عالم رہا ہوگا

''الحاج محمد اسحٰق صاحب'' آپ عجیب جامع الصفات بزرگ ہیں ''سیرت وصورت، اعمال واشغال کے لحاظ سے خالص مشرقی بلکہ اسلامی بلکہ صوفی باصفا اور مکان لباس بود وباش کے لحاظ سے بالکل مغربی، چہرے پر داڑھی، اور سر پر دستار جسم پر کوٹ پتلون اس ملے جلے پوز میں جب ٹیلیفون پر کسی نہایت روانی کے ساتھ انگریزی میں بات کر رہے ہیں، تو دیکھنے والوں کو عجب مزا آتا ہے۔

پوری سوسائٹی اور ہم چشموں میں بزرگ ومحترم اور سید القوم کا درجہ رکھتے ہیں اور شخصیت اتنی باغ وبہار کہ جہاں تشریف فرما ہوں مجلس میں لطیفوں کے پھول کھل اٹھتے ہیں اور محفل زعفران زار بن جاتی ہے، خصوصی طور پر ان کی عنایات بے نہایت کا شکریہ ہم سے نا ممکن ہے۔ فجزاهم الله خير الجزاء۔

(۶) وہاں سے واپس ہوتا ہوا ہمارا قافلہ شوق ''شموگہ'' میں اقامت گزیں ہوا، جہاں کلارک پیٹھ کی نورانی مسجد سے میرا خاص تعلق خاطر ہے، اس مسجد کے بانی حضرت ''درویش'' قبلہ علیہ الرحمہ سے مجھے نسبت خاص رہی ہے، اور میں نے بجا طور پر ان کو ان بزرگوں کی زندہ یادگار پایا جن کا ذکر میں نے صوفیائے کرام کے تذکروں میں پڑھا اور ویسا ہی عشق رسول۔ گزشتہ سے پیوستہ رمضان المبارک میں اللہ کو پیارے ہوگئے، اور سچ

بچ وہ اللہ کو پیارے تھے رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ رحمۃ واسعۃ۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گل کی نگہبانی کرے

فی الوقت یہاں کی شہری جامع مسجد کے خطیب ہمارے "اشرفیہ" کے فارغ التحصیل اور عظیم قاری جناب مولانا تراب علی صاحب زید مجدہم ہیں، یہاں مولانا موصوف نے بہت سے اہل دثور سے ملاقات کرائی لیکن اشرفیہ کی اعانت کی سعادت صرف مندرجہ ذیل خوش نصیبوں کے حصہ کی دولت رہی مولا عزوجل ان کو دارین کی دولت سے مالا مال کرے۔

اے وہاب خاں صاحب آزادنگر کے پی عبدالعزیز آزادنگر، عربی مدرسہ نورانی، انور ماسٹر، حیات خاں رائس مرچنٹ وغیرہم یہاں کے ائمہ مساجد ان نورانی مسجد کے خطیب صاحب ہمارے خاص شکریہ کے مستحق ہیں۔ان کی محبت اور عنایت سے ایسا محسوس ہورہا تھا، کہ وہ بھی اشرفیہ ہی کے فرزند ہیں۔

بعض مقامات اپنے اندر کچھ ایسی شرافت وکرامت رکھتے ہیں۔ کہ لوگ ان کی طرف اپنی نسبت کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس مقام کو یہ شرف کسی مقتدر انسان کی ذات والا صفات کے صدقے میں ہی حاصل ہوا ہوگا۔ عالی جناب الحاج بڈن صاحب بنڈیگری ایسے ہی حضرات میں سے ہیں کہ ہندوستان حلقہ احباب اہل سنت میں منڈ گوڑ ضلع کاروار کو صرف ان کے دم سے شہرت اور بقائے دوام حاصل ہوا۔ بے حد مخیر اور انتہائی دیندار، بزرگوں سے والہانہ عقیدت رکھنے والے اور خود انھیں کے نقش قدم پر۔ ایک دو منزلہ مسجد اور ایک دینی دار العلوم منڈ گوڑ میں انھیں کے دم سے آباد ہے بلکہ روز افزوں ترقی پر ہے اور دار العلوم تو فی الحقیقت ایک باقاعدہ مدرسہ ہے، ہبلی میں جو مایوسی ہوئی تھی یہاں آکر اور طلبہ واساتذہ کو دیکھ کر اتنی ہی مسرت ہوئی،

ہم لوگوں نے کرناٹک کے سفر کا جب ارادہ کیا، تو اس وقت "حاجی صاحب" مو

صوف کی ملاقات بھی مقاصد سفر میں تھی، اور الحمد للہ کہ ملاقات کے بعد محترم الحاج بڈن صاحب نے اپنی دین داری مہمان نوازی اور خلوص کے انمنٹ نقوش ہمارے قلوب پر ثبت فرمائے۔ مولا عزوجل ہماری قوم میں ان کے امثال پیدا فرمائے۔

الحاج محمد اسماعیل صاحب تمسر ضلع بھنڈارہ آپ کا ذکر خیر اس سے قبل بھی ان کالموں میں آچکا ہے، ہمارے اس دورے کا اختتام بھی آپ کے ہی دو دولت سے ہوا۔ ملاقات تو حاجی صاحب سے اس سے قبل بھی ہو چکی تھی لیکن اس دفعہ بے حد قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور دور دور تک ہم نشینی حاصل رہی، سبحان اللہ حاجی صاحب کا پورا گھر اسلامی سانچہ میں ڈھلا ہوا، اور دینی روایات کا حامل، وہاں پہونچ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے روح کو اپنا صحیح مقام مل گیا اور طبیعت پر اطمینان و آسودگی کی کیفیت طاری ہوگئی۔

اور خود حاجی صاحب، ماشاء اللہ آپ کو اپنے مقصد کے ساتھ وہ شیفتگی ہے، جو حوصلہ اور اخلاص کسی تحریک کا داعی اپنی تحریک کے ساتھ رکھتا ہے، فرمانے لگے مولانا میں کسی آدمی کی شخصیت، ماحول اور موقع نہیں دیکھتا کوئی ہو کہیں ہو کیسا ہی موقع ہو۔ اگر مسلمان ہے اور داڑھی نہیں رکھی ہے، تو ضرور ٹوک دیتا ہوں، اور دو کلمہ خیر ہدایت کے کہہ دیتا ہوں، کوئی برا مانے یا بھلا مانے مجھ کو اس کی پرواہ نہیں، میں نے کہا حاجی صاحب آدمی اپنے مقصد میں اس درجہ مخلص پر جوش اور لومتہ لائم سے بے پرواہ ہوتا ہے تب پیغام میں جان اور تحریک میں قوت آتی ہے، فرمانے لگے جی ہاں بہت سے لوگوں نے صرف میرے ہی کہنے سے داڑھیاں رکھ لی ہیں۔

الغرض اس دفعہ حاجی صاحب کو قریب سے دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی اور دل سے دعا کہ مولا تعالیٰ ہم لوگوں کو بھی اپنے مقاصد خیر میں انہی کا اخلاص پیدا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین۔ اس سفر سے اخلاص، ہمدردی، اسلامی اخوت کی سوغات جو ساتھ لے کر ہم لوٹے وہ بڑی قیمتی ہے۔

ہمارے کرم فرما

(اشرفیہ میں ارباب علم وفضل اور اہل خیر کی آمد)

ہندوستان میں عربی مدارس اور اسلامی تعلیمی سال کا آغاز شوال المکرم کے مبارک ومسعود مہینہ سے ہوتا ہے، انہیں ایام میں پورے ہندوستان میں علم دین حاصل کر نے والے قافلے پورب سے پچھم، اتر سے دکھن رحلت علمی کرتے رہتے ہیں۔

چمن زار علم وعمل دار العلوم اشرفیہ بھی ان ایام میں پورے ہندوستان کی ملی جلی تہذیب اور مختلف قومیتوں کی ایک بارونق بستی میں تبدیل ہو جاتا ہے، اور پورے برصغیر کے علما ومشائخ اور عمائدین اہل سنت کے قدوم میمنت لزوم سے اس گلستان علم وحکمت میں بہار کا سا سماں پیدا ہو جاتا ہے۔

چناں چہ امسال ہمارے یہاں آنے والے مقتدر اعاظم اہل سنت میں بے شمار قابل ذکر شخصیتیں ہیں۔

(۱) شوال المکرم کے آخری عشرہ میں دار العلوم کی مجلس شوریٰ میں شرکت کے لیے برہان التارکین حضور مجاہد ملت مولانا شاہ محمد حبیب الرحمٰن صاحب قبلہ تشریف لائے، حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے وصال کے بعد یہ آپ کی پہلی تشریف آوری تھی، اس لیے زیارت قبر کی مجلس بڑی خصوصیات کی حامل تھی، اور یہ بھی اتفاق ہی ہے کہ شوریٰ کے جلسہ میں بھی حضرت ممدوح کی یہ پہلی ہی تشریف ارزانی تھی، موصوف کی ذات بابرکات مغتنمات روزگار میں سے ہے۔ ہماری پوری قوم آپ پر جتنا فخر کرے کم ہے۔

(۲) دوسری اہم شخصیت حضور امین شریعت ومناظر اسلام حضور مولانا رفاقت حسین صاحب مفتی اعظم کانپور کی ہے، آپ نے بھی پہلی دفعہ شوریٰ کے جلسہ کو اپنے وجود

سے سرفراز فرمایا اور دار العلوم کے فلاح وترقی کے لیے بہترین رہبری فرمائی۔

(۳) ہماری قومی زندگی کی حرارت وتوانی حضرت العلام مولانا ارشد القادری صاحب تو عملاً مجلس شوریٰ کی کمان کر رہے تھے، اور آپ کی ہی نگرانی میں شوریٰ نے اپنی تمام تجاویز کو پایہ تکمیل تک پہونچایا۔

(۴) عالی جناب ڈاکٹر عبدالمجید صاحب (بلرام پور) ہماری مجلس شوریٰ کے ان سرگرم ارکان میں ہیں کہ آپ نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود آج تک کوئی مجلس ناغہ نہیں کی، یہ آپ کی دینی شیفتگی اور حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے ساتھ والہانہ عقیدت کا ثمرہ ہے کہ آپ کو الجامعۃ الاشرفیہ سے بھی عشق سا ہو گیا۔

(۵) اسی موقعہ پر حضرت مولانا حسن رضا صاحب ایم اے اسکالر پٹنہ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کے لیے مقالہ لکھ رہے ہیں۔ آپ کی یہاں تشریف آوری اسی سلسلہ میں تھی اور فی الوقت بھی موصوف اسی سلسلہ میں یہاں تشریف فرما ہیں۔

(۶) عرس امجدی سے واپس لوٹے ہوئے نبیرہ حضور محی الاسلام سلالۂ دودمان رضویہ حضرت مولانا الشاہ اختر رضا خاں صاحب ازہری میاں بریلوی تشریف فرما ہوئے۔ آپ نے قصبہ سے باہر درسگاہ کی پرشکوہ عمارت، ہوسٹل کی لق ودق بلڈنگ اور قصبہ کے اندر جا کر باغ فردوس دار العلوم کی سابقہ عمارت) مدرسہ قدیم جامع مسجد، اشرفیہ مارکیٹ، غرض یہ کہ ساری تعمیرات ملاحظہ کیں، پھر دار العلوم کے تعلیمی نظام، تربیتی انداز اور مختلف دفاتر کا معائنہ فرما کر اس دار العلوم کو مشرق سے اہل سنت وجماعت کے ابھرتے ہوئے آفتاب سے تعبیر کیا، اور حضرت محترم کتب خانہ دیکھ کر بے حد محظوظ ہوئے۔

(۷) حضرت مولانا الشاہ سید مجتبیٰ اشرف نبیرہ حضور اعلیٰ حضرت مولانا الشاہ سید علی حسین صاحب المعروف بہ اشرفی میاں علیہ الرحمۃ والرضوان "بانی "دار العلوم اشرفیہ" آپ ہمارے دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر اور ہندوستان کے بلند پایہ مشائخ طریقت میں سے ہیں۔

(۸) حضرت مولانا الشاہ مشاہد رضا خاں صاحب دام بالکمال صاحبزادہ حضور

شیر بیشہ اہل سنت حضرت مولانا الشاہ محمد حشمت علی خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

یہ دو حضرات اشرفیہ کے فارغ اور حضور حافظ ملت کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔

عرس امجدی سے واپس ہو کر الجامعۃ الاشرفیہ کے گراؤنڈ میں واقع مزار استاذ العلما حضور حافظ ملت پر حاضر ہوئے اور عقیدت واخلاص کے موتی نچھاور کیے۔

(۹) محترم الحاج محمد اسماعیل صاحب بیڑی والے۔ اپنے سینے میں ایک مؤمن قانت کا دل، اور دل میں سچے عاشق رسول کی اسپرٹ رکھتے ہیں۔ پورے ہندوستان میں سنی تبلیغی جماعت کے روح رواں اور نماز کے سرگرم مبلغ ہیں۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور مفتی اعظم ہند مد ظلہ العالی کے سچے جانثار اور اسی مناسبت سے پورے ہندوستان میں اہل سنت وجماعت کے فعال اداروں کے حقیقی غمگسار۔ موصوف پورے ملک میں اہل سنت وجماعت کے متعدد اداروں کا دورہ کرتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد اعظم صاحب مرکزی دار العلوم اہل سنت مظہر اسلام مسجد بی بی جی بریلی شریف اور اپنے چار صاحب زادوں کے ہمراہ مورخہ یکم نومبر ۷۷ء کو مبارک پور تشریف لائے۔ آپ نے الجامعۃ الاشرفیہ کے گراؤنڈ سے لے کر قصبہ تک دار العلوم سے متعلق ساری عمارت کو اور دار العلوم کے تمام شعبوں کا تفصیلی معاینہ فرمایا۔ اور مبارک پور میں دین وسنیت کی جو عظیم خدمت ہو رہی ہے اس پر بے پناہ مسرت فرمائی۔ دار الاقامہ کے معائنہ کے وقت آپ نے ناظم اعلیٰ جناب الحاج مولانا قاری محمد یحییٰ صاحب سے فرمایا: اس میں بجلی کی روشنی کا جلد انتظام ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ موصوف کا سایہ تادیر قائم رکھے اور انہیں دین متین کی خدمت کی بیش از بیش توفیق کرامت فرمائے۔

(۱۰) حضور حافظ ملت کے برادر خورد حضرت مولانا حافظ عبد الرشید صاحب دام ظلہ العالی۔

(۱۱) عالی جناب مولانا حافظ قاری رحمت اللہ صاحب خطیب جامع مسجد بستو پورٹانا نگر۔

(۱۲) حضرت مولانا الحاج محمد اعجاز احمد خاں صاحب صدر المدرسین مدرسہ تدریس الاسلام ضلع بستی۔

آمد و رفت

(اشرفیہ میں ارباب علم وفضل کی آمد اور بحر العلوم کے تبلیغی دورے)

گزشتہ مہینوں میں مختلف قابل ذکر مقامات کی حاضری کا موقع ملا۔ اور مختلف مقتدر حضرات نے اشرفیہ میں تشریف ارزانی فرمائی، مصروفیت کے باعث جن کا ذکر رسالہ کے صفحات میں نہ ہو سکا حالاں کہ ضرورت تھی کہ ناظرین کو اس سے باخبر رکھا جائے۔

۲/۳/ مارچ ۷۹ء کو مولانا محمد یعقوب صاحب گونڈوی شاگرد رشید حضرت علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی علیہ الرحمہ کی دعوت پر مدرسہ اسلامیہ اندرکوٹ میرٹھ جلسہ عید میلاد النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں شرکت کا موقع ملا۔

میرٹھ کو ہندوستان کی تاریخ آزادی میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے، اسلام وسنیت کے لحاظ سے بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل رہا ہے، جہاں ماضی قریب میں مختلف دینی ودنیاوی وجاہت کے حامل ایسے سنی خاندان رہے ہیں، جن کا ذکر تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا

سیاح عالم حضرت مولانا عبد العلیم صاحب صدیقی میرٹھی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جن کے پرجوش تبلیغی لکچروں، علمی تقریروں اور پرسوز لحن داؤدی نے ربع مسکوں کے ہزارہا غیر مسلم اقوام کے قلوب میں اسلام کی حرارت ودیعت کی، اور عشق مصطفیٰ کی جوت جگائی جن کے جہاں گرد قدموں نے صرف اور صرف تبلیغ دین کے لیے چاروں براعظموں کی روند ڈالا، اور ہزارہا اسلامی تنظیموں کو وجود بخشا، اسی میرٹھ کے تھے، اور تحریک تحفظ ناموس رسالت میں امام اہل سنت مولانا الشاہ احمد رضا خاں صاحب علیہ الرحمۃ والرضوان کے دست وبازو اور ان کے جانثار ومخلص تھے۔ حضرت مولانا عبد السمیع صاحب بیدل رحمۃ اللہ

علیہ ہندوستان میں منکرین میلاد وفاتحہ وسلام وقیام کے سر پر قیامت کبریٰ قائم کرنے والوں کی پہلی صف میں تھے، اور جن کی مبارک کتاب مستطاب ''انوار ساطعہ'' اپنے موضوع پر اچھوتی اور لاجواب ہے، آج بھی رؤسائے میرٹھ کے آبائی قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں (قدس سرہ العزیز)

موصوف الصدر حضرت صدیقی قدس سرہ العزیز کے شاگرد رشید، مولانا عارف اللہ صاحب میرٹھی جو لحن وصوت میں اور تقریر و بیان میں بجا طور پر ان کے وارث تھے، یہیں کے باشندہ تھے۔ مدتوں جن کے دم سے غیر منقسم ہندوستان کا سنی اسٹیج پر شور ورشک صد باغ و بہار رہا اور آج تک درالالیتامیٰ خیر نگر میرٹھ کے در و دیوار میں ان کی خوشبو رچی بسی ہے۔

اسی میرٹھ کے لال کرتی محلہ میں ہندوستان کے شہرہ آفاق بھیا حضرات کا خاندان آباد ہے جو ثروت وشرافت دین ودین پروری بالخصوص خوش عقیدگی اور احترام بزرگان دین میں اپنی نظیر آپ ہے، اس دفعہ وہاں پھر حاضری کا موقع ملا، اور خاندانی بزرگ وسربراہ اعلیٰ جناب حافظ وقاری بھیا مظفر الدین صاحب رئیس اعظم اور ان کے برادر خرد عالی جناب بھیا شمس الدین اور دیگر حضرات سے شرف نیاز حاصل ہوا۔

قدیم اسلامی وضع داری، عالی حوصلگی، دین داری اور علمی گیرائی کے یہ حضرات پیکر ہیں، ان حضرات کے اخلاق عالیہ پر مغز علمی، وتاریخی گفتگو، اور اسلامی شائستگی سے میں بے حد متاثر ہوا، یہاں کا نہایت لطیف سادہ و پر کار دستر خوان اور اس کی پروقار علمی بات چیت بھی مدتوں یاد رہنے کی چیز ہے، اس خاندان کے دینی محاسن کی جہاں لمبی فہرست ہے، اس کی ایک زرین کڑی مدرسہ اسلامیہ اندر کوٹ میرٹھ بھی ہے، جس کے مہتمم فی الحال شیخ بھیا مظفر الدین صاحب ہیں۔

اور انہی حضرات کی سعی مشکور اور جدوجہد کے نتیجے میں مدرسہ اسلامی کو ایسا شیخ الحدیث اور صدر المدرسین ملا جو عبقری وقت اور نابغہ روزگار تھا۔

میری مراد حضرت بابرکت شیخ العلما الاعلام صدر المدرسین الکرام حضرت مولانا العلام مولانا الشاہ غلام جیلانی صاحب میرٹھی علیہ الرحمۃ والرضوان سے ہے، جو ہندوستان میں اہل سنت و جماعت کے سرخیل علما میں شمار ہوتے تھے، اور جن کو تمام علوم اسلامیہ وفنون حکمیہ قدیمہ پر ماہرانہ بصیرت حاصل تھی، اور نحو میں تو ان کو امامت کا درجہ حاصل تھا۔

حضرت محترم کے وصال کے بعد میرٹھ کی خراب ہوتی ہوئی صورت حال کے پیش نظر (اور جس میں بہت زیادہ دخل دیوبند کے قرب اور وہاں کے علما کے تگ وتاز کو ہے) یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ خدا نا کردہ وہ میرٹھ سے اہل سنت کا آخری سہارا بھی جواب دے دے گا، لیکن لال کرتی کے اسی دین دار رئیس کی صلابت رائے اور استقامت دین کی وجہ سے سردست یہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ اور اس کے صدر المدرسین حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب تلسی پور مقرر ہو گئے ہیں جو حضرت مولانا غلام جیلانی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی آخری زندگی کی بھرپور جدوجہد کا نچوڑ ہیں، قد وقامت میں بالکل نحیف الجثہ لیکن علم واستعداد ولیاقت وتجربہ کاری میں نہایت بھاری بھرکم ذی وقار عالم دین، بے شمار علمی ڈگریوں کے امین، اور نہایت اعلیٰ درجہ کے خوش گلو قاری، حضرت مولانا غلام جیلانی صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے جلسہ تعزیت میں آپ نے اپنے تأثرات کا اظہار ایک عربی مقالہ کے ذریعہ کیا، جو کافی مقبول ہوا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس علمی مرکز کو آفات روزگار سے بچائے اور برابر وہاں سے اہل سنت و جماعت کی تبلیغ واشاعت ہوتی رہے۔ آمین۔

۲۱/۲۲/اپریل ۷۹ء کو عزیزم محترم مولانا مولوی ڈاکٹر محب الحق فرزند اکبر حضرت مفتی اشرفیہ مولانا شریف الحق صاحب امجدی کی دعوت پر ہندوستان کے عظیم تعلیمی مرکز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک جلسہ عید میلاد النبی میں شرکت کا موقع ملا۔

یہ پروقار اجتماع وہاں کی دینی تعلیمی سوسائٹی مرکز تعلیمات کی طرف سے یونیورسٹی کے اسٹریچی حال میں منعقد ہوا، شہر کے عوام وخواص کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کے اساتذہ

اور طلبہ کی بڑی تعداد نے اس مبارک محفل میں شرکت کی صدارت کے فرائض مرکز کے مرشد حضرت مولانا سید ظہیر الدین صاحب زیدی نے انجام دیے اور خصوصی مقررین میں ڈاکٹر نسیم صاحب قریشی اور راقم الحروف تھے، نسیم صاحب کی شعلہ بار تقریروں کو آج سے لگ بھگ پینتیس سال قبل میں مبارک پور میں ہی سن چکا تھا لیکن اس دفعہ ان کے بیان سننے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ اب ان شعلوں نے خود ان کے باطن کی طرف رخ کر لیا ہے، چناں چہ بیان کے ایک ایک جملہ سے عشق کا سوز اور درد باطن کا گداز پھوٹا پڑتا تھا اور ان کا وہ جملہ جو مدتوں یاد رہے گا جو انہوں نے علی گڑھ کے فسادات پر کہا تھا انہوں نے فرمایا:

لوگ یہاں مسلمانوں کی عام تباہی پر گلے شکوے کرتے ہیں، اور میں یہ سوچتا ہوں کہ الٰہی تیری رحمت کے قربان کہ تو نے ہم کو اس لائق تو سمجھا کہ آزمائش کی بھٹی میں تپائے۔ مجھے ان کے فربہ جسم میں ایک بے حد لطیف وحساس روح اور سینے میں عشق آلود دل نظر آیا۔

جلسہ کا آغاز پیلی بھیت کے ایک قاری صاب نے تلاوت قرآن مجید سے کیا، آواز کے سوز اور ادائیگی حسن نے پورے ہال میں ایک غیر محسوس سرسراہٹ پھیلا رکھی تھی جس سے پوری مجلس کیف کی موجوں میں شرابور ہو رہی تھی۔

اس کے بعد قاری صاحب موصوف نے اعلیٰ حضرت کی ایک پر کیف اور دل گداز نعت پڑھی، میرا خیال ہے کہ بہت دنوں کے بعد ایک عاشق صادق کے نالہ فراق نے سننے والوں کے دلوں میں ایک ہلچل پیدا کر دی تھی، کتنے چہرے وفور جذبات سے تر بتر تھے، تو کتنے دلوں کے آب گینے سوز دروں کی موجوں سے چھلک پڑے تھے، نسیم صاحب کی حالت قابل دید تھی، ان کی پلکیں مسلسل بھیگ رہی تھیں، اور وہ بار بار انگلیوں کے مس سے چھلکتے پیالوں کو تر بتر کر دیتے، گویا انہیں چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔

نسیم صاحب کے بعد راقم الحروف کی باری تھی، میں کیا کہتا اور ایک روشن خیال مجمع سے کہنے کے لیے میرے پاس کیا تھا، میرا تو صرف ایک موضوع ہے:

ماقصہ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم　　　　از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

لیکن میری جرأت کی انتہا نہ رہی کہ کامل ایک گھنٹہ میرے جیسے پرانی وضع قطع کے مولوی کی باتیں پورا مجمع نہایت توجہ، کمال سنجیدگی واحترام کے ساتھ سنتا رہا، میں نے سوچا مسلمان کیسا ہی ہو اپنے رسول کے نام کا احترام کرتا ہے، ان کے ذکر کا احترام کرتا ہے تو ان کا ذاکر بھی کیسا ہی کیوں نہ ہو انھیں پیارا ہے۔

در دل مسلم مقام مصطفیٰ ست　　　　آبروئے ما ز نام مصطفیٰ ست

پھر سب نے کھڑے ہو کر صلاۃ وسلام پڑھا اور دعائے خیر پر جلسہ کا اختتام ہوا۔

دوسری صبح کو اسی مرکز کی یونین حال میں ایک خالص علمی اور دینی سیمینار برپا ہوا، جس کا موضوع تھا رسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) قانون داں ہیں یا قانون ساز؟ مقالہ نگاروں میں یونیورسٹی کے اساتذہ اور درجہ تخصص کے طلبہ نیز باہر کے فضلا بھی شریک ہوئے، اشرفیہ کی طرف سے مولانا محمد یٰسین اختر صاحب نے نمائندگی کی۔

یہ امر خاص طور سے قابل ذکر ہے، کہ بیش تر مقالہ نگار اس مرکزی خیال سے متفق تھے کہ رسالت کا منصب قانون دانی کے منصب سے بہت اعلیٰ وارفع ہے، قانون داں تو ہر پڑھا لکھا مسلمان ہو سکتا ہے، جب کہ منصب رسالت خاص عطیہ ربانی اور کمال وہبی ہے، اس لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قانون داں ہونے کے ساتھ ساتھ قانون ساز بھی ہیں، یہ اور بات ہے کہ یہ منصب بھی خدا کا عطا کردہ اور اسی کے اذن واختیار سے ہے، جب کہ سیمینار کے واحد شعبہ مقالہ نگار نے ابتدا میں اس امر پر زور دیا تھا کہ قانون ساز صرف خدا ہے، کسی اور کو یہ اختیار نہیں، لیکن آخر میں اقرار کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جو کچھ کہتے ہیں خدا ہی کی طرف سے کہتے ہیں، اپنی طرف سے کچھ نہیں فرماتے، جس کے نتیجے میں عملاً دونوں نکتہ نگاہ میں کوئی بنیادی فرق نہیں رہ گیا تھا، کیوں کہ فریق اول قانون سازی کا اختیار مان کر بھی اذن الٰہی کی قید لگا رہا تھا، اور فریق ثانی قانون سازی کا انکار کر کے بھی یہی کہتا تھا، وہ جو کچھ کہتے ہیں قانون الٰہی ہے، پس عملاً رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زبان مبارک سے نکلی ہوئی ہر بات قانون ہے، چاہے یہ مان کر کہ خدا

نے ان کو یہ اختیار دیا ہے، چاہے یہ کہہ کر کہ ان کا کہا ہوا خدا کا کہا ہوا ہے۔

انجمن مرکز تعلیمات کے ارکان قابل مبارک باد ہیں، جن کی جدو جہد سے علی گڑھ میں صحیح اسلام کا عکس جمال نکھر سکتا ہے، اور دینی جدو جہد اپنا صحیح رخ اختیار کر سکتی ہے۔

یوں تو حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے عرس مقدس کے مبارک موقع پر کثیر التعداد علما، صلحا، دار العلوم کے فضلا، اور حضور حافظ ملت قدس سرہ کے ارادت مند تشریف لائے، مگر یہاں خاص طور سے صرف دو وفد کا ذکر کرنا ہے، جن کی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے خاص طور سے دار العلوم دیکھنے کی ہی غرض سے یہ سفر کیا تھا۔

۷/۸ /اپریل ۷۹ء کو الحاج محمد اسماعیل صاحب دھوراجی والے اور ان کے منیجر عالی جناب عبد الحسیب صاحب ناگپور والے تشریف لائے، محترم الحاج محمد اسماعیل صاحب ایک ایسے خاندان کے فرد ہیں، جو ہمیشہ سے دین دار، دین پرور، اور خوش اعتقاد رہا ہے، آپ کے والد مرحوم الحاج محمد ولی اور بڑے ابا الحاج محمد ہاشم کے ذکر میں مقامات خیر میں تحریر فرماتے ہیں:

''اکتوبر ۱۹۲۱ء کے آخری عشرہ میں جب کہ آپ کے دو صاحبزادوں کے عقد نکاح کی مجلس تھی، شاہ ابو الخیر کو پانچ ہزار روپے نذر کیے، امام ربانی مجدد الف ثانی کے گنبد کی تعمیر پر ایک لاکھ روپے خرچ فرمائے، دھوراجی میں مسافر خانہ کے لیے پچاس ہزار اور یتیم خانہ کے لیے پچیس ہزار روپے کا اعلان فرمایا۔ (ص ۳۷۱ مقامات خیر)

الحاج محمد اسماعیل صاحب نے اپنے والد گرامی محمد ولی صاحب مرحوم کا ذکر خیر بڑے پر لطف انداز میں فرمایا، کہنے لگے کہ میرے والد نے کچھ ایسا پڑھا لکھا نہیں تھا، انھوں نے اپنی قوم کی جہالت دیکھی، تو ان کی تعلیم کے لیے اپنے ذاتی صرفہ سے ایک ہائی اسکول کا قیام فرمایا، پھر وہ ترقی کر کے کافی اونچا ہو گیا، جس میں تعلیم پا کر ہزاروں افراد دنیا کے دور دراز گوشوں میں اچھی اچھی جگہوں پر فائز ہوئے، اک بیک ان کو خیال آیا کہ یہ لاکھوں روپیہ صرف کر کے میں نے اپنی قوم کے بچوں کو کھڑے ہو کر پیشاب کرنا سکھایا ہے، تو

انہوں نے ایک دینی دار العلوم کا انتظام سنبھالا جس کو اپنے صرف سے چلاتے تھے، اور ایک بچیوں کی تعلیم کا ادارہ قائم کیا۔

الغرض یہ حضرات خیر مجسم اور ایمان کامل کے حامل ہیں، ان کی تشریف آوری پر جو ایک خالص دینی و مذہبی سفر تھا، جامعہ کی طرف سے ایک استقبالیہ دیا گیا، جس میں جامعہ کے اساتذہ طلبہ، اور دیگر حضرات نے شرکت کی، حمد و نعت کے بعد مولوی مجاہد حسین سلمہ طالب علم درجہ ثامنہ نے مندرجہ ذیل منقبت محترم مہمانوں کی خدمت میں پیش کی:

ہر طرف رحمت و رافت کی گھٹا چھائی ہے
آپ آئے تو ادارے میں بہار آئی ہے

نیک دل نیک زباں نیک عمل نیک صفات
آپ کی ذات میں سو طرح کی گیرائی ہے

کتنے بے نور اداروں کو ضیا بخشی ہے
کتنے بیمار نظاموں نے شفا پائی ہے

آپ کی ذات بھی وجہ فروغ ملت
آپ کے دم سے عجب انجمن آرائی ہے

اب تو حاتم کی سخاوت کا کوئی نام نہ لے
حاتم دین محمد کی جو بات آئی ہے

آپ کا نام مبارک جو ہوا اسماعیل
اس لیے سنت ایثار و فا پائی ہے

اس مجاہد کو خدا رکھے سلامت تا دیر
دین اسلام کی تبلیغ کا سودائی ہے

اور حبیب ان کی معیت میں ہوئے سب کے جب
ایسی خوش بختی کا ہر شخص تمنائی ہے

پھر ہمارے ادارے کے صدر مفتی حضرت مولانا شریف الحق امجدی نے ادارے کا مختصر تعارف پیش کیا، اخیر میں مہمان محترم نے نہایت مختصر مگر بے حد قیمتی تاثرات ظاہر فرمائے۔

دعا ہے کہ مولا عزوجل قوم کے سر پر ان کا سایہ تادیر رکھے، قوم میں ان کے امثال پیدا فرمائے، اور ملت اسلامیہ کے فروغ کے اسباب فراہم کرے، آمین۔

دوسرا وفد جو ۲۰/۲۱/ مئی ۹۷ء کو تشریف فرما ہوا، عالیجناب وحید الدین صاب، سکنہ سہارن پور اور ان کے رفیق محترم پر مشتمل تھا۔

آپ حضرات نے بھی اپنی تشریف آوری کی غرض جامعہ اشرفیہ کی شہرت اور اس کے معائنہ کا شوق ہی بتایا، چناں چہ ان حضرات نے درسگاہ کی عمارت، دار الاقامہ کی پر شکوہ عمارت، مزار حضور حافظ ملت، احاطہ مسجد پھر مختلف دفاتر مثلا دار الاہتمام، دفتر نشر و اشاعت، دار الافتا، لائبریری وغیرہ کا بغور مشاہدہ کیا۔ اور اپنا یہ تاثر ظاہر کیا، ”ہم نے جس قدر اس ادارے کے بارے میں سنا تھا حقیقت میں اس سے بہت زیادہ پایا۔ حقیقت یہ ہے کہ زبانی جس قدر ادارے کی تفصیل سنی جائے، ایک عربی مدرسہ کا تصور ہی دماغ میں رہتا ہے۔ لیکن دیکھنے کے بعد اس کے بالکل خلاف ایک عظیم علمی بستی کا ہیولیٰ سامنے ہے، اس لیے ہر آنے والے کو فطرۃً حیرت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ دینی قلعہ کو آفات روزگار سے محفوظ رکھے، اور یوما فیوماً منزل کمال پر پہونچائے۔

حق کوشی وحق نیوشی

(تذکرہ خلیفہ ہارون رشید)

اسلام کی تاریخ میں حق گوئی کی بے شمار مثالیں ہیں اور اس افضل جہاد کے ادا کرنے والوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے، لیکن کیا حق نیوشی میں بھی اسی کثرت کے ساتھ ملیں گے؟ نہیں، یہ اسلام کا ایک المیہ ہے، حق نیوشوں کے چند ہی نام ملیں گے جن کو انگلیوں پر شمار کیا جاسکتا ہے۔ اور انھیں میں سے سلسلہ بنو عباس کا درۃ التاج اور وسط القلادہ، رومن شہنشاہ کو رومی کتے کہہ کر خطاب کرنے والا عظیم شہنشاہ ابو جعفر ہارون الرشید متوفی ۱۹۳ھ بھی ہے۔

فضل ابن ربیع نے بیان کیا ایک دفعہ جب کہ ہارون رشید حج کرنے گیا تھا میں رات میں اپنے گھر سو رہا تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے پوچھا کون؟ جواب آیا امیر المومنین۔ جلد جلد اٹھا اور دروازہ کھولتے ہی میں نے کہا: حضور نے مجھے خود ہی بلا لیا ہوتا۔ خود تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی، بات ہی ایسی تھی جو میں خود آیا کچھ خیالات دل میں آتے ہیں جن کی وضاحت علما ہی کر سکتے ہیں، مجھے کسی عالم کے پاس لے چلو، ہارون الرشید نے کہا اور ہم سفیان ابن عیینہ کے گھر کی طرف چل پڑے، وہاں پہنچ کر آواز دی گئی، کون کسی نے پوچھا، ہم نے کہا: امیر المومنین، دروازہ کھل گیا، جلدی جلدی آ کر سفیان بن عیینہ نے بھی یہی کہا کہ امیر المومنین کاہے کو تکلیف کی، مجھے ہی بلا لیا ہوتا، بات ہی ایسی تھی، ہمارا مختصر جواب تھا۔ اور گفتگو ہونے لگی، بادشاہ جلد ہی اکتا گیا اور پوچھا آپ پر کسی کا قرض ہے، ہاں۔ بادشاہ نے میری طرف رخ کر کے کہا کہ ان کا قرض چکا دینا، اور ہم چل پڑے، راستہ میں ہارون نے کہا کہ میری تشفی نہیں ہوئی اور کہیں چلو اور ہم عبد الرزاق ابن ہمام کا

دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے، انھوں نے بھی پوچھا کون ہے؟ پھر وہی سب کچھ ہوا جو سفیان ابن عیینہ کے پاس ہو چکا تھا اور ہم وہاں سے بھی واپس لوٹے، اور ہارون الرشید نے پھر وہی بات دہرائی کہیں اور چلو، یہاں بھی کوئی کام کی بات نہیں ہو سکی، پس اس کو فضیل ابن عیاض کے دروازے پر لا کھڑا کیا، رات کافی گزر چکی تھی، پھر بھی فضیل ابن عیاض کھڑے نماز پڑھ رہے تھے اور ایک ہی آیت بار بار دہرا رہے تھے، میں نے آواز دی، بالا خانہ کی کھڑکی سے جھانک کر بولے کون، امیر المومنین میں نے کہا، امیر المومنین نے بتایا، آپ نے فرمایا: امیر المؤمنین سے مجھے کیا لینا، انھوں نے کہا مطلب یہ کہ نہیں ملتا، میں نے اصرار کیا، سبحان اللہ امیر المومنین کی اطاعت آپ پر واجب ہے، دروازہ کھولیے، یہ سن کر دروازہ کھولا، ہم کو اوپر لے گئے، خود ایک گوشہ میں بیٹھے اور چراغ گل کر دیا۔ ہم نے اندھیرے میں صافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور امیر المومنین کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں آ گیا، ہاتھ پکڑ کر بولے، آہ کتنا نرم ہاتھ ہے، کاش کل عذاب جہنم سے یہ بچ جاتا، میں دل میں سوچنے لگا، آج فضا اچھی ہے، ہم بھی خلوص قلب اور وقت کی تاثیر سے فائدہ اٹھائیں گے، ہم ایک بڑے کام کے لیے آئے ہیں، بادشاہ نے سلسلہ جنبانی کی، پس فضیل برس پڑے۔

خدا تم پر رحم کرے، کس لیے آئے ہو، تم نے اپنا بار پشت پر لیا ہی تھا اور ساری دنیا نے بھی تم پر اپنا اپنا انبار کر دیا، اگر تم چاہو کہ تمھارے بوجھ کا معمولی ایک حصہ بھی یہ اٹھالیں تو نہیں اٹھائیں گے بلکہ تمھارا سب سے زیادہ قریبی تم سے دور بھاگے گا، سنو جب عمر ابن عبدالعزیز علیہ الرحمہ بادشاہ ہوئے تو سالم بن عبداللہ، محمد ابن کعب، اور رجا ابن حیوۃ کو طلب کیا اور کہا: میں تو اس بلا میں پھانس دیا گیا، تم لوگ عذاب دہی سے نجات کی کوئی سبیل بتاؤ، سالم ابن عبداللہ نے کہا، بڑوں کو باپ سمجھ کر احسان کرو، جوانوں کو بھائی تصور کر کے رحم وکرم کرو، اور چھوٹوں کو بیٹا مان کر نرمی برتو، جب تم نجات پا سکتے ہو، محمد ابن کعب نے کہا عذاب دہی سے نجات کی ایک ہی سبیل ہے، تم دنیا سے روزہ رکھ لو اور موت سے افطار کرو، رجا ابن حیوۃ گویا ہوئے کہ تم جو اپنے لیے پسند کرو سب کے لیے کرو، اور خود ناپسند کرو تو

دوسروں کے لیے بھی ناپسند کرو تب تم جو چاہو کرو۔ ہارون رشید میں تم سے ایسا نہیں کہہ سکتا لیکن تم پر قیامت کے دن کا مجھے بڑا خوف ہے، خدا تم پر رحم کرے، تمھارے ساتھ ویسا کون ہے جو تم کو نصیحت کرے، پھر یہ بھی سوچو کہ عمر ابن عبدالعزیز نے خلافت کو بلا کہا اور تم لوگ اسے نعمت تصور کرتے ہو، یہاں تک کہ ہارون رشید میں سننے کی طاقت نہیں رہی، دھاڑیں مار مار کر رونے لگا، یہاں تک کہ بے ہوش ہوگیا، میں نے کہا: یا حضرت آپ رحم کریں، امیر المومنین پر، ہاں میں تو رحم ہی کر رہا ہوں، اس پر ظلم تو تم اور تمھارے ساتھی کر رہے ہیں، ان کا جواب تھا، اتنے میں ہارون الرشید کو افاقہ ہوا اور اس نے کہا اور فرمایے وہ بولے:

عمر ابن عبدالعزیز کے ایک عامل نے بے خوابی کی شکایت ان کے پاس لکھی کہ کثرت کار سے سونا نصیب نہیں ہوتا، اس کا جواب حضرت ابن عبدالعزیز نے یہ دیا کہ تم اصل جہنم کی بے خوابی اور ان کی دائمی تکلیف یاد کرو، یہ یاد بہر حال تم کو تمھارے رب کے پاس پہونچا دے گی، یہ خط جب عامل کے پاس پہنچا، عمارت چھوڑ کر چل پڑا، جب دربار خلافت میں پہنچا، عمر ابن عبدالعزیز نے پوچھا کہو کیسے آئے، آپ کی باتوں نے میرا دل دنیا سے اچاٹ کر دیا، اب مجھے عمارت کی ضرورت نہیں یہ کہا اور چلا گیا، پھر ہارون رشید دھاڑیں مار کر رونے لگا اور بولا کچھ اور فرمایے: انھوں نے کہنا شروع کیا: حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے حکومت کی خواہش ظاہر کی، آپ نے فرمایا: چچا جان نفس کی بیداری بے قابو حکومت سے بہتر ہے، اور امارت تو حشر کے دن ندامت وحسرت لائے گی، آپ حکومت سے بچ سکیں تو بچیے، اور ہارون رشید کی ہچکیاں پھر بلند ہوگئیں اور وہ شدت تاثر سے بولا: خدا آپ پر رحم کرے اور ارشاد فرمایے، وہ کہنے لگے اے دل کش چہرے والے! کل خدا اپنی مخلوق کے بارے میں تم سے سوال کرے گا، اگر تو اس دل آویز چہرے کو جہنم سے بچا سکے تو بچا، تو اپنی رعایا کی طرف سے اپنے دل میں کھوٹ نہ رکھ، مجھے حدیث یاد آگئی، ترجمان وحی ﷺ نے فرمایا: جو صبح کو کینہ لے کر پیدا ہوا جنت کی خوشبو نہ سونگھے گا۔ ہارون رشید نے پوچھا، آپ پر کسی کا قرض ہے، ہاں میرے رب کا قرض

ہے اور میرے لیے بڑی بربادی ہے، اگر تفتیش کی۔ انتہائی ہلاکت ہے اگر پوچھ بیٹھا۔ اور میں لٹ جاوں گا اگر اس نے مجھے جواب کی توفیق نہ دی۔ میرا مطلب دنیا کے قرضے سے تھا، آپ نے فرمایا: میرے خدا نے مجھ کو اس کا حکم نہیں دیا ہے، اس نے تو عبادت کا حکم دیا ہے میں اوروں سے قرض کا ہے کو مانگوں گا، کیا میرا رب میرے رزق کا کفیل نہیں؟ اچھا تو یہ ایک ہزار اشرفی لے لیجیے، بال بچوں کے صرفہ کے لیے، کیا تم نے مجھے تاجر سمجھ لیا ہے، میری خیر خواہی کا بدلہ اس طرح چکا رہے ہو، خدا تمہیں ہدایت دے اور اچھا رکھے اور اس کے بعد وہ چپ ہو گئے، کچھ دیر انتظار کر کے ہم باہر آ گئے، راستہ میں ہارون رشید نے کہا: فضل! آیندہ اگر تم مجھے کسی سے ملاؤ تو ایسے ہی آدمی سے۔

مدرسہ اشرفیہ سے الجامعۃ الاشرفیہ تک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

امابعد: مبارک پور اپنے مرکزی مقام اعظم گڑھ سے تقریباً سات میل شمال مشرق میں کئی مربع میل پر پھیلی ہوئی ایک مسلم اکثریت کی آبادی ہے، مسلمانوں میں بھی بُن کر طبقہ کی تعداد غالب ہے۔

یہ آبادی آج سے تقریباً ساڑھے تین سو سال قبل کڑا مانک پور کے ایک بزرگ راجہ مبارک شاہ علیہ الرحمہ نے اپنے نام پر بسائی تھی۔

یہاں کا خاص ذریعہ معاش بن کاری ہے، قدیم عہد میں سوتی کپڑے (گزتی) وغیرہ تیار ہوتے تھے، لیکن جلد ہی یہاں کے ہنرمندوں نے ریشم اور سوت کی آمیزش سے چند نفیس قسم کی پوششیں بنائیں جو مدتوں شرفا کا لباس اور خوشروؤں کی زینت رہیں، اور مشروع، غلطان، سنگی، گل بدن، وغیرہ کے نام سے مشہور عالم ہوئیں، اب خالص ریشم اور زری کے بنارسی کپڑوں میں یہاں کے ہنرمند اپنا جواب نہیں رکھتے۔

مولوی سید سلیمان صاحب ندوی اپنی تالیف حیات شبلی میں رقم طراز ہیں:

(محمد آباد کے قریب مبارک پور نام کا بڑا قصبہ ہے جو پرانے زمانے سے پارچہ بافی کا مرکز ہے۔ حیات شبلی ص ۵۶)

معاشرت یہاں کی نہایت سیدھی سادی، اور تقریباً اسلامی احکام سے موافق تھی۔ اب انقلاب زمانہ کے ساتھ یہاں بھی کچھ تجدد کی ہوا چل پڑی ہے، بیشتر آبادی اگرچہ بے پڑھی تھی لیکن خیر غالب اور نیکی نمایاں تھی۔ مولوی مکرم احمد عباسی چریا کوٹی اپنی قلمی

تصنیف ''دہ بند'' میں تحریر فرماتے ہیں:

مبارک پور میں پانچ ہزار خان ہائے نور باف ہیں۔ ہر ہر محلہ میں مسجدیں موجود ہیں، پانچوں وقت جماعتیں نماز کی دھوم دھام سے ہوتی ہیں۔ اہل محلہ سب کاروبار چھوڑ کے واسطے تحصیل فضیلت جماعت کے مسجد میں آتے ہیں۔ فقیر، درویش، ملنے، مسافر، غریب الوطن، مساکین، مرثیہ خوان زیادہ تر یہاں وارد ہو کے مبلغ معتد بہ پاتے جاتے ہیں۔ فی تھان کسی قدر زکوۃ کے طور پر نکال کے ایک خزانہ میں کہ موسوم بہ گوا لگ کرلیا ہے جدا دھرتے ہیں جس سے پیسہ ایک مقدار کثیر میں موجود رہتا ہے اور اسے مصارف خیر میں صرف کرتے ہیں، اکثر باثروت وصاحب مال ہیں۔ گل بدن وسوتی پہلے پہل یہیں بنایا گیا، اور اب تک یہاں کا ساعمدہ اور ارزاں دوسری جگہ نہیں بنایا گیا۔ بالفعل مشروع دست گی، واصناف پارچہائے سادہ ورنگین یہاں بہتر بنایا جاتا ہے، اور بکفایت تام ہاتھ آتا ہے، بازاروں میں غلہ اس افراط سے آتا ہے کہ بڑے بڑے شہروں کا گولہ اس کا رشک کھاتا ہے۔

(دہ بند ص ۳)

یہ آج سے سو سال قبل شعبان ۱۲۹۲ھ کا بیان ہے، اور یہ لگ بھگ وہی وقت ہے جب کہ مبارک پور کے افق پر دودمانِ خاندان اشرفیہ، شبیہ غوث الوریٰ حضور اشرفی میاں علیہ الرحمہ کی جواں سال تبلیغی سرگرمیاں رشد وہدایت کا آفتاب بن کر چمک رہی تھیں، اور پورا مبارک پور ان کے قدموں میں اپنا دل بچھائے ہوئے تھا، اور عجب نہیں کہ اوپر عباسی صاحب کے حوالے سے یہاں کی جس عام دین داری کا ذکر کیا گیا ہے انھیں کی مسیحا نفسی کا اثر ہو۔

انھیں کی تحریک وترغیب سے آج سے تقریباً اسّی ۸۰ر سال قبل مبارک پور گولہ بازار کی مسجد میں ایک مدرسہ بنام مصباح العلوم قائم ہوا جس کے انتظام کاروں میں حافظ عبدالسبحان صاحب پورہ رانی اور بابو سردار کا نام سرفہرست ہے۔

انتہائی کوشش کے باوجود اس کے ابتدائی مدرسین کا پتہ نہ چل سکا۔ نصاب تعلیم

کے بارے میں ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ مکتبی تعلیم کے ساتھ ساتھ کچھ عربی تعلیم کا بھی انتظام تھا، کیوں کہ اسی میں تعلیم حاصل کر کے مولوی رفیع الدین و مولوی محمد عمر صاحب مولوی کہے جانے لگے۔

دس سال کے بعد مدرسہ کی فلاح و بہبود کی خاطر پورے قصبہ کی ایک عام میٹنگ ہوئی جس کے نتیجے میں ایک وسیع اور جامع ترکمیٹی عالم وجود میں آئی جس کے ارکان میں حسب ذیل افراد نامزد ہوئے:

مولوی الٰہی بخش صاحب پورہ دلھن، یہ ایک کامیاب طبیب بھی تھے۔ سردار محمد طیب گرہست پورہ خضر، یہ نہایت چالاک اور بااثر شخص تھے، حاجی عبدالحق، بابو سردار، ان کا ذکر اوپر آچکا ہے، عبدالحکیم سردار پورہ صوفی۔ اور حسین بخش وغیرہ۔ اور چوں کہ اس اجتماع میں پورے قصبہ کی نمائندگی تھی اس لیے نسبۃً اس وقت تک یہاں جتنے فرقے ممتاز تھے سبھی خیال کے مدرس رکھے گئے۔

چناں چہ مصنف بہار شریعت حضرت مولانا امجد علی صاحب علیہ الرحمہ کے برادر بزرگ حضرت مولانا محمد صدیق صاحب جو حضرت مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب جون پوری علیہ الرحمۃ والرضوان کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، اور ایک جید عالم تھے گھوسی سے بلائے گئے، دیوبندیت اس وقت نمایاں نہیں تھی کہ اس کا کوئی نمائندہ ہو لیکن غالبًا لاعلمی میں ہی مولوی محمد محمود صاحب ساکن موضع پورہ معروف بلائے گئے۔

مقامی طور پر مولوی نور محمد صاحب مرحوم، یہ لوگ سنی مکتب فکر کے ترجمان تھے۔ اور شیعہ مدرس ماسٹر مہدی حسن خاں مقرر ہوئے اور مدرسہ گولہ بازار کی مسجد سے منتقل ہو کر پورہ رانی میں کرایہ کے مکان مملوکہ اجودھا دھونی میں قائم ہوا۔

مولوی محمود صاحب ساکن پورہ معروف کا قیام پورہ دلھن میں مولوی الٰہی بخش کے وہاں تھا۔ مولوی صاحب موصوف مسلکا دیوبندی تھے۔ ابتداء تو وہ تمام سنی معمولات بجالاتے رہے لیکن ہردم کی صحبت اور بات چیت سے مولوی الٰہی بخش اور طیب گرہست

وغیرہ اہم ارکان مصباح العلوم پر اثر انداز ہو چکے تھے اور مدرسہ کے طلبہ میں بھی اپنے خیالات کی اشاعت شروع کر دی تھی، طالب علم کچے دماغ کے ہضم نہ کر سکے اور اپنی کسی مجلس میں مولوی محمود صاحب کے طالب علموں مولوی شکر اللہ اور مولوی نعمت اللہ نے امکان کذب کا مسئلہ بیان کیا، اور اپنا عقیدہ ظاہر کیا کہ خدا جھوٹ بول سکتا ہے۔(اول الذکر بعد میں مبارک پور میں دیوبندی مکتبِ فکر کے مؤسس ہوئے)

اس وقت کے ایک طالب علم مولوی محمود شاہ نے ان لوگوں کے فاسق و بد دین ہونے کا تحریری فتوی دیا جس کی شکایت ارکان مدرسہ کے پاس پہونچی۔ طیب گرہست نے معاملہ کی تفتیش مولوی نور محمد صاحب مرحوم کے سپرد کی لیکن پھر قضیہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر "محمود شاہ" کو مدرسہ سے خارج کر دیا۔

طیب گرہست کا یہ اقدام پورے قصبہ میں آگ لگا دینے کے لیے کافی تھا، چناں چہ ایک عام شورش اور عوام کے شدید ہیجان کے نتیجے میں کمیٹی میں نیا خون شامل ہوا۔ اور بدلو میاں، حافظ محمد ابراہیم مرحوم سابق متولی، وحاجی خیر اللہ مرحوم سابق متولی دار العلوم اہل سنت مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم ممبران کے زمرے میں داخل ہوئے۔

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ طیب گرہست ایک شاطر مدبر تھے، چناں چہ انھوں نے منھ بھرائی کے لیے عوام کے کچھ نمائندے تو کمیٹی میں رکھ لیے لیکن در پردہ اسی کوشش میں رہے کہ نئے مذہب کو فروغ اور مذہب اہل سنت و جماعت کا استیصال ہو جائے۔ اور اس کے لیے حالات یوں ساز گار ہو گئے کہ اسی دوران میں ہندوستان کے سیاسی بازی گروں نے یہاں بیٹھ کر "خلافت اسلامیہ کی بقا و تحفظ" کا جہاد شروع کر دیا اور سارے ہندوستان میں چندہ جمع کر کے قسطنطنیہ بھیجنے، اور جنگ بلقان کے سلسلہ میں ٹرکی کی مدد کرنے کا کام ہو رہا تھا مبارک پور میں بھی گلی گلی۔

بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دیدو

کا نغمہ گونج رہا تھا۔

اور یہاں کی بہو بیٹیوں کے گلے اور ان کے زیور اتر رہے تھے، اس اثنا میں بقرعید کے موقع پر کی رقم لگ بھگ سات سو روپے مدرسہ کے فنڈ میں جمع ہوئی۔ اس موقع پر مدرسہ کی انتظامیہ کمیٹی ہوئی طیب گرہست نے یہ تجویز رکھی کہ اس وقت خلافت وقوم کی بقا مدرسہ کے تحفظ سے زیادہ اہم ہے، اس لیے مدرسہ فی الحال موقوف کیا جائے اور اس کی ساری رقم بھی ''سمرنا فنڈ'' میں بھیج دی جائے، اس وقت کے نشہ میں پوری قوم سرشار تھی ہی! تجویز باتفاق آرا پاس ہوئی، اور مدرسین اپنے اپنے گھر چلے گئے، چھ دنوں کے بعد یہ صاف نظر آ گیا کہ بلی تھیلے سے باہر آ چکی ہے اور مولوی محمود صاحب حسب دستور پڑھا رہے ہیں۔

(سابق متولی حاجی خیر اللہ صاحب دلال مرحوم کا بیان ہے کہ میں، حافظ محمد ابراہیم، بابو سردار، میاں جی بدلو نے جب یہ دیکھا تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، کیوں کہ جیسا ہر جگہ ہوتا ہے یہاں بھی شیطان دولت کے گنبد پر انڈا دے چکا تھا، ثروت گرہی کے خانے میں منظم ہو چکی تھی اور یہاں کا سرمایہ دار طبقہ مولوی محمود صاحب کے فیور میں تھا۔ ہم چاروں نے طیب گرہست سے پوچھا آخر مدرسہ کے اختتام کی تجویز کیا ہوئی؟ انھوں نے کہا بحال ہے! ہمارا سوال تھا پھر یہ مولوی محمود صاحب کیسے پڑھا رہے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا مولوی الٰہی بخش صاحب وغیرہ نے نجی طور پر انھیں روک لیا ہے، اگر تم میں سکت ہو تو تم بھی اپنے طور پر اپنے مولویوں کو بلوا کر تعلیم دلوا سکتے ہو، ہم نے دیکھا، ہم خود ہی لاعلمی میں اپنا گلا کاٹ چکے تھے اور حریف خوش تھا کہ ان محتاجوں سے کیا ہو سکے گا؟۔

ہم لوگ یہ جواب سن کر قصبہ کے زمیندار اور رئیس شیخ عبد الوہاب گرہست کے پاس گئے اور ان سے سارا ماجرا بیان کیا، یہ خوش عقیدہ آدمی تھے اور مولوی محمود صاحب سے کچھ ایسا متاثر بھی نہ تھے انھوں نے ہماری ڈھارس بندھائی اور اس میں اسی کی ضرورت تھی، چناں چہ ہم نے متوکلا علی اللہ مولوی محمد صدیق صاحب گھوسی مرحوم مغفور اور مولوی نور محمد صاحب مرحوم پیش امام جامع مسجد راجہ مبارک شاہ کی خدمات حاصل کیں۔

مدرسہ کی اپنی نجی عمارت تو تھی نہیں اس لیے پہلی جگہ دونوں فریق میں سے کوئی بھی

نہیں پہونچا، ہماری اس جد و جہد میں چوں کہ سابق الذکر مولوی محمد عمر صاحب سبزی فروش بھی شامل تھے جو شاہ عبد اللطیف صاحب ستھنی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے مرید تھے اور ہم سب لوگوں کو حضور مخدوم اشرف جہاں گیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سلسلے سے تعلق تھا، اس لیے ہم نے اپنی اپنی عقیدت کے اظہار کے لیے مدرسہ کے سابق نام پر مزید دو حرفوں کا اضافہ کیا۔ اور اب پورا نام مدرسہ لطیفیہ اشرفیہ مصباح العلوم ہوا۔ یہ حادثہ ۱۳۲۹ھ کا ہے۔

آمدنی کے سارے ذرائع مثلاً کوڑی (گولک وغیرہ) پر مبارک پور کے سرمایہ دار ہی چھائے تھے، اس لیے وہ مطمئن تھے، ہم لوگوں کا یہ حال تھا کہ سچ مچ جھولیا گلے میں ڈالے فقیروں کی طرح گلی گلی، در دروازے مدرسہ کے لیے صدا لگاتے باہر دیہات میں جاتے اور دانہ دانہ جمع کر کے لاتے، اس طرح طلبہ و مدرسین کے اخراجات کسی طرح پورے کرتے۔ آج وہ لوگ ہم میں موجود نہیں ہیں مگر ہم قوم و ملت کے ان جیالوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں اور ان کی روح کو سلام و رحمت نذر کرتے ہیں کہ انھوں نے طوفان کی زد پر بھی سچائی کا دیا جلائے رکھا۔ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

ظاہر ہے کہ اس کس مپرسی کے عالم میں اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے تھا کہ مدرسہ کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی کے دن گزارتا رہا اور بالکل خانہ بدوشانہ انداز میں، اس مسجد سے اس دالان میں، اور اس دالان سے اس برآمدے میں، اس برآمدے سے اس مکان میں، اور اس مکان سے فلاں دوکان میں منتقل ہوتا رہا، اور یہی حال اس میں علما کی آمد و رفت کا بھی رہا۔ مولانا محمد صدیق صاحب علیہ الرحمہ کے وصال کے بعد ان کے دو شاگرد مولوی عبد الحی اور مولوی محمد یحییٰ صاحبان کام چلاتے رہے، پھر مولانا عبد السلام صاحب شاگرد مولانا محمد صدیق صاحب صدر المدرسین ہوئے، ان کے بعد مولانا عبد المنان صاحب گیاوی مقرر کیے گئے، تھوڑے ہی دنوں کے بعد مولانا اکرام الحق صاحب گنگوہی نے مسند صدارت سنبھالی۔ پھر مولوی انیس احمد صاحب سریر آرائے درس ہوئے۔ اسی طرح تقریباً بارہ سال کی مدت میں چھ مدرس آ جا چکے تھے۔

مولانا محمد صدیق صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بعد اس مدرسہ نے ایک دفعہ غیر معمولی ترقی بھی کی جب کہ اس کی دومنزلہ پختہ عمارت مولوی محمد عمر صاحب سبزی فروش کی کوشش سے وہیں تعمیر ہوئی تھی جہاں اب جامع مسجد ہے (آج سے چالیس سال قبل اس مدرسہ کا شمال مشرق کا کونہ باقی تھا جسے میں نے خود دیکھا ہے) کسی وجہ سے اس عمارت کا بھی یہاں کے عام سنیوں نے بائیکاٹ کیا اور اسی چپقلش میں مدرسہ کے نئے نام سے لطیفیہ کا لفظ بھی علاحدہ کردیا گیا اور اب صرف وہ مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم رہ گیا، اور مدرسہ اسی سابقہ خانہ بدوشانہ زندگی پر قانع رہا، جو ابتداء ہی سے اس مدرسہ کا طرۂ امتیاز تھا، تا آں کہ ۱۴۱ ہجری میں رئیس قصبہ جناب عبدالوہاب صاحب نے محلہ پرانی بستی میں ایک خام دومنزلہ عمارت مدرسہ کے لیے مخصوص کردی اور تھکے ہارے مسافر کو گویا ایک منزل مل گئی۔

اسی دوران میں مولوی شکراللہ صاحب دیوبند سے فارغ ہوکر آچکے تھے، رگوں میں نیا خون، دل میں جوان عزائم، اور مزاج میں لیڈری کا شوق، بڑی ہی شدومد کے ساتھ انھوں نے مبارک پور کی ریت ہی بدلنے کا پرشور اقدام کیا، صاحب ثروت کم، ذی اثر زیادہ تھے اور دولت مند گروپ بھی انھیں کی طرف تھا، بہت جلد ہی یہ محسوس ہونے لگا کہ مبارک پور ایک نئے مذہبی دور میں داخل ہونے والا ہے۔

مدرسہ الگ ہونے کے باوجود جمعہ ایک ہی جگہ راجہ مبارک شاہ علیہ الرحمہ کی مسجد میں سنی امام حضرت مولانا انور محمد صاحب علیہ الرحمہ کی امامت میں ہوتا تھا۔ لیکن مولوی شکراللہ صاحب موصوف نے کمال عجلت سے اپنا جمعہ علاحدہ کرلیا۔

معدودے چند پرانے خیال کے خوش عقیدہ مسلمان یہ صورت حال دیکھ کر گھٹ رہے تھے، مدرسہ اشرفیہ زندہ ضرور تھا، مگر مردہ سے بدتر، امید ٹوٹ چکی تھی، اور مستقبل بھیانک ہورہا تھا کہ تاریکیوں میں نور کی کرن جگمگانے والے پروردگار نے غیب سے انتظام کردیا۔

(مبار پور کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں دنیاوی سربراہی بھی، دینی قیادت کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کتنے افراد مبارک پور کے افق پر آفتاب وماہتاب بن کر چمکے، مگر یہ ساری چمک دمک اسی وقت تک رہی جب تک وہ مذہبی قیادت بھی کرتے رہے، جہاں مذہبی سرگرمیوں سے دل چسپی کم ہوئی دنیاوی حیثیت سے بھی ایک دم بجھ گئے بلکہ ختم ہو گئے۔

ہوا یہ کہ عبدالوہاب صاحب گرہست کا گھرانہ پورے قصبہ میں ممتاز اور پورے ضلع میں کامیاب ترین مسلم گھرانہ تھا اور پورے قصبہ کی سربراہی بھی تقریباً اسی گھرانہ کی میراث تھی۔ مولوی شکراللہ صاحب سرگرمیوں کے نتیجہ میں اب سیاسی رہنمائی کا مرکز ثقل بھی بدل رہا تھا، اس لیے اس خاندان کی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالنے کے لیے نہایت ضروری تھا کہ عوامی رابطہ کی طرف توجہ دی جائے۔ ادھر قصبہ کے غربائے اہل سنت مولوی شکراللہ صاحب کی مذہبی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر اپنی کمزوری کی بنیاد پر اس امر کی سخت ضرورت محسوس کرتے کہ کسی مضبوط قیادت کے ذریعہ ''مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم'' کی بقا اور ترقی اور مذہب اہل سنت و جماعت کے استحکام کو حتمی بنایا جائے۔ الغرض مبارک پور کے سنیوں کو ایک لیڈر کی ضرورت تھی، ان حضرات کو پیچھے چلنے والی ایک قوم کی، اس طرح مبارک پور کی سنیت اور ''مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم'' فریقین کے لیے نکتہ اتحاد ثابت ہوا۔

اور حسن اتفاق سے اس خاندان سے جو فرد اس کام کے لیے آگے بڑھا وہ نہایت جری، انتہائی ہوش مند، پرجوش اور متحرک میری مراد مرحوم محمد امین صاحب گرہست انصاری سے ہے جن کی جادو بیانی اور پرجوش قیادت نے تقریباً چوتھائی صدی پورے مبارک پور کو زندہ اور متحرک رکھا۔

افسوس آج مرحوم ہم میں نہیں ہیں مگر ان کے زریں کارنامے ان کی پیشانی پر سنہرے حروف سے لکھے ہوئے ہیں، ہم دست بدعا ہیں اللہ عزوجل ان کی روح کو سکون بخشے اور ان کی کوتاہیوں کو درگزر فرمائے، ہم ان کو اپنے جذبات احترام پیش کرتے ہیں کہ

مبارک پور میں گرتی ہوئی سنیت کو سنبھالا، بلکہ عروج وارتقا بخشنے والوں میں ان کا نام بھی سر فہرست ہے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے سبزہ نورستہ اس گل کی نگہ بانی کرے

۴۲ ہجری کے لگ بھگ جناب محمد امین صاحب مدرسہ ہی نہیں بلکہ پورے قصبہ کے سنیوں کے بھی صدر قرار پائے، مدرسہ کے انتظام میں استقلال پیدا ہوتے ہی اس کے مدرسوں کو بھی قیام وثبات پیدا ہو گیا اور ۱۳۴۶ھ میں مولانا رئیس الحق صاحب ساکن گجڑہ ضلع اعظم گڑھ کا تقرر بمشاہرہ بیس روپے بعہدۂ صدر مدرسی ہوا۔ موصوف تھے تو فاضل دیو بند لیکن مسلسل چار سال تک نہایت خوش اسلوبی سے مدرسہ کو فارسی اور ابتدائی عربی تک باقی رکھا۔ انھیں کی کوشش سے مولانا علی احمد صاحب، مولانا محمد محبوب صاحب اشرفی، مولانا محمد حاتم صاحب، مولانا حفیظ الدین تعلیم پا کر اس لائق ہوئے، مزید تعلیم و تکمیل کے لیے بریلی، میرٹھ، امروہہ وغیرہ دور دراز مدارس اہل سنت میں گئے اور مدرسہ کے مذہبی (سنی) کردار پر بھی مولانا نے آنچ نہ آنے دی۔ گویا ع

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

اس وقت بھی صدر کمیٹی محمد امین انصاری مرحوم ہی تھے اور ورکنگ کمیٹی میں حسب ذیل افراد کے نام دست یاب ہو سکے ہیں (۱) حاجی غلام رسول (۲) حاجی پھیکو صباغ (یہ نہایت دین دار اور حد درجہ امین تھے) اور حیات العمر مدرسہ کے خازن رہے (۳) حاجی عبد السبحان صاحب سوت والے (۴) بابو سر دار، یہ مدرسہ کے قدیم ترین رکن اور نہایت سرگرم کارکن تھے (۵) حاجی محمد عثمان صاحب پورہ رانی، قیاس یہ ہے کہ حاجی خیر اللہ دلال متولی اور محمد ابراہیم صاحب متولی بھی ضرور ممبر رہے ہوں گے۔

یہاں یہ بات جان لینی خالی از دل چسپی نہ ہوگی کہ خاندان اشرفی سے رابطہ کی وجہ سے مبارک پور کی سنیت کا تعلق پورے ہندوستان میں سنیت سے قائم اور زندہ تھا۔ بلکہ ہندوستان کے مقتدر علماے ملت اس کے نگراں مربی اور سر پرست تھے۔ سب سے

قدیم روداد دستیاب ہو سکی ہے اس میں تحریر ہے۔

"دار العلوم اہل سنت مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم" اٹھائیس سال سے تعلیمی اور تبلیغی خدمت انجام دے رہا ہے جس کے سرپرست شمع شبستان غوثیت حضرت مولانا العلام شاہ ابو المحامد سید محمد صاحب کچھوچھوی دامت برکاتہم وعلامہ زمن خاتم الفقہا حضرت صدر الشریعہ مولانا شاہ امجد علی صاحب قبلہ دامت برکاتہم العالیہ ہیں۔

(روداد ۵۶،۱۳۵۷ھ ص ۴)

اس وقت بھی یہاں کے سالانہ جلسے پورے علاقہ میں مشہور تھے اور مشاہیر علمائے اہل سنت یہاں تشریف لاتے تھے، مثلاً شیخ المشائخ اشرفی میاں علیہ الرحمہ، ان کے خلف رشید مولانا سید احمد اشرف عرف بڑے مولانا صاحب، نواسے حضرت محدث اعظم ہند مولانا سید محمد صاحب اشرفی جیلانی علیہ الرحمہ، حضور صدر الشریعہ حضرت مولانا محمد امجد علی صاحب قدس سرہ العزیز، حضرت مولانا محمد فاخر صاحب الہ آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ وغیرہم۔

آخر وہ دن بھی قریب آگئے کہ مبارک پور کو رحمت الٰہی کی بجلیوں نے اپنا نشیمن بنایا، کچھ تو مولوی شکر اللہ صاحب کی مسلسل جارحیت کے رد عمل میں، کچھ مدرسہ کی حالت کے یک گونہ استحکام کے نتیجہ میں اور کچھ جماعت اہل سنت میں بھی مقامی علما (مثلاً مولانا حفیظ اللہ صاحب قریشی رضوی علیہ الرحمہ وغیرہ) پیدا ہو جانے کی وجہ سے یہاں کے سنیوں میں زندگی کی نئی حرارت پیدا ہوئی، اور مدرسہ کو مزید ترقی دینے کا خیال رونما ہوا جسے یہاں کے ارکان نے اپنے سرپرستوں کی خدمت میں رکھا۔

یہ ذکر اس وقت کا ہے کہ چودھویں صدی نے اپنی عمر کی نصف منزل طے کر لی تھی، اور یہیں سے اشرفیہ کی قدیم تاریخ کا صبر آزما حوصلہ شکن، اور تکلیف دہ باب ختم ہوا، اور اس کی نشاۃ ثانیہ کا پر بہار، زندگی بخش، اور نشاط پرور دور شروع ہوا، سرزمین مبارک پور میں دین وسنیت کی فصل بہاراں جلوہ گر ہونے والی ہے، اور آفتاب حق کی عکس ریزی اور نور

بیزی کا موسم قریب ہے۔ چنانچہ ۲/ذی قعدہ ۱۳۵۲ھ کو حضور حافظ ملت شیخ الحدیث دار العلوم اشرفیہ مولانا شاہ عبد العزیز صاحب علیہ الرحمہ، صدر الشریعہ حضرت مولانا شاہ امجد علی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے حکم سے مبارک پور تشریف لائے آپ خود فرماتے ہیں:

(شوال ۱۳۵۲ھ میں حضرت صدر الشریعہ قبلہ علیہ الرحمہ نے خط لکھ کر مجھے وطن سے بریلی شریف بلایا، خط میں کوئی تفصیل نہ تھی، وہاں پہونچا تو فرمانے لگے: میرا ضلع بالکل خراب ہوگیا، دیوبندیت بڑھ رہی ہے، اس لیے میں آپ کو دین کی خدمت کے لیے بھیج رہا ہوں، میں نے عرض کیا کہ حضور میں ملازمت نہیں کرنا چاہتا! فرمایا: میں نے آپ سے ملازمت کے لیے کب کہا۔ میں تو خدمت کے لیے کہہ رہا ہوں۔ آپ ملازمت سمجھ کر جایئے بھی نہیں۔ میں چپ ہوگیا، تو فرمانے لگے: میں آپ کو مبارک پور بھیج رہا ہوں، یہ مت خیال کیجیے گا کہ وہاں کیا مل رہا ہے، میں حضرت کے حکم سے مطابق ۲/ذی قعدہ ۱۳۵۲ھ مطابق ۷/ریا۸/فروری ۱۹۳۴ء کو مبارک پور پہونچا)

آج چالیس سال گزر جانے کے بعد بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے اور میں اپنی چشم تصور سے دیکھ رہا ہوں۔ وہ ایک نہایت تاب ناک اور روشن دن تھا اور نکھری ہوئی دھوپ میں پورا مبارک پور چمک رہا تھا جب حافظ ملت طاب ثراہ یہاں تشریف لائے۔

مدرسہ کی قدیم عمارت (واقع پرانی بستی) جس کا صدر دروازہ پچھم رخ ہے اور جو تقریباً تیس فٹ لمبا ایک دالان میں کھلتا تھا، اسی دالان سے متصل پورب رخ اتنا ہی بڑا ایک برآمدہ اور اس کے پورب آنگن اور آنگن و برآمدہ سے متصل اتر جانب ایک کمرہ تقریباً چھ فٹ پورب پچھم لانبا جس کا ایک دروازہ دکھن رخ آنگن میں اور اسی رخ پر برآمدہ میں کھلتا تھا، اسی مؤخر الذکر دروازے کے پاس اس وقت کے صدر المدرسین حضرت مولانا شمس الحق صاحب علیہ الرحمہ کی نشست تھی اور یہ پورا کمرہ ان کی درس گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ حضرت حافظ ملت قبلہ سب سے پہلے وہیں مولانا کی درس گاہ میں تشریف فرما ہوئے۔

سر پر راجستھان کے کیسری رنگ میں رنگا ہوا عمامہ، جسم پر بادامی رنگ کے نیچے دامن کی شیروانی، شرعی پاجامہ اور پیر میں لدھیانہ کے سرخ رنگ کے جوتے، ہاتھ میں بانس کی چھڑی (غالبا مرزاپوری) مختصر قد، اور معمولی جسم وجثہ کے انسان اور نگاہیں نیچی کر کے چلنے کی ایک امتیازی شان۔

تقریباً نصف صدی کی اس طویل مسافت میں زمانہ کہاں سے کہاں پہونچ گیا، وقت نے کیا کیا رنگ بدلے، غلام آزاد ہوئے اور آزادوں نے حیوانوں کا روپ دھار لیا، تہذیب وتمدن بدل گیا، عوائد ورسوم بدل گئے، وضع قطع اور پوشش وخورش میں انقلاب آ گیا، مگر حافظ ملت کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے حضور زمانہ کی نبض ٹھہر گئی ہے، اور وقت کے ساعت نما میں ٹائم کا کانٹا پچاس سال پیچھے کھسک گیا ہے۔ بالوں کی سپیدی کے علاوہ زمانے کے مرور کا کوئی اثر آپ ان پر ملاحظہ نہیں کر سکتے۔

اللہ اللہ! اس طویل مدت میں کتنے طوفان آگ بگولے پیدا ہوئے، آندھیاں اٹھیں کہ بڑے سے بڑے پہاڑ ہل گئے لیکن وضع قطع کیا بدلتی کہ چال میں بھی سرمو فرق نہیں آیا، وہی لباس جو چالیس سال قبل تھا، اور وہی رفتار جو چالیس سال پہلے تھی۔

حد یہ ہے کہ اب سے چالیس سال قبل جو کہہ دیا تھا آج بھی اس میں ترمیم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، جیسے شمع حقیقت کی لو خطرناک تھپیڑوں میں جلتی رہی، دبیز تاریکیوں میں مسلسل فروزاں رہی۔ ع:

تیری شمع حق نما میں ہے وہ زور رہنمائی　　　کہ ہزار آندھیوں میں نہ بجھی نہ جھلملائی

(۱) مولانا شمس الحق صاحب جو الحمد اللہ اب بھی صحت وسلامتی کے ساتھ دار العلوم میں مفوضہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مرنجاں مرنج طبیعت، باغ وبہار شخصیت، گلستاں وبوستاں سعدی از بر، اور ہر چھوٹے بڑے سے بہت جلد بے تکلف ہو جانے والے، ہم نے دیکھا حضور صدر الشریعہ مولانا امجد علی علیہ الرحمہ بھی آپ پر بے حد شفقت فرماتے اور آپ کے ساتھ بے تکلفانہ رہتے۔

(۲) مولانا نور محمد صاحب مبارک پوری ۔آپ کا تعلق مبارک پور کے اس خاندان سے تھا، جو حضرت راجہ مبارک شاہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ساتھ کڑوامانک پور سے آ کر آباد ہوا تھا جس کو یہاں کی قضا سپرد کی گئی تھی۔ جب میں نے دیکھا تو یہ منصب صرف نکاح خوانی تک محدود تھا، تعلیم آپ کی محلہ رسول پور کے علمی گھرانہ مولوی لعل محمد صاحب کے وہاں ہوئی تھی، جو اعمال وعقائد میں بے حد ڈھیلے ڈھالے لوگ تھے۔ مگر خود مولانا نور محمد صاحب مرحوم اس وقت بھی جب مبارک پور میں سنیت بے سہارا تھی، اہل سنت وجماعت کے پشت پناہ تھے، اور تمام تر معمولات سنیت از قسم نیاز وفاتحہ، قیام ومیلاد، اور مجالس محرم ساری ضروریات پورے مبارک پور میں آپ ہی انجام دیتے۔ راجہ مبارک شاہ کی مسجد جامع کے خطیب تھے۔ اور ہر جمعہ کو تقریباً نیا خطبہ پڑھتے، ذی علم بھی تھے، میں نے ان کی کئی قلمی بیاضیں دیکھی ہیں، جس میں حدیث کا انتخاب، اختلافی مسائل پر گراں مایہ علمی کتابوں کی نقل قابل ذکر ہے۔ پورا دیوان لطف، اور مولود شریف وغیرہ برزبان تھے۔ اور ایسی بلند آہنگی سے میلاد شریف پڑھتے تھے کہ دور دور تک آواز جاتی تھی۔ اشعار ایک خاص سر اور لے میں پڑھتے، جواب عنقا ہے۔ اللہ غریق رحمت کرے، مبارک پور کی تاریخی شخصیتوں میں سے تھے، فارسی زبان میں خاص طور سے آپ کو یہ ید طولیٰ حاصل تھا، میں نے بھی فارسی کے چند اسباق آپ سے پڑھے ہیں۔ جس وقت کا حال قلم بند کر رہا ہوں کافی ضعیف ہو گئے تھے۔ بچوں کو ابتدائی تعلیم دیتے اور بیشتر اوقات سلیٹ پر تاریخ نکالتے اور حساب لگاتے رہتے، اور ساتھ ہی ساتھ اونگھتے بھی جاتے رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ رحمۃ واسعۃ

(۳) منشی جواد علی خاں صاحب مرحوم۔ آپ پرائمری درجات کے ہیڈ منشی تھے، مجلسی آدمی تھے، مجھے بہت چاہتے تھے۔ لیکن ان کا کمال یہ تھا کہ مسلسل پانچ سال تک مجھے درجہ الف میں رکھا اور میرے خیال میں عام ترقی کی رفتار ان کے یہاں ایسی ہی تھی۔

(۴) حافظ عبدالغفور صاحب مرحوم ومغفور۔ آپ درجہ حفظ وناظرہ کے مدرس تھے، نہایت پاکباز، اور پابند، اوراد ووظائف میں مشغول رہتے تھے، مشہور ہے کہ شب

زفاف میں بھی ان کی نماز تہجد قضا نہ ہوئی، قرآن عظیم اچھا یاد تھا، اور نہایت خوش الحان تھے۔ کسی نے عداوۃً پان میں سندور کھلا دیا تھا جس کی وجہ سے آواز خراب ہوگئی تھی، کبھی باریک اور کبھی کئی سروں نکلتی۔ مدت العمر یہاں مدرس رہے اور اخیر عمر میں مدرسہ نے آپ کی کچھ پینشن بھی مقرر کرائی تھی۔

(۵) حافظ عبدالرحمٰن صاحب ٹینٹی مرحوم۔ یہ بھی نہایت درجہ نیک، ذاکر وشاغل اور صاف باطن آدمی تھے۔ حضور اشرفی میاں علیہ الرحمہ کے خلیفہ مجاز بھی تھے۔ اور غالباً مرید بھی کرتے تھے۔ زندگی بھر مجرد ہی رہے۔ گھر سے تھوڑی دور پر ایک کمرہ عبادت سامنے تھوڑا صحن اسی میں کنواں اور چہار دیواری بنائی تھی، کمرہ میں ایک طرف قبر بھی تیار کر رکھی تھی، خیال یہ رہا ہوگا کہ مرنے کے بعد یہی مقبرہ ہوگا۔ لیکن لوگوں کے منع کرنے پر یہ بات نہ ہوسکی، اخیر وقت میں ایک سرمایہ دار ظلماً ان کے مکان پر قبضہ کرلیا تھا، تو اسی کمرہ میں رہتے تھے۔ ان کے وصال کے بعد یہ گھر بطور مسجد استعمال ہوتا ہے۔ مدرسہ میں قاعدہ بغدادی اور قرآن مجید کے ابتدائی پارے پڑھاتے تھے۔ زبان سے ت کے بجائے ٹ ادا ہوتا تھا، اس لیے دوران تعلیم اکثر لطائف وظرائف بھی رونما ہوتے رہتے۔ بچوں کی تہدید کے لیے مختلف قدوقامت کی چھڑیا بنا رکھی تھیں، تاکہ اپنی جگہ پر بیٹھے ہی بیٹھے سب کی نگرانی ہوجائے۔ بسا اوقات چھڑی پھینک کر مارتے اور نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا۔ ایک دفعہ میں بھی اس کی زد میں آیا اس کے بعد اتنی دور بیٹھتا کہ تمہ زد سے باہر رہے۔

اس وقت جماعت کے سرگرم ممبروں میں حسب ذیل حضرات کے نام مجھے یاد آسکے، اگر کسی کو بھول گیا ہوں تو گزارش ہے کہ مجھے معاف رکھا جائے۔

(۱) محمد سلیمان رنگریز پورہ رانی (۲) حاجی مقیم اللہ صاحب پورہ خضر (۳) حاجی ولی اللہ صاحب پورہ رانی (۴) حاجی محمد یوسف صاحب مناظر پورہ رانی (۵) جناب مولوی فقیر اللہ صاحب پورہ دیوان (۶) جناب حاجی رحمۃ اللہ صاحب خازن پورہ رانی (۷) جناب علیم اللہ صاحب ناظم پورہ رانی (۸) حاجی بیتھے صاحب نیا پورہ (۹) حاجی یاد محمد

صاحب پورہ دلھن (۱۰) حافظ عبدالحلیم صاحب پورہ خواجہ (۱۱) حاجی سلامت صاحب رانی بستی (۱۲) حاجی خیر اللہ و حافظ محمد ابراہیم صاحبان متولیان مدرسہ وغیرہ وغیرہ۔

حضور حافظ ملت اپنے ساتھ صرف دو طالب علم حضرت مولانا محمد خلیل صاحب مرحوم اور جناب قاری اسدالحق صاحب مرحوم کو لائے تھے۔ لیکن آج تک میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ مبارک پور جیسے گم نام قصبہ میں جسے ہندوستان تو کیا دو چار ضلعوں کے باہر کوئی جاننے والا نہ تھا۔ نہ یہاں کوئی ایسی خاص چیز تھی کہ لوگ اس سے متعارف ہو سکیں، حد یہ ہے کہ آج بھی بیش قیمت ریشمی ساڑیاں بنتی یہاں ہیں اور بکتی سارے ہندوستان میں بنارس کے نام سے ہیں۔ ایسے بے حیثیت قصبہ کے بارے میں سارے ہندوستان میں یہ صور کون پھونک آیا کہ وہاں ایک بلند پایہ علمی درس گاہ قائم ہوگئی ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے پورے ہندوستان کے ذہین ترین طالبان علم دین کی ایک بڑی بھیڑ جمع ہوگئی، جو اپنی وضع قطع، قد و قامت، لباس اور رہن سہن میں خود بہت بڑے عالم معلوم ہوتے تھے۔

(۱) یہ ضلع گورداس پور پنجاب کے مولوی محمد ابراہیم، پنجابی پاجامہ، لمبی قمیص پہنے ہوئے، طرہ دار پنجابی صافہ باندھے، گورے چٹے پنجابیوں کی روایتی بلند ناک اور خوبصورت چہرہ کے ساتھ بغل میں کتاب دبائے ادھر سے ادھر آ جا رہے ہیں، ان کی ذہانت و فطانت ضبط و حفظ کا یہ عالم کہ جو کتاب ان کی بغل میں ہے بلا مبالغہ وہی ان کے دل و دماغ میں بھی ہے۔

(۲) یہ حیدرآباد دکن کے قاری مصلح الدین صاحب، بھاری بھرکم ڈیل ڈول، بھری بھری داڑھی میں بارعب چہرہ، یہاں تعلیم حاصل کرنے آئے ہیں، اللہ نے اتنی پیاری آواز دی ہے، کہ جب قرآن پڑھنے لگتے ہیں، تو محسوس ہوتا ہے کہ تاثیر کی لہریں آہستہ آہستہ پھیل رہی ہیں، اور سارا ماحول ایک روحانی کیف میں ڈوب جاتا ہے۔

(۳) یہ پال گھر علاقہ بمبئی کے مولوی محمد عثمان معمولی جثے اور لانبے قد ہیں، سانولے نوجوان، جن کے سارے جسم میں ناک امتیازی شان رکھی تھی۔ اللہ اکبر ذکاوت

کے بوٹی بوٹی تھرکتی تھی اور کم از کم مبارک پور کے دائرہ علمیہ میں تو یہ بحاث مجلس شکن تھے۔
اس وقت مبارک پور میں مشنری مبلغوں کا زور تھا، یہاں آکر چائے پلاتے، دوا تقسیم کرتے، تبلیغی کتابچے تقسیم کرتے، وعظ کہتے اور بھجن گاتے۔ یہاں کے سبھی مکتبہ فکر کے کلمہ گوانھیں برا سمجھتے اور دیگر تمام فرقوں کے اہل علم نے ان سے بحث بھی کی لیکن وہ برابر آتے رہے۔ مولوی محمد عثمان نے ان سے بحث کی اور ایسا زچ کیا کہ اس کے بعد دوبارہ آنے کی ہمت نہیں ہوئی اور الحمدللہ تعالیٰ آج تک مبارک پوران کی سرگرمیوں سے پاک ہے۔

(۴) یہ آسام کے سوار عبدالسبحان عبدالقیوم پورے مبارک پور میں اپنی آسامی سج دھج کے ساتھ دور سے پہچانے جاتے ہیں، ان کی ذہانت و یادداشت کا سکہ پورے مدرسہ میں جاری مگر ہمارے اپنی زبان سے معذور ہیں پوری عرق ریزی سے پڑھتے بھی ہیں اور کسب معاش کے لیے بیڑی بھی بناتے ہیں۔

(۵) اور یہ صلح کے پرچم کی طرح سر بلند، راجستھان کے رہنے والے، پیر جی محمد شفیع ہر فن میں کمال رکھنے کے مدعی اور ہر ہنر میں مہارت کے دعوے دار، باورچی خانہ سے لے کر انجینیر نگ تک، کشتی و بنوٹ سے لے فلائنگ تک، تحریر و دستکاری سے لے کر صنعت و حرفت تک جس علم و فن کسب و ہنر میں بات چل نکلے ان کا یہی حال کہ: ع: بجلی تو خانہ زار تیرے آشیاں کی ہے۔ کسی موقع سے دستر خوان پر بیٹھ کر داد طعام دینی شروع کریں تو دیکھنے والے حیرت کا مجسمہ بن جائیں کہ کیا اتنا زیادہ کھانا بھی ممکن ہے، مگر صبر و ضبط کا یہ عالم کہ جب تک مبارک پور رہے جاگیری کھاتے رہے مگر گھر والوں کو کبھی یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ مولانا کی خوراک بے حد غیر معمولی ہے۔ مذہب کے تصلب اور دین کی غیرت میں مشہور تھے، ربیع الاول شریف کے جلوس عید میلاد النبی ﷺ کا جھنڈا یہی لے کر چلتے اور ان پر خوب بہار بھی دیتا جیسے جھنڈے پر جھنڈا۔

(۶) یہ گونڈہ ضلع کے رہنے والے دادا عبدالحق، اپنی زیادتی عمر اور لمبی واڑھی کی نسبت سے پورے مدرسہ میں دادا ہی مشہور تھے۔ جب دیکھیے یا کتاب دیکھتے ملیں گے، یا کسی کو

پڑھاتے اور سمجھاتے، طلبہ مدرسین سے زیادہ ان سے مانوس اور ہر دم انھیں گھیرے رہتے، اور یہ بھی کبھی کسی کو جھڑکنا یا انکار کرنا جانتے ہی نہیں تھے، جیسے سچ مچ پورا مدرسہ ان کی اولاد در اولاد ہی ہو۔

(۷) یہ صوبہ اڑیسہ ضلع کٹک کے مولوی عباس نہایت طرار اور کھلنڈرے، لیکن پورے قصبہ میں ان سے زیادہ معروف ومتعارف کوئی طالب علم نہیں، کیوں کہ سنی دیوبندی آپریشن میں یہ اہل سنت و جماعت کے سرکاری شاعر بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ سرکاری مقری، کیوں کہ شاعر در اصل مبارک پور کے منشی زماں مرحوم ہوتے اور یہ اپنے نام سے انھیں جلسوں میں پڑھتے۔ اور انھیں سننے کے لیے اس وقت کے مناظرانہ جلسوں میں لوگ بڑی تعداد میں جمع ہوتے۔ میری عمر اس وقت بہت چھوٹی تھی آج تک چند مصرعے یاد ہیں اور کچھ مزید کاوش سے ملے ہیں:

لمبی داڑھی سر پہ گھٹے جو ہر ایماں نہیں
ایسے مکاروں کے پھندے میں نہ آنا چاہیے
کوا کھاتے کھاتے ان کے ہو گئے ہیں دل سیاہ
ان کو غوث پاک کا بکرا کھلانا چاہیے
شرع کا خون کرتے کرتے سرخ آنکھیں ہو گئیں
خاک پائے غوث کا سرمہ لگانا چاہیے
شرع کا خون یہ کریں اور شاعری کا وہ کریں
دونوں خوں خواروں کو اک اسی میں لانا چاہیے

(۸) دار العلوم اشرفیہ کے نمائندہ طلبا کی یہ فہرست نامکمل رہے گی اگر میں مولانائے ذیجاہ حقیقت پناہ معرفت آگاہ، حضرت مولانا عبد الرؤف صاحب بلیاوی علیہ الرحمہ کا تذکرہ نہ کروں، دبلے پتلے جسم وجثہ کے انسان، آنکھیں بڑی بڑی اندر کو دھنسی ہوئی، ناک بلند، گال پچکے ہوئے، اور داڑھی کے بال بے حد معمولی، سامنے کہ اوپر والے

دونوں دانت معمول سے زیادہ بڑے، میں نے ان کو ان کی جوانی کے عالم سے اخیر عمر تک دیکھا، مجھ کو تو وہ جوانی میں بھی بوڑھے ہی نظر آئے ،صورت وشکل کے اعتبار سے بھی اور متانت وسنجیدگی کے اعتبار سے بھی، علم وتواضع، تدبیر ودانائی غرض کہ ہر اعتبار سے ایک نہایت تجربہ کار، اور داتا روح ان کے سکڑے لمبے جسم میں ودیعت کی گئی تھی۔ اور اسی کی مناسبت سے جسم بھی نہ ساون ہرا نہ بھادوں بھرا۔

اب تک دار العلوم کے فرغا کی فہرست ہزار کے نمبر تک پہونچی ہے جن میں ایک سے ایک خاص، ایک سے ایک کامل۔ کوئی تقریر کا امام کوئی تحریر کا بادشاہ، کوئی درس وتدریس کے میدان کا شہسوار، کوئی انتظامیات کا ماہر، کوئی مناظرہ کا دھنی، تو کوئی صلح کا نقیب، اور کوئی زندگی کی دوسری راہوں کا قائد۔ لیکن اس پوری فہرست میں حضرت مولانا گل سر سبد سب کے سب ان کے نیاز مند اور سب ان کے شرمندہ احسان، سب کے ہمراز اور سب کے دل ساز، غم خواری اور احساس کا مجسمہ، اور ذمہ داری واحساس کی تصویر۔

اللہ پاک نے دماغ ایسا نکتہ رس اور فکر اتنی رسا بنائی تھی کہ عام ذہین طلبہ کے مزاج کے خلاف استاذ سے الجھنا کیا معنی، اگر کوئی الجھے تو اسے جواب دیں اور استاذ کی طرف سے دفاع کریں۔ درس نظامی پر جتنا استحضار ان کو تھا میں نے کم لوگوں کو دیکھا، کسی مسئلہ کا ذکر کرو، پس بیٹھے ہی بیٹھے بلا مراجعت کتب کے فرمادیں، یہ ایسے ہے، اور یہ ایسے، کوئی پوچھے حافظ جی یہ بات کہاں ملے گی، آپ کا جواب ہوتا، فلاں فلاں کتاب کے فلاں فلاں صفحہ دیکھ لو۔ طالب علمی کے ہی زمانہ سے تقریباً تمام طلبہ کو علم وفن میں مدد دینا اور تکرار کرانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کے بارے میں مولوی مظفر قادری اکثر کہتے: حافظ جی کا مطمح نظر یہ ہے کہ جماعت کا سب سے کمزور طالب علم بھی بس سمجھ کر اٹھے، اور میرا خیال یہ ہے کہ جماعت کا سب سے سمجھ دار طالب علم سمجھ جائے، استاذ کی ذمہ داری ختم۔ الغرض مرحوم نے پورے مدرسے کی ذمہ داری لے رکھی تھی۔

ان کا ایک کارنامہ فتاویٰ رضویہ کی اشاعت ایک جماعت کے کام پر بھاری ہے۔

غیر معمولی محنت کے عادی اور جد و جہد کو تہائی منزل تک پہونچانے والے انسان۔ حضور حافظ ملت کے تصور الجامعۃ الاشرفیہ کو عملی جامہ پہنانے والوں میں ان کا کردار کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی علمی برتری کا سکہ پورے ہندوستان میں رواں دواں تھا۔ اور اپنی سوجھ بوجھ اور تجربہ کاری کے لحاظ سے وہ ملت کے عمائدین میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن تواضع اور سادگی کا یہ عالم تھا کہ یہ واقعہ مجھے زندگی بھر نہیں بھولے گا۔ مولانا کو دارالعلوم اشرفیہ میں مدرس ہوئے دسیوں سال گزر گیا تھا۔ اور آپ کی شخصیت علمی حلقوں میں پوری طرح اپنا مقام بنا چکی تھی۔ اس وقت مبارک پور کے ایک آدمی نے ان سے پوچھا، مولوی صاحب آپ کب تک پڑھیں گے، سب لوگ تو فارغ ہو ہو کر چلے گئے اور آپ ہیں کہ اب تک پگڑی نہیں بندھی۔ آپ کیا جواب دیتے، مسکرا کر رہ گئے۔ القصہ ع: حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

کوئی مسئلہ ہو یا کیسی ہی الجھن، مولانا کا دماغ اس سے ہار ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ معمولی معمولی مسئلوں پر بھی اتنا سوچتے تھے کہ ساتھی اکتا جاتے تھے۔ سارے مبارک پور میں ان کی کھتائی مشہور تھی۔ کہ جو بات حافظ جی تک پہونچی سردخانے میں پڑ گئی۔ لیکن حقیقت حال یہ نہ تھی۔ ان کو شدت سے اپنے علمی مقام اور شعوری رفعت کا احساس تھا، اس لیے وہ کسی معاملہ میں بھی ایسی بات اپنے منہ سے نکالنے کے روادار نہ تھے جس پر انگلی رکھی جاسکے، جب ہر طرح انھیں اطمینان ہو جاتا، جب ہی وہ کوئی بات کہتے۔ لیکن پھر اس سے ان کو ہٹانا بھی مشکل ہوتا۔

میرا مقصد اس فہرست کے پیش کرنے سے یہ تھا کہ مبارک پور میں حضور حافظ ملت تقریباً اکیلے تشریف لائے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان کے مختلف گوشوں سے طالب علموں کی ایک بہت بڑی بھیڑ ان کے گرد جمع ہوگئی جن کی تعداد اس وقت بھی بلا مبالغہ سو سے زائد تھی۔ ظاہر ہے کہ ان میں سب مولانا عبدالرؤف اور ظفر علی نہیں تھے، مولوی محمد ابراہیم اور محمد عثمان نہ تھے، بودے اور کم عقل بھی تھے، اسی طرح سب پاک باز اور

مرتاض نہ تھے، شریر اور بد خصال بھی تھے، لیکن عام طور پر اس وقت کے طلبہ اپنی وضع قطع اور معمولات روز وشب کے لحاظ سے طالب علم تھے۔ اور ان کی بود باش صاف طور پر ان کے طالب علم ہونے کی گواہی دیتی تھی۔

اس وقت طلبہ کا قیام گاہ سے درس گاہ یا وہاں سے دیگر مقامات تک ہاتھ میں درسی کتاب لے کر چلنا فخر سمجھا جاتا تھا، درس گاہ میں تو خوب جم کر تعلیم ہوتی تھی۔ جسے حقیقت بیانی سے کام لیا جائے تو مباحثہ کہنا ہی ہوگا۔ درس گاہ کے باہر بھی، یا تکرار ہو رہی ہے، یا کسی مسئلہ علمی میں تبادلہ ہو رہا ہے۔ راستہ میں آتے جاتے تفریح کے وقت کسی نہ کسی موضوع پر زور آزمائی ہو رہی ہے، جس سے طلب کی محنت دور سے پہچانی جاتی تھی۔ آج کی طرح نہیں کہ خارج از اوقات درس کا کیا ذکر عین حالت تعلیم میں بھی اوپر کلاس میں درس ہو رہا ہے۔ اور نیچے رہائشی کمروں میں چلے جائیے تو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ کوئی مدرسہ ہے، اور اس وقت اسباق جاری ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی سرائے یا مسافر خانہ میں کچھ خوش فکرے جمع ہوگئے ہیں، جس میں کچھ باہم ہنسی مذاق کر رہے ہیں، کچھ چوڑا بھون رہے ہیں، کچھ کھانا پکا رہے ہیں، تو کچھ آرام سے بستر میں دراز انگڑائی لے رہے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں جب اور اب کے اس فرق کو دیکھتا ہوں تو مجھے غیرت آتی ہے۔ کہ وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جو اپنے سلف کے نشانات کو اس طرح بھلا بیٹھے گی۔

ترسم کہ بہ کعبہ نرسی اعرابی   کیں رہ کہ تو میروی ترکستان ست

استثنا تو ہر زمانہ میں رہا ہے، وہ تب بھی تھا اور اب بھی ہے مگر عکس کے ساتھ اور عام حالات انتہائی اندوہناک اور مایوس کن ہیں۔

اس وقت جمع ہو جانے والے طلبہ کی خوراک کا مسئلہ یوں حل ہوا کہ مقامی سنی مسلمانوں کے گھرانوں میں ایک ایک طالب علم تقسیم کر دیئے گئے۔ جس کے لیے جاگیر، فکر اور جاگیر دار کی اصطلاحیں وضع ہوئیں۔ اور مسلمانان مبارک پور زندہ باد کہ انھوں نے عرب کی روایتی مہمان نوازی کی یاد تازہ کر دی، طالب علموں کے لیے اپنی دیدہ ودل فراش

راہ کر دیئے، گھر میں جو کچھ پکا سب کا سب لائے مولانا کے سامنے رکھ دیا، پہلے آپ کھالیں تب گھر کے بقیہ لوگ، گھر میں کوئی چیز آتی تو گھر کے اور افراد کی طرح ان کا بھی حصہ لگاتے رہتے، لوگوں نے تو خود بھوکے رہ کر مولانا کو کھلایا۔ کیوں کہ انھیں یہ بتایا گیا تھا کہ یہ مہمانان رسول ہیں اور یہ چلتے ہیں تو فرشتے ان کے قدم کے نیچے پر بچھاتے ہیں، اور ان کی دوات کی روشنائی شہیدوں کے خون سے زیادہ قیمتی ہے، اسی لیے اہل مبارک پور بھی ان سے فرشتوں کی سی توقع رکھتے اور ویسا ہی احترام بھی کرتے تھے۔ بعد کے حالات نے احترام وعقیدت کی وہ فضا تو ختم کر دی لیکن اب بھی جس اعزاز واکرام کے ساتھ اہل مبارک پور طالب علموں کو کھانا کھلاتے ہیں پورے ہندوستان میں اس کی نظیر نہیں ہے اور رہنے کا مسئلہ یوں حل کیا گیا کہ مختلف دالانوں (امام باڑوں) اور مسجد کے حجروں، محمد امین صاحب صدر مدرسہ کے مکان وغیرہ مختلف جگہوں پر ان کے قیام کا انتظام ہوا۔

قیام وطعام کے انتظام اور طلبہ کے مذکورہ بالا مشغلہ علمی کی وجہ سے پورے مبارک پور میں ایک علمی ہلچل پیدا ہوگئی جس کا اثر اشرفیہ کے حلقے سے باہر بھی محسوس کیا جانے لگا۔

اور میرے خیال میں یہی سبب بنا اس برق رفتار علمی اور دینی ترقی کا جس کے نتیجے میں مبارک پور بے علمی وجہالت کی نچلی تہوں سے نکل کر شہرت وعروج کی اس بلند ترین سطح پر پہونچ گیا کہ بقول علامہ ارشد القادری:

''سارے ہندوستان میں جہاں سے چاہو مبارک پور کو دیکھ سکتے ہو''

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مولوی شکر اللہ صاحب جواب تک بلاشرکت غیر مباک پور کے علمی سر خیل بنے ہوے تھے مبارک پور میں ہونے والی ان خوش گوار تبدیلیوں کو برداشت نہ کر سکے اور چیلنج دینا شروع کیا۔

حضور حافظ ملت (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) فرماتے ہیں:

میں ذی قعدہ ۵۲ھ میں مبارک پور آیا، میری تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا، اور محرم کی دس تاریخ آئی، عاشورا کو دن میں تقریباً ۸ رسے ۱۰ ربجے تک جامع مسجد راجہ مباک شاہ

میں ذکر شہادت کی مجلس میں میرا بیان ہوا۔ جو انتہائی موثر، رقت انگیز اور کامیاب ہوا۔ اسی کے تاثر میں مجمع میں سے خاصی تعداد میرے ساتھ پرانے مدرسہ آئی، اور باتوں باتوں میں یہ تذکرہ چل نکلا کہ مولوی شکر اللہ صاحب کہتے پھرتے تھے کہ میں نے سنا ہے کہ یہاں کوئی مدرسہ اشرفیہ بھی ہے، اگر اس کا کوئی مدرس شرح جامی پڑھا دے تو میں اس کو پانچ روپیہ دوں۔ اس پر میں نے ان لوگوں سے کہا کہ آپ میری طرف سے ان سے کہہ دیں کہ "جو کتابیں یہاں اشرفیہ میں ہو رہی ہیں اگر کسی کتاب کا ایک سبق بھی وہاں کا کوئی مدرس ہمارے طالب علموں کا پڑھا دے تو میں اسی پانچ پر دو صفر کا اضافہ کر کے انھیں پانچ سو (۵۰۰) روپے انعام دوں گا"۔ لیکن میرے اس پیغام کا ادھر سے کوئی جواب نہیں ملا۔

میرے جلسے برابر ہوتے رہے، اور قبول عام بڑھتا رہا، یہاں تک کہ اس وقت اس جماعت کے ایک نہایت اہم رکن اور قصبہ کے موثر مالدار جناب حاجی محمد عمر صاحب (پورہ صوفی) نے متاثر ہو کر میرے وعظ کا اپنے یہاں انتظام کیا اور جلسہ بے حد کامیاب رہا۔ یہ چیز مولوی شکر اللہ صاحب اور ان کی جماعت کے لیے برداشت سے باہر ہوگئی کہ اگر اسی طرح ایک ایک فرد ٹوٹ ٹوٹ کر ادھر جاتا رہا تو ایک دن ہم مبارک پور میں تنہا رہ جائیں گے، اس لیے ان لوگوں نے جوابی جلسہ کیا اور میری تردید کی۔

عوام اہل سنت میرے پاس آئے کہ اس کا جواب ہونا چاہیے، میں نے کہا ہم یہاں کام کرنے آئے ہیں اور الجھنے میں کام کا حرج ہوگا، آپ لوگ مجھے چپ چاپ کام کرنے دیجیے وہ خود ہی کہہ سن کر خاموش ہو جائیں گے، لیکن عوام کا شدید اصرار ہوا کہ جواب میں تردیدی تقریر ہونی ہی چاہیے، چناں چہ ادھر سے جلسہ ہوا جس میں ان کے تمام اعتراضات کے جواب دیے گئے اور چند ایسے مواخذے بھی کیے گئے کہ وہ مجبور ہو کر جواب دیں پھر کیا تھا، مناظرانہ جلسوں کا ایک دور چل پڑا، اور مسلسل چار ماہ تک یہ عالم رہا کہ ایک دن اہل سنت و جماعت کی طرف سے مبارک پور کے کسی محلے میں مجلس ترتیب دی جاتی، لوگ جمع ہوتے، تخت بچھتا، نظم خوانی ہوتی، تکبیر، رسالت، اور غوثیت کے نعرے لگتے اور فضا

دہلنے لگتی۔

دیوبندی مکتب فکر کی طرف سے کیے گئے اعتراضات کے جواب دیے جاتے پھر ان پر مواخذہ ہوتا، مزید برآں ان کے مذہب کے خفیہ گوشوں کی نقاب کشائی ہوتی۔

دوسرے روز اسی مقام کے آس پاس ہی دیوبندی حضرات بھی اپنی بزم سجاتے اور جیسا کچھ ہو پاتا سنی مواخذوں کا جواب دیتے۔ اور سچ پوچھیے تو اپنے ہی دین و دیانت کو جواب دیتے، اعتراضات کرتے اور مذہب حق اہل سنت و جماعت پر خود ساختہ الزامات عائد کرتے، اپنی دانست میں تو سنیوں کو رسوا کرتے لیکن فی الحقیقت خود ہی ننگے ہوتے اور اس کام کے لیے دیوبندی علما کی ایک پوری ٹیم رات دن جٹی رہتی۔ ادھر حافظ ملت کا یہ عالم تھا کہ یکہ وتنہا پورے مدرسہ کے طالب علموں کو روزانہ تیرہ تیرہ سبق پڑھاتے جس میں سب سے نیچی کتاب شرح جامی تھی، اور دیوبندی حضرات کی تقریروں کی رپورٹ دیکھ کر ان کے تمام اعتراضات کے جواب تیار کرتے، پھر مواخذہ مرتب فرماتے، اونچے درجہ کے طلبہ کو دیتے کہ اس کو تم کہنا، اس کو تم بیان کرنا، اور خاص خاص مسائل اپنے لیے منتخب کرتے۔ پھر جلسے میں رات کے ایک ایک بجے تک تقریریں کرتے۔ الغرض اکیلے ہی پوری مشینری کو رواں دواں رکھے ہوئے تھے۔

اونچے درجے کے ان طلبہ میں جو ان جوابی جلسوں میں اہل سنت و جماعت کی بہتر ترجمانی کرتے مولانا شاہ سراج الہدیٰ صاحب کا نام کافی اہمیت رکھتا ہے، موصوف اب تو بھاری بھرکم پیر ہیں تب نہایت دبلے پتلے، ایک ذہین اور قادر الکلام مقرر تھے، میرے والد جو انھیں ایام میں ان کی تقریروں سے بے حد متاثر تھے بعد میں بھی اکثر ان کی خوش بیانی کی تعریفیں کرتے تھے۔

حضور حافظ ملت (قدس سرہ العزیز) کے مذکورہ بالا کام کی کثرت کو دیکھتے ہوئے مبارک پور کے سنیوں نے آپ سے درخواست بھی کی کہ حضور مدد کے لیے کچھ علما کو بلا لیا جائے، آپ نے منع فرمایا، تم بے خوف رہو باطل کی تمام طاغوتی طاقتوں کے لیے غالب

پروردگار کا اکیلا بندہ (عبد العزیز) ہی کافی ہے جیسے آپ کا کوئی حوصلہ بڑھانے کے لیے یہ آیت پڑھ رہا ہو۔

﴿يَا مُوسَى أَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ إِنَّكَ مِنَ الْآمِنِينَ﴾[القصص: ۳۱]

مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ لاتخف

جیسے انھیں سنا دیا گیا ہو:

﴿جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾[بنی اسرائیل: ۸۱]

حق کی آواز باطل کے غوغا سے دب نہیں سکتی اور سچائی کا نور گمرہی کی تاریکیوں سے خوف نہیں کھا سکتا۔

صدائے حق کسی صورت سے دب نہیں سکتی ۔۔۔ نہ دب سکیں گے خدائی پکار ہیں ہم لوگ

اور واقعی چار مہینے کے بعد باطل کی ظلمت کافور تھی، حق کا نور مسکرا رہا تھا، اور اہل سنت و جماعت کے گھر گھر کی چاندنی اور کوچہ و بازار کا اجالا تھا۔

اہل سنت و جماعت کا آخری جلسہ محلہ پورہ رانی میں ہوا جس میں ہزار ہا انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر لہریں لے رہا تھا۔ جب حضور حافظ ملت کی تقریر ختم ہوئی تو اس وقت مبارک پور کے تھانہ انچارج داروغہ فہیم احمد صاحب پورے جوش اور جذبہ میں کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے۔

مولانا! اس پورے دوران میں، میں دونوں طرف کے جلسوں میں شریک ہوتا رہا، مجھے اپنے عہدہ کے لحاظ سے یہ کہنا نہیں چاہیے لیکن میں حق کی شہادت سے مجبور ہوں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی خوف نہیں کہ حق آپ کے ساتھ ہے اور میں آپ کی فتح کا اعلان کر رہا ہوں۔

لیکن حقیقی اعلان فتح تو یہ تھا کہ دوسرے دن پر شوق نگاہوں اور مضطرب آرزوؤں نے ہزار تلاش کیا کہ مخالف کیمپ سے بھی حسب دستور اعلان ہو، جلسہ ترتیب دیا جائے، اور

مولوی شکر اللہ صاحب اپنی قدیم گھن گرج کے ساتھ سر پر آرائے خطابت ہوں لیکن دیدہ شوق اور دلِ آرزو مند کو مایوس ہو کر یہ کہتے ہوئے واپس لوٹنا ہی پڑا۔ ع

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دوکان اپنی بڑھا گئے

اور چار ماہ کے اس ہنگامہ پرور دور میں عوام اہل سنت کی وہ بھیڑ جو اس سے قبل مایوسیوں کے اندھیرے میں نا امیدی کے دن کاٹ رہی تھی، بے حسی کی موت نے جس کی آنکھیں پتھرا دی تھیں ایک مسیحا نفس کے دم حیات بخش کے اثر سے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ انگڑائی لے کر کھڑی ہوگئی اور بغیر کسی سابقہ ٹریننگ اور تربیت کے رضا کارانہ طور پر ہر شخص نے وہی کام اپنے ذمہ لے لیا۔

جس کی صلاحیت وہ قدرتی طور پر رکھتا تھا مثلاً مناظرانہ جلسوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ مخالف تقریروں کی مکمل رپورٹ دست یاب ہو اور مبارک پور جیسے معمولی قصبے میں شارٹ ہینڈ رائٹروں کا وجود نہ تھا لیکن مرحوم محمد محمود صاحب عرائض نویس اور ان کے مددگار زکریا صاحب نے از خود یہ زحمت دور کر دی اور مسلسل چار ماہ تک مولوی شکر اللہ صاحب اور ان کے مددگار مقرروں کی مکمل تقریریں نوٹ کر کے صبح ہی صبح حضور حافظ ملت (نور اللہ مرقدہ) کی خدمت میں حاضر کر دیتے، کسی کسی روز تو فل اسکیپ سائز کے بارہ بارہ ورق انھوں نے لا کر دیے، اور اس ڈیوٹی میں ایک دن بھی کوتاہی نہیں کی۔

ہمارے مبارک پور کی ایک تاریخی شخصیت غریب اللہ سبزی فروش مرحوم کی ہے جو ایک بے پڑھے لکھے بذلہ سنج اور نہایت حاضر جواب شخص تھے۔ ان کا ایک لطیفہ تو بے حد غیر معمولی ہے: ایک دفعہ ایک شخص نے ان پر کسی معاملہ میں دعویٰ کیا، مخالف وکیل سے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ یہ شخص نہایت شورہ پشت اور بد معاش قسم کا ہے۔ بحث کرتے ہوئے حاکم کو مخاطب کر کے کہا: حضور یہ اتنا نالائق اور ظالم ہے کہ اپنے ماں باپ کا بھی نہ ہوا، تو انھیں بھوکوں مرنے کے لیے گھر سے باہر نکال دیا اور اپنے آپ علاحدہ کر دیا۔ منصف نے پوچھا کیا تم نے واقعی ایسا کیا، تو غریب اللہ بولے، ہاں صاحب، اس نے حیرت سے

کہا اپنے ماں باپ کو علاحدہ کر دیا، اور تمہیں ان کے بڑھاپے پر ذرا ترس نہیں آیا، آپ کا جواب پھر یہی تھا ہاں صاحب! حاکم نے ڈانٹا بد بخت اس پر زیادتی بھی کرتا ہے۔ اور پھر بھی ڈھٹائی سے کہتا ہے ہاں صاحب۔ اب آپ نہایت اطمینان سے بولے صاحب ان کو علاحدہ نہ کرتا تو کیا کرتا۔ حاکم نے پوچھا کیا مطلب! آپ فرماتے ہیں: بات دراصل یہ ہے کہ وہ لوگ انتقال کر گئے تو میں ان کو اپنے ساتھ کیسے رکھتا۔ یہ غریب اللہ مرحوم نہایت تنومند اور نہایت بلند آواز تھے۔ آپ نے اس دور میں سنیوں کے تمام نعرہ لگانے کی ڈیوٹی از خود اپنے سر لے لی تھی، میں اس وقت بہت چھوٹا تھا، سب جلسوں میں شریک نہیں ہوتا تھا۔ لیکن مجھے یہ بات اچھی طرح یاد ہے جیسے کل ہی کی ہو، جلسے کے اختتام پر بارہ ایک بجے جب یہ نعرہ تکبیر و رسالت بلند کرتے تو ان کی گرج دار آواز خاموشیوں کا سینہ چیرتی ہوئی مبارک پور کے بیشتر حصہ میں سنی جاتی۔ اور اس کے جواب میں جب پورے مجمع والے اللہ اکبر اور یا رسول اللہ کی پر جلال آواز بلند کرتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ زمین ہل رہی ہے، اور در و دیوار بول رہے ہیں اور لوگ اپنے اپنے گھروں ہی سے یہ معلوم کر لیتے کہ جلسہ اب اختتام کو پہونچا۔ آج یہ ایک چھوٹی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اس وقت یہ عام خیال تھا کہ رزم گاہ حق و باطل میں غریب اللہ ایک اہم سپاہی ہیں، اور گویا وہ باطل کو نعروں کے محاذ پر شکست فاش دے رہے ہیں۔

صدر محمد امین صاحب گرہست پوری قوم کے آں ریری سربراہ۔ آپ نے ہی ان جلسوں میں انتظامی دیکھ ریکھ کی اور ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی، اور سنی اسٹیج سے ایک پر ہیبت للکار کا کردار ادا کرتے جس وقت کھڑے ہو کر یہ شعر پڑھتے:

یا رب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے

جو روح کو تڑپا دے جو قلب کو گرما دے

رگوں میں بجلیاں دوڑتی معلوم ہوتیں، اور دل کی دھڑکن بڑھ جاتی، اس کے بعد آپ کی لن ترانیاں شروع ہو جاتی مثلاً تم نے ہمیں چھیڑ کر ایک سوئے ہوئے شیر کو بیدار

کر دیا ہے۔ تم حق و باطل کے جس موڑ پر آؤ ہمیں موجود پاؤ گے، یا میں نے مولوی شکراللہ صاحب کو فلاں موقع پر یوں للکارا وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ یا فلاں موقع پر وہ یہ چال چلے اور میں نے ان کی ترکیب چوپٹ کر دی، تو معلوم ہوتا تھا کہ سچ مچ کوئی سورما میدان جنگ میں کھڑا للکار رہا ہے۔

انا الذی سمتنی امی حیدرا

کلیث غابات کریہ

یا فردوسی کے الفاظ میں:

اگر جز بکام من آید جواب ☆ من و گرز و میدان افراسیاب

اور صرف انھیں کی ان شعلہ نوائیوں اور دراز نفسیوں کو سننے کے لیے مخالف و موافق کی ایک خاص تعداد جمع ہو جاتی۔

منشی محمد زماں صاحب مرحوم ایک خاموش طبیعت اور گوشہ پسند آدمی تھے لیکن اس ہنگامہ دار و گیر میں وہ بھی اپنے گوشہ عافیت سے باہر آ گئے اور مجاہدان برق انداز کی جماعت میں شریک ہو گئے اور بالالتزام روزانہ ایک نئی نظم تیار کر کے مولوی محمد عباس کنکی کو دیتے اور وہ اسے مہک لہک کر مجمع میں سناتے جس کے چند اشعار اوپر نمونۃً درج ہوے۔ گویا منشی زماں نہیں تھے:

کلک رضا ہے خنجر خوں خوار برق بار

اعدا سے کہہ دو خیر منائیں نہ شر کریں

مختصر یہ کہ اس وقت سارا کام مشینی انداز میں خود بخود ہو رہا تھا، اور سبھی لوگ رضا کارانہ طور پر اپنی اپنی ڈیوٹی سنبھالتے اور پوری قوم ایک آواز پر تیار رہتی تھی، حد ہو گئی کہ جانبین کے جلسوں کے منادی کرنے والے محمد بشیر اہل سنت و ہدایت اللہ دیوبندی بھی اس میدان رستاخیز کے اہم کردار اور جانبین کے پر جوش مجاہد تھے، اور لوگ باہم ان دونوں کی برتری پر بھی بحث کرتے۔ مولوی شکراللہ صاحب بے حد پر جوش آدمی تھے اور بولتے وقت

از خود رفتہ بھی ہو جاتے تھے، اس لیے بعض دفعہ وہ ایسے کام بھی کر گزرتے جس سے خاص دل چسپی پیدا ہو جاتی۔ ایک دفعہ انھیں مناظرانہ جلسوں میں تقریر کے دوران ہی ان پر پیاس کا غلبہ ہوا اور غالباً بے خیالی میں ہی کھڑے کھڑے بائیں ہاتھ سے پانی پی لیا۔ ہماری جماعت کے ایک سرگرم اور جری رکن جناب حاجی محمد یوسف صاحب مرحوم نے برجستہ کھڑے ہو کر کہا: مولانا ہم نے تو سنا تھا کہ حضور ﷺ نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے، اور بائیں ہاتھ سے پانی پینا سنت کے خلاف ہے آپ نے عالم ہو کر برسر اجلاس یہ حرکت کی۔ مولانا نے کچھ تاویل کی لیکن مثل مشہور ہے عذر گناہ بدتر از گناہ۔ وہاں تو انھیں خاموش ہونا ہی پڑا، دوسرے دن جلسۂ اہل سنت میں بھی اس حرکت پر خوب لے دے رہی، اور اسی کے نتیجے میں جناب حاجی محمد یوسف صاحب مرحوم پورے قصبے میں مناظر مشہور ہو گئے کہ اس دو حرفی مناظرے میں وہ اپنے حریف پر غالب آ گئے جب کہ ایک طرف غالبانہ تمکنت تھی اور دوسری طرف ایک عام مسلمان کی بروقت محاسبہ آرائی۔

ایک مرتبہ پورے جوش میں انھوں نے غالباً ایک اجتہاد کر ڈالا:

حدیث شریف میں ہے:

من احي سنتي عند فساد امتي فله اجر مائة شهيد.

جس نے میری امت کے فساد کے وقت میری کسی سنت کو زندہ کیا اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔

آپ نے خیال فرمایا ہوگا کہ حضور کی ایک سنت یہ بھی ہے کہ آپ نے مشرکین کی اونچی قبریں کھدوا پھینکیں اور یہ تعزیہ کے چوک امامین کریمین کی گویا قبریں ہیں۔ اس لیے ان کے ڈھانے والوں کو بھی حدیث مذکورہ بالا کے حکم کے موافق سو شہیدوں کا ثواب ملنا چاہیے۔ آپ نے اعلان فرمایا ''جس نے ایک چوک کھودا اسے سو شہیدوں کا ثواب ملے گا'' پھر کیا تھا دیوبندی عوام تو پورے جوش کے ساتھ اٹھے اور راتوں رات چھپ چھپا کر مبارک پور کے کئی چوک کھود ڈالے، اب صبح کو نہ پوچھیے ہنگامہ دار و گیر اور حکام و کچہری کی

بھیڑ، اس قسم کا ایک حکم جو خاص احباب کی مجلسوں میں دیتے یہ تھا کہ ان بدعتیوں کو (سنیوں کو) زک پہونچانے کے لیے ہم کو جائز وناجائز اور حلال وحرام دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے، جس طرح بھی ہوں کو زک پہنچاؤ شاید اس حکم کے پیچھے ان کی یہ (عالمانہ) بصیرت کام کر رہی ہو کہ یہود اہل کتاب مشرکین عرب کے لیے کہتے۔ لیس لنا فی الامیین سبیل جسے قرآن نے نقل کیا ہے۔ تو وہ مشرکین عرب تھے اور یہ بدعتی بھی انھیں کی طرح مشرک ہیں اس لیے ان کا جان مال بھی مباح، معاذاللہ.

اول الذکر تو دو واقعے زبان زد خاص وعام ہیں لیکن موخر الذکر واقعہ میں نے ایک آدمی سے سنا تھا جو اس وقت انتقال کر چکا ہے۔

مقابلانہ جلسوں کے اختتام کے بعد مبارک پور میں اہل سنت وجماعت اور دیوبندی مکتب مدرسہ کا یہ علمی مقابلہ ایک حد تک ختم ہو گیا تھا اور وہاں ایک قسم کا سکون ہو گیا تھا جیسا کہ الکشن کے چوبیس گھنٹہ پہلے سکون ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ سکون طوفان سے پہلے والے سکون کی طرح تھا، کیوں کہ طرفین کے دلوں میں امتاز ہر بھر گیا تھا کہ پڑوسی گھر کے بڑوں میں ہی نہیں بلکہ بچوں میں بھی طرز تخاطب کا ایک انداز تھا۔ کہ ادھر سے سنی گھر کے بچوں کو پچھوا کہا جاتا۔ کچھوچھوی نسبت کے لحاظ سے اور ادھر سے ''دیوا'' دیوبندی کے لحاظ سے۔

فریقین ایک دوسرے کے ساتھ شادی بیاہ اور رشتے ناتے میں احتیاط برتتے۔ قربانی میں اپنے عقیدے کے لوگ دیکھے جاتے۔ اور ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے نہیں آتے، رات میں محفل شبانہ کا یہی موضوع اور دن میں دو لوگ جمع ہوں یہی تذکرے، جس کا اثر کاروباری جگہ بھی یہی تفریق پیدا کر رہا تھا۔

عقائد کی مذکورہ بالا روداد سے صاف ظاہر ہے کہ یہ قضیہ یہاں جس طرح شروع ہوا۔ بڑھا، پھیلا، اور طاقتور بنا اور اس نے فریقین کو جس سطح پر لا کر کھڑا کیا۔ اس کے بعد مار دھاڑ قتل وخون ریزی کا آخری اسٹیج ہی باقی رہ گیا تھا۔ جو کسی وقت بھی شروع ہو سکتا تھا،

کیوں کہ دیوبندی حضرات میں اگر ایک نئے مذہب کا جوش وخروش اور نومولود ایمان کی حرارت بدرجہ اتم موجود تھی تو اہل سنت وجماعت میں بھی جذبات صادقہ کے انگارے مدت سے جمی ہوئی کس مپرسی اور پژمردگی کی راکھ جھاڑ کر شعلے بن چکے تھے۔اور پوری قوم ایک جوش اور ولولے میں سرشار ہو چکی تھی۔پس اس عالم میں اختلاف کی چنگاریوں کو جہنم اور بگولوں کو طوفان بنتے کیا دیر لگتی؟

لیکن میں اسے کچھ تائید غیبی ہی کہوں گا، کہ

حضور حافظ ملت اور ان کے رفقا نے اس وقت اپنی خداداد بصیرت سے کام لے کر تخریب کی آندھیوں سے تعمیر کی بہار کا کام لیا۔اور بھرے ہوئے جذبات کا رخ ایک مفید آبادکاری کی طرف موڑ دیا، جس کے نتیجے میں آمادہ پیکار قوموں کے سر سے ایک ناگزیر خوں ریزی تھوڑے دنوں کے لیے ٹل گئی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ محرم ۵۲ھ کی دس تاریخ کے فوراً بعد ہی سے مذکورہ بالا مناظرانہ جلسوں کا سلسلہ شروع ہوا جو باتفاق روایات چار ماہ تک جاری رہا، اس لیے اس کا اختتام ربیع الآخر کی کسی تاریخ کو ہوا۔اور اندازہ ایسا ہوتا ہے کہ فوراً ہی ارباب حل وعقد نے اشرفیہ کی تعمیر جدید کا منصوبہ قوم کے سامنے رکھا، طے کیا جامع مسجد میں جمعہ کے دن اعلان کیا اور فوراً چندہ شروع ہو گیا، یوں چندہ ساری دنیا میں ہوتا ہے، اور سب قومیں کرتی ہیں اور اس کے لیے طرح طرح کے طریقے بھی ایجاد کرتی ہیں۔لیکن مبارک پور میں مذہبی امور کے لیے چندہ تاریخ رکھتا ہے جس کے موجد بھی خود مبارک پور والے ہیں۔ اور جس پر مباک پور کے باہر کے ہی لوگ نہیں بلکہ خود مبارک پور والے بھی غور کرتے ہیں تو حیرت زدہ ہوتے ہیں۔

(میاں جی غلام حسین صاحب جو ایک ذاکر وشاغل اور پابند اوراد وعملیات بزرگ ہیں۔اور حضرت اشرفی میاں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مرید اور غالباً خلیفہ مجاز بھی ہیں، اور ان ابتدائی دنوں میں اشرفیہ کے بہت سرگرم کارکن رہے ایک دفعہ کہنے لگے جب یہ خیال ہوا

کہ مدرسہ کو ترقی کے لیے اور بجائے پرانی بستی قصبہ کے تقریباً درمیانی حصہ میں اس کی تعمیر کی جائے۔ تو نگاہ انتخاب اس احاطہ پر پڑی جو گولہ بازار میں تھا اور حسن اتفاق سے امین صاحب صدر مدرسہ اور ان کے شرکا کی ملکیت تھا جس کے ایک شریک حاجی عبدالرحمٰن صاحب رئیس گھیبڑا بھی تھے، امین صاحب نے کہا اس معاملہ میں چل کر ان سے بھی سمجھ لیا جائے کہ وہ بھی ایک شریک ہیں چناں چہ ہم تین چار آدمی وہاں گئے اور اپنی رائے ان کے سامنے رکھی کہ ہم لوگوں کا یہ خیال ہے، بولے آپ لوگ کیسا مدرسہ بنانا چاہتے ہو۔ میں نے کہا اس کی عمارت ایسی ہو کہ یہاں دو میل دور سے بھی آپ سر اٹھا کر دیکھنا چاہیں تو دیکھ لیں۔ بولے اس کے لیے روپیہ کتنا جمع کرو گے میں نے کہا کہ خیال ایسا ہے کہ ۱۲ ر ہزار روپیے جمع کیے جائیں۔ کہنے لگے تمہاری جماعت کا حال مجھ کو معلوم ہے۔ سب مفلس و نادار ہیں اور چندہ تو ہم لوگ بھی کرتے رہتے ہیں۔ پاگل ہوئے ہو؟ ایسا ناممکن ہے، ہم لوگوں نے زیادہ اصرار کیا کہ آپ زمین کے لیے ہاں کر دیں پھر ہم لوگ چندہ شروع کر دیں، اس پر وہ بولے پہلے تم لوگ چندہ کر لو پھر میرے پاس آؤ۔

الغرض ہم لوگوں نے آکر چندہ شروع کیا۔ ہفتہ دو ہفتہ کے بعد پھر جمع ہو کر گئے، تو پھر میں نے ہی کہا: حاجی صاحب آپ تو یہاں بیٹھے ہی بیٹھے ہم لوگ جو گھر میں کھاتے ہیں وہ بھی جانتے ہیں۔ چندہ کی خبر بھی تو آپ کو ملی ہوگی، اس کے بارے میں اب کیا خیال ہے، کہنے لگے: میں نے تو چندہ کے لیے کہا تھا تم لوگ چندہ کب مانگتے ہو، تم لوگ تو جادو کرتے ہو، بس لوگ پاگل ہو کر سارا گھر دے دیتے ہیں۔

یہاں چندہ کے سلسلہ میں فریقین کو تیاری کرنی پڑی اور چندہ لینے والوں کا اہتمام چندہ دینے والوں سے کم نہیں، ہفتوں پہلے ہی چندہ کی نظمیں تیار ہو رہی ہیں۔ نظم پڑھنے والوں کا حال پیش کر رہی ہیں، جھنڈے جھنڈیاں بنائی جا رہی ہیں۔ روشنی کے اہتمام میں گیس کی مرمت ہو رہی ہے، اور چندے کا اعلان و پرچار پورے جوش کے ساتھ جاری ہے۔

ادھر چندہ دینے والوں کے ہجوم شوق اور وفور جذبات کا تلاطم کئی روز پہلے ہی سے پورے شباب پر ہے، اپنی حیثیت وسامان کی تعداد کا اندازہ لگا کر چندے کی مقدار پورے گھر والے رائے ومشورہ سے متعین کررہے ہیں، مگر چندہ دیتے وقت دیکھیے گا یہ تعین وتجویز کچھ کام نہ دے گی۔ وارفتگی شوق تمام حدیں توڑ ڈالے گی اور دینے والوں کا ہاتھ ہر قدم پر آگے ہی بڑھتا جائے گا۔

یہاں ہر گام گام اولین ہے
جنوں کی کوئی منزل ہی نہیں ہے

گھر کے بڑے بوڑھوں سے الگ لڑکے تیاریاں کررہے ہیں، کوئی اپنی گھڑی دینے کی تیاری ظاہر کرتا ہے۔ کوئی فونٹن پن اور لائٹر نذر کرے گا، کسی نے کچھ اور چھوٹا موٹا سامان رکھ چھوڑا ہے، لڑکیاں الگ اپنے اسباب بنا سنوار رہی ہیں، کوئی رومال پر کشیدہ کاری کر رہی ہے، کوئی کپڑے کی حسین پنکھی بنا رہی ہے، کسی نے تکیہ کے غلاف تیار کررکھے ہیں، عورتیں اپنے زیوروں پر للچائی نگاہ ڈال رہی ہیں اور اپنے شوہروں سے پر امید لہجے میں کہہ رہی ہیں، یہ ہار تو میری ماں کا ہے، میں نے سوچا ہے اسی کو مدرسہ پر دے دوں، آپ کہیں تو پازیب بھی دے دوں۔

سرمایہ دار بینکوں سے رقم نکلوا رہے ہیں، مزدور گرہستوں سے مچل رہے ہیں، مجھے چندہ دینا ہے اتنے روپے کا انتظام ضرور کردیں، بڑے نوٹوں کے ساتھ چھوٹے نوٹ بھی فراہم کیے جارہے ہیں، کچھ چھوٹے چھوٹے بچوں کے ذریعہ دلوائے جائیں گے۔ الغرض پورے مبارک پور کا عالم ہی کچھ اور ہے یہاں چندہ آزردگیوں کی ناگوار پرچھائیاں ساتھ لے کر نہیں آتا ہے۔ مسرت وشادمانی کا نور ہر چہرے سے پھوٹا پڑتا ہے، اور ایمان وعقیدت کی روح جھوم رہی ہوتی ہے۔

مولانا ارشد القادری کے سحر نگار قلم نے مبارک پور کے انوکھے مسلمانوں کے اس دل آویز منظر کی اچھی تصویر کشی کی ہے، وہ اپنی تصنیف تاریخی مرقع میں رقم طراز ہیں:

پورے قصبہ کی ایک مجلس شوریٰ منعقد ہوئی، طے ہو جانے کے بعد جمعہ کے دن بھری مجلس میں اعلان کر دیا گیا کہ آج فلاں محلہ سے چندہ شروع کیا جائے گا، آنا فانا یہ خبر بجلی کی طرح سارے قصبہ میں پھیل گئی۔ اس خبر کا نشر ہونا تھا کہ ہر طرف زندگی کے آثار نظر آنے لگے، لوگ اس طرح مسرور ہو رہے ہیں جیسے انھیں تسکین حیات کی ایک غم ربا مصروفیت ہاتھ آ گئی، محلہ میں جس کے گھر چندہ ہونے والا ہے وہاں خوشی کا عالم کچھ نہ پوچھیے، ہر طرف گھر میں صفائی ہو رہی ہے، دروازوں پر چھڑکاؤ کیا جا رہا ہے، گھر کے بچے رنگا رنگ کپڑوں میں ملبوس نظر آ رہے ہیں، قریبی رشتہ دار شادیوں کی طرح نوید بھیج کر بلائے جا رہے ہیں، غرض اندر سے لے کر باہر تک ایک عجیب چہل پہل ہے، جیسے معلوم ہوتا ہے کہ شب میں یہاں کسی تقریب عیش کی محفل اب منعقد ہونے والی ہے۔

عام دلچسپیوں کا حال یہ ہے کہ سر شام ہی لوگ اپنی ضروریات سے فارغ ہو کر ایک جگہ ہو گئے، اب یہاں سے چھوٹے بڑے جھنڈوں اور جھنڈیوں کے ساتھ ایک شان دار جلوس میں یہ مجمع اس محلہ کی طرف روانہ ہوا، جس راستے سے یہ گزرے ایک جم غفیر ساتھ ہوتا گیا، یہاں تک کہ ہزاروں کی تعداد میں یہ جلوس ایک دروازے پر پہونچ کر رک گیا، گردن اٹھا کر ذرا اس مجمع پر نظر ڈالیے! دیکھیے اس میں قصبہ کے متمول حضرات بھی ہیں جو ہاتھوں میں جھولیا لیے کھڑے ہیں، یہ دن کے مسند نشین تاجر ہیں جو رات کے وقت درویشوں کے بھیس میں نظر آ رہے ہیں، ایک طرف وارثین انبیا کی مقدس قطاریں ہیں جن کے وقار علم و عمل سے مجمع میں ایک عجیب شوکت نظر آ رہی ہے۔ دوسری طرف طلبائے اسلام کا جواں سال طبقہ ہے جو نظم وضبط میں مصروف ہے۔

آگے آگے ایک مخصوص گروہ خوشنوا نعت خوانی کا ہے، جن کے ہاتھوں میں مجمع کا دل ہے، اس اجتماع میں آج انھیں بڑی اہمیت حاصل ہے، کہا جاتا ہے یہ اپنے ترانوں سے پتھر کے جگر میں بھی شگاف ڈال دیا کرتے ہیں۔

قصہ کوتاہ طرفین کی اس تیاری کے بعد حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ شیخ الحدیث

دارالعلوم کی سربراہی میں مدرسہ کے طالب علموں اور قصبہ کے عوام وخواص کا یہ قافلہ شوق جو کبھی سودوسو کبھی ہزار ہزار ہوتا ہے جھنڈیاں لیے جھولیاں سنبھالے اس شخص کے گھر پہونچتا ہے۔

وہ دیکھیے نظم خواں نے مصرع اٹھایا، ساتھیوں نے آواز ملائی اور مجمع سے سبحان اللہ اور الحمد للہ کی آوازیں بلند ہوئیں، اور دوسرے سننے والوں کے ساتھ ساتھ گھر والے کے چہرہ پر بھی رنگ آیا۔ اتنے میں نظم خواں نے کوئی پر جوش مصرعہ کوئی جذباتی شعر یا وجد آفریں بند پڑھا۔ پھر کیا تھا گھر والوں نے کیف میں ڈوب کر اپنا جیب وگریبان خالی کرنا شروع کیا۔

گھر کے اندر سے ننھے ننھے بچوں کی قطار، عیدی لباس میں آراستہ ہاتھوں میں نوٹ دبائے چلی آرہی ہے، چندہ جمع کرنے والوں نے اسے سمیٹا اور ہاتھ میں بلند کر کے نعرہ تکبیر لگایا اور پورے مجمع سے اسی خوشی کے ساتھ اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی، اس نے لفظ رسالت بلند کیا۔ تو مجمع نے یارسول اللہ کا نعرہ مارا۔ ابھی سکون بھی نہ ہوا تھا کہ پھر کوئی جذباتی موڑ آگیا اور بالا خانہ سے نوٹوں کا ہار لپکایا گیا۔ یہ عورتوں کی طرف سے ہیں، نالہ شوق کی پذیرائی تھی کسی نے اس ہار کو اچک لیا اور فوراً وصول کرنے والے تک پہونچا دیا گیا۔ اس نے پھر وہ ہار ہاتھوں پر اچھال کر نعرۂ تکبیر ورسالت بلند کیا اور سامعین کی پر شکوہ جوابی آواز آسمانوں سے نعرۂ تکبیر ورسالت ٹکرانے لگی۔

وہ دیکھیے پھر چندہ وصول کرنے والا کوئی چیز بلند کر رہا ہے، ارے یہ تو بنارسی ساڑی ہے، یہاں کا عام کاروبار یہی ہے، لیجیے حاضرین میں بحث اٹھ کھڑی ہوئی۔ سوروپے کی ہوگی۔ ۷۵ / روپے کی ہے، نہیں سوا سو کی، ابھی بحث ادھوری تھی کہ پھر سب نگاہیں دروازے کی طرف بلند ہوگئیں۔ خدا کی راہ میں گلا کٹانے کا محاورہ ہے، مگر اس وقت ضرورت گلا خالی کرنے کی ہے اور مبارک پور کی زندہ دل خواتین نے یہ ضرورت پوری کر دی ہے، گھر والے نے گلے کا ہار راہ حق میں اتار کر دے دیا ہے، اور دیکھیے ماں کی تقلید

میں بچی نے کان کے بالے بھی نذر کردیے، بوڑھی اماں نے ناک کی کھسی پٹی کیل راہ حق میں اتار دی ہے، چلیے اب وہ زیور سے بالکل فارغ البال ہوگئیں، ادھر مجمع ہے کہ لہریں لے رہا ہے، اچھل اچھل پڑ رہا ہے، جذبات کی شدت سے پورا ماحول گرم ہوگیا ہے، اچھا اچھا یہ بھاری بھرکم سی کیا چیز ہے جسے دو آدمیوں نے سر سے اوپر سنبھال رکھا ہے؟ دیکھا تو بچوں کے دودھ پینے کی بکری تھی جو مدرسہ پر قربان کردی، سبحان اللہ کیا حوصلہ ہے اور دریا دلی ہے، نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر۔ نعرۂ رسالت، یارسول اللہ! اتنے میں نظم ختم ہوگئی لوگوں نے گھر والوں کی حیثیت کا اندازہ لگا کر کہا: اب بس، مگر وہ تو کسی اور نشہ میں سرشار ہے، کہہ رہا ہے: ابھی کیسے اور پڑھو۔ اور پڑھو دوایک آدمیوں نے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہاں تو الٹا اثر ہے

ناصحامت کر نصیحت دل میرا گھبرائے ہے
اس کو دشمن جانتا ہوں جو مجھے سمجھائے ہے

خیر اس کے بے حد اصرار پر دوبارہ نظم خوانی شروع ہوئی۔ دیکھیے دنیا کا عجیب وغریب نظارہ، چھ مہینہ کا بچہ بنا سنوار کر اندر سے لایا، اور مانگنے والوں کے ہاتھ پر اچھال دیا کہ یہ بھی مدرسہ کے لیے۔ اللہ اللہ۔

پارہ لخت جگر سے کی تواضع عشق کی
سامنے مہمان کے جو کچھ تھا حاضر کردیا

اب پھر نوٹوں کی بارش شروع ہوئی اب کیا ہے؟ اب بچہ مدرسہ کو روپیہ دے کر خریدا جارہا ہے، چلیے طرفین قیمت پر راضی ہوگئے۔ اب بچہ پھر گھر میں واپس بھیج دیا گیا کہ پھر بالاخانہ سے نوٹوں کی بارش ہونے لگی، روپے خزاں رسیدہ پتوں کی طرح بکھر گئے، مگر لوٹنے والوں کی دیانت دیکھیے ایک ایک روپے سمیٹ کر وصول کرنے والے تک پہونچا دیا، اب پھر وصول کرنے والے نے گھر والے کی طرف دیکھا۔ گویا اب کیا ارادہ ہے؟ اس نے زبان سے تو کچھ نہ کہا لیکن نہایت بے کسی سے آنکھ سے اشارہ کردیا، یہ ایک خاموش معذرت ہے، "کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا" چندہ وصول کرنے والے نے ہاتھ کے

اشارے سے پڑھنے والوں کو روکا اس طرح اس گھر کا چندہ ختم ہوا۔
نظم خوانوں اور خواص اور کبھی کبھی پورے مجمع کی چائے اور شربت، پان سے تواضع ہو رہی تھی کہ مجمع سے شور بلند ہوا: صاحب جو پنکھی اس گھر سے ملی ہے، رومال دیا گیا ہے اس کو نیلام کیا جائے، چلیے یہ تماشہ بھی دیکھ لیں۔ کچھ بلندی پر کھڑے ہو کر ایک شخص نے کہا: سرکاری بولی پچیس روپے، مجمع کے ایک گوشہ سے آواز آئی۔ پانچ روپے، دوسرا بولا دس روپیے، تیسرا پندرہ، چوتھے نے کہا بیس۔ پھر پچیس، تیس، پینتالیس، اب ذرا آوازوں کا زور ٹوٹا، نیلام کرنے والے نے کہا: ایک، دو، پھر کوئی بول پڑا، ساٹھ، آخر ستر پر بولی ختم، کو خریدار نے پنکھی وصول کیے دام دیے اور بولا میں نے پنکھی مدرسے کو دے دی۔ اور پھر وہی مسابقت شروع ہوئی گویا۔

تماشا کر رہے ہیں مرنے والے عید قرباں میں

یہاں یہ سوچا جا سکتا ہے کہ شاید پہلے ہی سے لوگوں کو تیار کیا گیا ہو، اس طرح چندہ دیا جائے اور اس کی نمائش، لیکن یہ وہاں ہوتا ہے جہاں دوسروں کو تماشا دکھانا ہو، جو خود ہی اپنا تماشا آپ ہو وہ کسی سے کیا ٹریننگ لے گا۔

اتنی دیر میں لسٹ تیار ہو گئی، نقد ایک ہزار۔ ساڑی نقشی چار عدد۔ کان کے بالے طلائی ایک جوڑ، ہاتھ کا کنگن ایک جوڑ، بکری بچوں سمیت تین عدد، پنکھیاں پانچ عدد، غلاف تین، رومال آٹھ۔ پوری فہرست مجمع کو سنا دی گئی۔ حضور حافظ ملت نے مسرت کے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں اور فرط جذبات سے لرزتے ہاتھوں کے ساتھ اہل خانہ اور مبارک پور والوں کے لیے دعا مانگنی شروع کی۔ دل جذبات کی آگ میں گداختہ ہو ہی چکے تھے۔ سب نے پورے خلوص سے آمین کہی، نعرۂ تکبیر و رسالت بلند ہوا۔ زندہ باد کے نعرے لگے، اور یہ قافلہ دوسرے دروازے پر جمع ہو گیا۔ پھر تیسرے پھر پانچویں دروازے پر پہنچ گیا۔ یہ درمیان میں ایک گھر چھوڑ کیوں دیا گیا، کسی دوسرے فرقے کا ہے، نہیں ایک دکھیاری بیوی ہے جو دوسروں کے سہارے غربت کے دن کاٹ رہی ہے۔

ادھر وہ غریب جو بڑی دیر سے دروازہ کھولے ایک دیار رکھے اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔لوگوں کو آگے بڑھتا دیکھ کر لاٹھی ٹیکتی ہوئی باہر آئی اور ایک آدمی کو پکڑ کر بولی بھلا ہو! کیا مدرسہ مالداروں کا ہی ہے غریبوں کا نہیں، ماں غریب تو مالدار سے زیادہ حق دار ہیں۔تب میرے گھر چندہ مانگنے کیوں نہیں آئے، بڑھیا نے بہت تیز نشتر لگایا تھا، سننے والا تڑپ اٹھا اور دوڑا ہوا ذمہ داروں کے پاس گیا اور ماجرا بیان کیا، سارا مجمع اب اسی بیوہ کے گھر پلٹ پڑا۔ بڑھیا نے مرغی کے تین انڈے جمع کر رکھے تھے، پورے حوصلہ کے ساتھ نظم پڑھوائی اور وہی انڈے دے دیے، اللہ اللہ یہ بڑھیا تو بازار مصر کی بڑھیا سے زیادہ باحوصلہ نکلی کہ وہ بے چاری خریداری کی حسرت دل میں لے گئی اور اس نے خرید بھی لیا اور دام بھی چکا دیے۔

یہ چندہ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۲ھ کے کسی جمعہ سے شروع ہو کر دو مہینہ چلا اور اس حساب سے جمادی الآخرہ کی آخری تاریخوں میں مکمل ہوا۔خود ذمہ داران اشرفیہ نے اس پر تبصرہ شائع کیا۔اسے ہم یہاں نقل کرتے ہیں

مدرسہ کے تمام (تعلیمی) اخراجات کا بار برداشت کرتے ہوئے مدرسہ کے تعمیری چندہ میں جس جذبہ سے حصہ لیا ہے۔اس میں مسلمانان مبارک پور فی زمانہ اپنی آپ ہی نظیر ہیں۔غریب مسلمانوں نے اپنی ہر چیز کو مدرسہ پر اس ذوق سے قربان کیا کہ خود وصول کنندگان جب ان کو روکتے تھے تو وہ اپنے جذبے میں مچل کر رہ جاتے تھے۔اور دلی خواہش بھی ہوتی تھی کہ دنیا کی متاع قلیل جو کچھ ہے وہ رضائے الٰہی کے لیے مدرسہ پر قربان ہو جائے۔روپیہ، پیسہ، گائے، بھینس، مرغی، بکری، گھوڑا، برتن، کپڑا، زیور، ہر قسم کی چیز کو نثار کیا، وہ کونسی اپنی ضروریات کی چیز ہے جو مسلمانان مبارک پور نے اپنے مدرسہ پر قربان نہ کی ہو، ایثار وقناعت اسی کا نام ہے۔زیور عورتوں کو کس قدر مرغوب ومحبوب ہے۔ ہر چیز سے پیارا اور ہر چیز سے محبوب تر عورتوں کے لیے زیور ہے۔مگر واہ رے جذبۂ دینی، پہلی منزل کے تعمیری چندہ میں علاوہ طلائی زیور کے عورتوں نے تخمیناً ڈیڑھ من پختہ زیور مدرسہ پر نثار

کیا۔ (روداد دار العلوم ص ۲/ ۱۳۵۶ھ)

اشرفیہ کا ماضی وحال میں پہلے چندہ کی تعداد ڈھائی من چاندی ۲۲ر تولہ لکھا ہے جو اس تحریری دستاویز کے مقابلہ میں غلط ہے۔

چندہ ختم ہونے کے بعد صدر مدرسہ جناب محمد امین صاحب انصاری کے مکان کے وسیع صحن میں چندہ میں جمع ہونے والی چیزوں کا جو مینا بازار روزانہ ہفتوں لگتا رہا، اس کو میں نے بچشم خود دیکھا ہے بلکہ ایک زیور اس بازار سے تو خریدا بھی ہے۔ دیہاتی بازار میں بساط والوں کی دوکان کی جو حیثیت ہوتی ہے بالکل وہی کیفیت تھی، ایک بڑی سرخ رنگ کی چادر پر منوں زیور اور سامان بکھرا پڑا رہتا، لوگ اپنی اپنی پسند کا سامان گھر لے جاتے اور گھر والوں کو پسند کرا کے پھر اس کے دام چکاتے۔ دیانت داروں کی اس بھیڑ میں کچھ غلط قسم کے لوگ بھی تھے جنھوں نے سامان لے کر پیسہ ادا نہیں کیا۔ یا پسند کرانے کے نام پر کوئی چیز لے گئے اور واپس لا کر نہیں دیا۔

نقد وصولی کے سلسلے میں روداد ۵۶ھ میں ۸ر ہزار تو روپے کا عدد درج ہے، اور العذاب الشدید میں نقد آمدنی کی مقدار دس ہزار کے قریب تحریر ہے۔ (العذاب ص ۲۳) یہ تقریبی عدد بتایا گیا۔

آج سے لگ بھگ پچاس باون سال قبل کا ۸ر ہزار آج کے اس ہوشربا گرانی کے زمانہ میں آٹھ لاکھ کے برابر ہوگا، اس وقت قصبہ کے نادار مسلمانوں نے یہ فقید المثال قربانی پیش کی۔ واقعتاً غربائے اہل سنت نے مدرسہ کے لیے دل نکال کر رکھ دیا، چندہ دینے والوں میں کمیت کے لحاظ سے چاہے اور بھی کوئی آگے رہا ہو لیکن کیفیت کے لحاظ سے عالی مرتبت جناب سلامت اللہ عطار صاحب مرحوم سب سے آگے تھے، اور بالاتفاق تمام اہل قصبہ نے انھیں "مدرسہ کے مجنوں" کا خطاب دیا تھا۔ چندہ کے لیے بار بار مدرسہ کے ذمہ داروں کو بلایا، ہر بار چندہ دیا۔ چندہ دیتے وقت ان کی از خود رفتگی دیکھنے کے لائق ہوتی تھی۔ لوگوں کے روکنے اور منع کرنے پر وہ کہتے، دیتا میں ہوں تکلیف آپ لوگوں کو کیوں

ہوتی ہے؟

سکندر لوٹ کر بھی خوش نہیں دولت زمانے کی قلندر مایۂ ہستی لٹا کر رقص کرتا ہے

آپ ایک جنرل مرچنٹ تھے۔ ساتھ ہی ساتھ یونانی مفرد اور مرکب دوائیں بھی فروخت کرتے تھے۔ میرے اپنے خیال میں اس وقت پورے قصبہ میں حکیم خدا بخش مرحوم پورہ رانی واحد کامیاب ترین حکیم اور یہ تنہا کامیاب دوا فروش تھے۔ غفر اللہ لھما

اس وقت چندہ کی نظم پڑھنے والوں میں یہ نام یاد آرہے ہیں:

(۱) میاں جی غلام حسین مرحوم پورہ رانی۔ ان کا ذکر اس سے قبل ذمہ داروں کے سلسلہ میں آچکا ہے۔

(۲) منشی محمد یوسف مرحوم علی نگر۔ آپ نے مدت العمر موضع اساور (ایک مضافاتی دیہات) میں بچوں کو ابتدائی اردو اور قرآن شریف وغیرہ کی تعلیم دی۔ اور آپ مبارک پور میں اس وقت میلاد شریف پڑھنے والوں کے سرخیل تھے۔ نظم خوانی بھی کرتے تھے مگر خاص کمال روایت خوانی کا تھا۔ ایک خاص مترنم لے میں نہایت جوش وخروش سے اور خوش الحانی کے ساتھ روایتیں پڑھتے تھے۔

(۳) عبد الخالق محصل مرحوم پورہ رانی۔ یہ نہایت خوش آواز جہیر الصوت نظم خوانی میلادی تھے۔ نہایت تنومند بہادر اور بنوٹ باز تھے۔ مدت العمر دار العلوم سے منسلک رہے۔ بعد میں مدرسہ کی تحصیل وصولی کا کام کرتے تھے۔ ان کی بہادری کا کچھ ذکر آگے بھی آئے گا۔ یہ تینوں حضرات ایک ساتھ مل کر مصرع اٹھاتے اور دوسرے لوگ اسی کی تکرار کرتے۔

(۴) محمد صابر قوال مرحوم پورہ خضر۔ یہ میلاد شریف کی مجلس میں نعت خوانی بھی کرتے۔

(۵) محمد ابراہیم مرحوم میلاد خواں۔ پورہ خواجہ

(۶) محمد یوسف مرحوم میلاد خواں۔ پورہ خواجہ

اس وقت پورے قصبہ میں میلاد خوانوں کی یہ واحد قابل ذکر جماعت تھی اور اسی نے مسلسل دو مہینہ تک پوری جاں فشانی سے ۴ر بجے شام سے ۱۲ر بجے رات تک مسلسل نظم خوانی کر کے مدرسہ کے لیے چندہ فراہم کیا۔

آج یہ سبھی لوگ مرحوم ہو چکے ہیں لیکن حق وصداقت کی راہ میں اپنے خون جگر سے چراغ جلا گئے ہیں۔اور دارالعلوم کے ساتھ ساتھ یہ بھی حیات جاوید پا گئے ہیں۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق ثبت ست بر جریدہ عالم دوام ما

حدیث شریف میں ہے:

تمام مسلمان ایک جسم ہیں، اگر آنکھ میں درد ہو تو تمام بدن میں تکلیف ہوتی ہے، اگر سر میں درد ہو تو سارا جسم بے چین ہو جاتا ہے۔

چندہ کی نظم لکھنے والوں میں اس وقت دو قابل ذکر نام یاد آرہے ہیں:

(۱) میاں جی عبدالکریم اشرفی المتخلص بہ ''عاشق'' محلہ پورانی بستی۔ یہ ایک صوفی مشرب، بزرگوں کے صحبت یافتہ جہاں دیدہ منحنی قد کے دبلے پتلے بزرگ تھے، جب ان کی نظم پڑھی جاتی تو مجمع کے کسی گوشہ میں لاٹھی ٹیکے ہوے موجود رہتے اور اپنے پورے وجود سے اشعار میں ڈوب کر سنتے ،ان کے کان، ناک، آنکھ،اور منہ کے ساتھ ساتھ دیگر اعضائی حرکات وسکنات بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں، اگر آج وہ کسی مجمع میں ہوں تو لوگ انھیں کو دیکھ کر ہنسیں گے، لیکن اس وقت مجمع کا ہر ہر فرد اپنے ہی جذبات کی شدت اور وفور تاثیر میں اس طرح غرق ہوتا کہ کسی کو کسی دوسرے کی سدھ بدھ نہیں ہوتی تھی۔ سب کی آنکھیں چندہ دینے والے کے دروازے پر اور ان نظم خوانوں کی آواز پر ہوتیں، گویا:

فرصت کہاں کہ چھیڑیں آسماں سے ہم

لپٹے پڑے ہیں لذت درد نہاں سے ہم

(۲) منشی محمد زماں صاحب ''زماں'' مرحوم پورہ رانی۔ جیسا کہ اس سے قبل کہیں ان کے بارے میں لکھ چکا ہوں کہ یہ ایک گوشہ نشین خاموش طبع آدمی تھے۔اور بن کاری کے

شغل کے ساتھ مشق سخن کے آزار میں بھی مبتلا رہتے تھے۔ گویا ہندوستان کے مشہور صاحب طرز غزل گو شاعر حسرت موہانی کے اس شعر کی پوری تفسیر تھے:

ہے مشق سخن جاری چکی کی مصیبت بھی ایک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

شعرا کی تاثیری قوت اور اشعار کی انقلابی تاثیر کے بارے میں کتابوں میں پڑھتے آئے تھے، سبعہ معلقہ کے مشہور شاعر عمر بن کلثوم کے بارے میں تحریر ہے کہ اس کے اسی ایک قصیدہ نے جو سبعہ معلقہ میں درج ہے، پوری ایک صدی تک اس کی قوم کو سنبھالے رکھا، گرنے نہیں دیا۔ قوم کا بچہ بچہ انھیں اشعار کے نشہ میں اپنی ماں کی آغوش میں آنکھیں کھولتا اور اسی کی ترنگ میں پروان چڑھتا، اور جب بولنے کے قابل ہوتا تو اس کی ماں اسے سکھاتی:

اذابلغ الفطام لنا صبی تخرله الجبابر ساجدینا

ہمارا کوئی بچہ دودھ چھوڑنے کی عمر کو پہونچتا ہے تو بڑے بڑے سرکش سلطان اسے سجدہ کرتے ہیں۔

حضور سید عالم ﷺ نے شعرا صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

أهجوهم .فانه اشد علیهم من رشق النبل.

تمہاری ہجو کفار پر تیر کی دھار سے بھی زیادہ سخت ہے۔

ہمارے منشی زماں مرحوم ہندوستان کے اردو شاعروں میں نام آور نہ ہوں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی قومی اور ملی شاعری نے مبارک پور میں پوری سنی قوم کو مدتوں سرگرم اور سرمست رکھا۔ اور مبارک پور میں اس غیر معمولی دینی اور علمی جد و جہد میں جہاں اور عوام نے بہت کچھ کام کیا ہے، زماں مرحوم کی شعلہ نوائیوں نے بھی بڑا کام کیا ہے۔

مبارک پور کے ہی ایک کہنہ مشق اور صاحب دیوان شاعر حبیب مرحوم سے شرف تلمذ تھا، جس کا ذکر اکثر اپنے اشعار میں کرتے ہیں۔ مولا تعالیٰ مرحوم کی قبر پر اپنی رحمت و

غفران کی بارش کرے کہ مبارک پور میں دینی سرگرمی کی لو تیز کرنے میں مرحوم ﴿السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ﴾ کا درجہ رکھتے ہیں۔

پہلے چندہ میں منشی زماں مرحوم کی جو نظم سب سے زیادہ کامیاب "موثر" اور پر جوش ثابت ہوئی اس کے چند اشعار یاد رہ گئے ہیں:

سینوں میں ہے گل گلزار مصباح العلوم　　چشم اعدا میں کھٹکتا خار مصباح العلوم

بن کے جب تیار ہوگا تب مزا آجائے گا　　ہر مخالف دیکھ کر اس کی طرف تھرائے گا

ہمیں نہایت افسوس ہے کہ اب یہ ساری مذہبی اور قومی نظمیں مفقود ہیں۔ کوشش کے باوجود انھیں بتانے والا کوئی نہیں، اتفاق سے ان کا مطبوعہ دیوان بوسیدہ حالت میں ہمارے ہاتھ لگا جو غزلوں پر مشتمل ہے۔ یادگار کے طور پر اس کا ایک مختصر انتخاب حاشیہ میں دے رہے ہیں۔

چندہ وصول کرنے والوں میں عوام وخواص سبھی شریک ہوتے تھے، لیکن حضور حافظ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ذات کلیدی ہوتی تھی کہ ان کی شرکت کے بغیر نہ چندہ دینے والوں کو مزہ آتا نہ چندہ لینے والوں کو اس لیے حضرت والا کو روزانہ بلا ناغہ پورے وقت ڈیوٹی دینی ہوتی تھی۔

کر رہی تھی درحقیقت کام ساقی کی نگاہ
میکدہ میں گردش مینا برائے نام تھی

....

قسمت میں گر نہ ہو مرے آغوش یار کا
جلد اے قضا دکھا مجھے کونا مزار کا

اے بت خدا کے واسطے اب تو زماں کو دیکھ
دم آگیا لبوں پہ ترے جاں نثار کا

اے صبا تو جو کھلاتی ہے چمن کی کلیاں

کوئی غنچہ تو ذرا آج کھلاتا دل کا
لکھ دیا کاتب تقدیر نے پیشانی پر
ایک کافر کی محبت میں گنواتا دل کا

....

دیدۂ خود بیں سے جب پردہ خودی کا اٹھ گیا
جلوۂ یکتا نظر آنے لگا ہر سو ترا
اس کے دل سے کوئی پوچھے لذت زخم جگر
جس کے سینہ میں لگا ہو خنجر ابرو ترا

....

ہو کے مخل تصور خالق بے نیاز میں
چھیڑ رہی ہے دم بدم یاد بتاں نماز میں
منزل عشق میں ذرا رکھنا قدم کو پھونک کر
داغ لگے نہ اے زماں دامن پاک باز میں

....

نہ چاندنی ہے نہ دھوپ ہی ہے کہ صحن عالم میں در حقیقت
وہ ماہ خورشید کے جھروکھوں سے اپنا جلوہ دکھا رہے ہیں
نظر سے مجھ کو اگر گراتے ہو خیر چنداں نہیں غم اس کا
ستم تو یہ ہے کہ آپ صاحب رقیب کو سر چڑھا رہے ہیں

....

نگاہ ناز سے بسمل ہزار ہوتے ہیں
یہ تیر وہ ہیں جو سینے کے پار ہوتے ہیں
خدا نے ایسی بنائی ہے صورت جاناں

کہ جس کے حسن پہ لاکھوں نثار ہوتے ہیں

....

سچ کہو یہ بھی کوئی پردا ہے پردے میں جناب
ہر نظر میں جب تمہیں تم ہو تو کیا پردے میں ہو

....

رنج اچھا ہے ہمیں اور نہ راحت اچھی
آپ جس حال میں چاہیں وہی حالت اچھی

تم جو آجاؤ یقیں ہے کہ سنبھل جائے گا
ورنہ بیمار الم کی نہیں حالت اچھی

دل گیا چین گیا صبر گیا ہوش گیا
آپ نے مجھ پہ جو کی چشم عنایت اچھی

اس قافلہ میں ایک شخص اور بھی بڑی اہمیت رکھتا تھا جو نظم خوانی کرنے والوں اور اہل خانہ کے درمیان گھر کے دروازے پر کھڑا رہتا تھا اس کا کام دوہرا ہوتا۔ ادھر نظم خوانوں کو جوش دلاتا۔ اپنی واہ واہ ماشاء اللہ الحمد للہ سے ان کا دل بڑھاتا۔ ادھر چندہ دینے والوں کو حوصلہ دلاتا۔ ان سے مختلف انداز میں مطالبہ کرتا اور جب کچھ مل جاتا تو عوام کو دکھا کر نعرہ لگاتا۔ پہلے چندہ میں اس کام کے کرنے والے مختلف حضرات تھے، مجھے حاجی نعمت اللہ عرف پٹھے محلہ نیا پورہ کا نام یاد ہے۔ مرحوم اپنی پاٹ دار آواز میں ہردم اپنے چست اور دل چسپ فقروں سے پورے مجمع کو مسلسل بیدار اور تروتازہ رکھتے تھے۔

دیگر سربراہ آوردہ لوگوں میں جو اس وقت اکثر شریک ہوتے خود صدر مدرسہ جناب محمد امین صاحب انصاری، ناظم جناب علیم اللہ صاحب مرحوم، جناب محمد سلیمان صاحب رنگریز۔ جناب حاجی رحمت اللہ صاحب خازن، جناب متولی خیر اللہ صاحب پرانی بستی، جناب مولوی فقیر اللہ صاحب اسعد پورہ، دیوان جناب حکیم محمد عمر صاحب مرحوم

(پورہ صوفی) مولوی فقیر اللہ صاحب مرحوم شاعر بھی تھے، اور ان کی نظمیں بھی چندہ میں پڑھی جاتی تھیں۔ انھیں کی تخرتیج کردہ تاریخ سنگ بنیاد بے حد عمدہ اور مقبول خاص و عام ہوئی۔ ع

پھر نہ تاریخ کیوں باغ فردوس ہو

۱۳۵۲ھ

فہرست ﴿مضامین بحر العلوم حصہ دوم﴾

بعض اہم مطبوعات امام احمد رضا اکیڈمی

مقالات حنفی:

یہ کتاب کسی ایک عنوان پر نہیں بلکہ یہ ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ملک وبیرون ملک کے رسائل وجرائد میں چھپتے رہے، ان میں مختلف عناوین پر تحقیقی مقالات بھی ہیں، اور ملک وملت کی نامور شخصیات کی حیات وخدمات بھی۔ قرآن وتفسیر، اور حدیث واصول کے تعلق سے تشریحات بھی اور رضویات کے تعلق سے مفید معلومات بھی۔ خوبصورت جلد اور عمدہ کاغذ: تالیف: محمد حنیف خاں رضوی بریلوی

آئینہ رضویات: 240 (مقالات حنفی، اول) سائز: 16=23×36 ہدیہ: 110

انوار شخصیات: 240 (مقالات حنفی، دوم) سائز: 16=23×36 ہدیہ: 110

تشریحات وتحقیقات: 300 (مقالات حنفی، سوم) سائز: 16=23×36 ہدیہ: 130

الشاہد:

فرقہ وہابیہ علم غیب مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کا منکر تو ہے ہی ساتھ ہی اس کے تحت اور ضمن میں آنے والے عقائد اور فضائل ومناقب کا بھی انکار کرتا ہے، انہی میں ایک عقیدہ حاضر وناظر بھی ہے، اس موضوع پر بہت کچھ دلائل ہمارے علمائے اہل سنت پیش کر چکے ہیں، شیخ الاساتذہ بحرالعلوم حضرت علامہ مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ اعظمی علیہ الرحمہ کی یہ کتاب اس موضوع پر نہایت معرکۃ الآرا ہے، معاندین کے اعتراضات کے مسکت جوابات جس تحقیق سے اس کتاب میں تحریر کیے گئے ہیں وہ دوسرے مقامات پر مشکل سے ہی ملیں گے، کتاب کے مطالعہ سے عیاں ہوتا ہے کہ فرقہ وہابیہ علمی سرمایہ سے کتنا تہی دامن ہے، اور دعویٰ اتنا بلند بانگ ہے کہ ہم قرآن وحدیث پر عامل ہیں اور اہل سنت قرآن وحدیث کے خلاف عقائد ومعمولات پر کار بند ہیں۔ کتاب متعدد بار طبع ہوئی مگر اس مرتبہ نئی کتابت اور جدید ترتیب کے ساتھ منظر عام پر لائی گئی ہے۔ خوبصورت جلد، بہترین کاغذ۔

صفحات: 264 سائز:16=23×36 ہدیہ: 130

حیات اعلیٰ حضرت: مکمل چار جلدیں

سیدنا اعلیٰ حضرت مجدد اعظم امام احمد رضا کی حیات مقدسہ پر لکھی جانے والے سب سے پہلی کتاب: اس کتاب کو خلیفۂ اعلیٰ حضرت ملک العلماء، حضرت علامہ ظفر الدین صاحب رضوی بہاری علیہ الرحمہ نے چار جلدوں میں تحریر فرمایا تھا، ہندوستان میں مدت دراز کے بعد بھی تین جلدیں چھپ سکی تھیں، یہ پہلا موقع ہے کہ مکمل چار جلدیں منظر عام پر آئی ہیں۔

صفحات: 1540 سائز:16=23×36 ہدیہ: 700

المبین: (عربی زبان کے فضائل وخصائص)

عربی زبان کی فصاحت وبلاغت، اس کے حقائق ومعارف اور اس کی دوسری زبانوں پر فوقیت وبرتری کے حوالہ سے وہ معلومات جہاں تک بڑے بڑے ماہرین علم وفن کی رسائی نہیں ہو پاتی ان کو اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔ صاحبان فضل وکمال نے دل کھول کر مصنفین کو داد دی ہے، بلاشبہ یہ کتاب اپنے موضوع پر نہایت وقیع اور معرکۃ الآراء ہے۔ کتاب کا انداز بیان بڑا ہی شگفتہ اور ادیبانہ ہے، عربی زبان کی فضیلت بیان کرنا تو مصنف کا موضوع ہے ہی، مگر اردو زبان کی عرفی حیثیت میں بھی چار چاند لگا دیے ہیں، اگر کوئی شخص محض اس کتاب کو اردو زبان کا چٹخارہ حاصل کرنے کے لیے پڑھے گا جب بھی وہ فرحت وخوشی محسوس کرے گا اور پڑھنے والے کو یہ بھی باور ہو جائے گا کہ اردو زبان میں کتنی صلاحیت، جامعیت اور وسعت ہے۔ غرض کہ عربی زبان کی فضیلت میں لکھی جانے والی یہ کتاب جہاں عربی زبان کے کمال کو واضح کرتی ہے وہیں اردو زبان کی غیر معمولی صلاحیت کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ خوبصورت کمپوزنگ، اعلیٰ تصحیح، عمدہ سیٹنگ کے ساتھ ہندوستان میں پہلی بار اشاعت۔ مضبوط جلد، بہترین کاغذ اور صاف شفاف طباعت۔

تصنیف لطیف: حضرت علامہ سید محمد سلیمان اشرف صاحب بہاری (خلیفہ اعلیٰ حضرت)

صفحات: 208 سائز:16=23×36 ہدیہ: 100

ہماری دیگر مطبوعات



IMAM AHMAD RAZA ACADEMY

Saleh Nagar, Rampur Road, Bareilly Shareef, (U.P.), Mob.: 8410236467